ایک خبر ایک کہانی

اس دشت کی تنہائی

انور احسن صدیقی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔



سرِ آغاز

یہ چار کہانیاں ایسے افراد کے بارے میں ہیں جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور جن کی موت کے بعد محض ان کے کاغذی پیرہن مجھے اخبار کی چند سطری خبروں میں نظر آئے تھے۔ یہ نامعلوم اور بے نام افراد کون تھے جنہیں گردشِ روزگار دھکیلتی ہوئی اس المناک انداز میں موت کی دہلیز تک لے آئی تھی' اخبار کی خبریں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتیں۔ وہ تو صرف ان لوگوں کی زندگیوں کے ڈرامائی انجام کے بارے میں بتاتی ہیں لیکن اس انجام سے پہلے کیا تھا؟ آغاز کہاں سے اور کس طرح سے ہوا تھا؟ ان لوگوں کی داستانِ حیات کا آخری صفحہ لکھے جانے سے پہلے اور کتنے صفحات لکھے گئے تھے اور ان میں کون کون سے مضمون تھے؟ ان سوالوں کے جواب میں یہ کاغذی پیرہن بالکل خاموش ہیں۔

تو آیئے' ہم زندگی کے لامحدود طور پر وسیع کتب خانے میں اپنی چشمِ تصور سے ان میں سے ہر ایک کی داستانِ حیات کو تلاش کریں اور ان اوراق کو پڑھنے کی کوشش کریں جن کی تحریروں کے بارے میں ہم فی الحقیقت کچھ بھی نہیں جانتے' سناٹے کی ان آوازوں کو سننے کی جستجو کریں جو خلائے بسیط میں کہیں گم ہیں اور انہیں اپنی سماعتوں میں اسیر کر لیں۔

انور احسن صدیقی

اس دشت کی تنہائی

اس نامعلوم شخص کی کہانی جو اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق شاہراہِ فیصل کے علاقے میں چلتی ہوئی بس سے گر کر ہلاک ہو گیا تھا۔

(22 جنوری 1989ء)

اس کہانی کا آغاز ملتان کے ایک نواحی گاؤں سے ہوتا ہے اور یہ 1962ء کا زمانہ تھا۔ یہ کہانی تاج دین کی موت کے فوراً ہی بعد شروع ہو گئی تھی۔

تاج دین ایک غریب کسان تھا اور ملتان کے نواح میں اس کے پاس تھوڑی سی زمین تھی۔ اس کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام کرم دین اور چھوٹے کا نام علم دین تھا۔

وہ تینوں مطلق اَن پڑھ تھے' اپنے آباؤ اجداد کی طرح' جو غریبی اور جفاکشی کی زندگی گزارتے آئے تھے۔ زمین ہی ان کی روزی کا وسیلہ تھی' وہی ان کی درسگاہ تھی اور وہی ان کی استاد تھی' انہوں نے جو کچھ سیکھا تھا' زمین سے ہی سیکھا تھا۔ وہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے لیکن زمین کے بارے میں سب کچھ جانتے تھے۔

لیکن زمین کوئی مشفق استاد نہیں تھی۔ وہ تو ایک ایسی استاد تھی جو اپنے طالب علموں سے اپنا سارا علم چھپا کر رکھتی تھی۔ علم کو اس سے چھیننا پڑتا تھا اور یہ عمل کوئی حال کا عارضی عمل نہیں تھا۔ انسان کی ہزارہا سالہ جدوجہد کے دوران ہی زمین نے اپنے اسرار و رموز منکشف کئے تھے اور انسان کی اطاعت قبول کی تھی لیکن پھر بھی اس کی سرکشی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کو قابو میں رکھنے کے لئے انسان کو مسلسل جدوجہد کی ضرورت تھی۔

تاج دین کے پاس تھوڑی سی زمین تھی اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مل کر اس پر کام کرتا تھا۔ سال بھر کی جان توڑ محنت سے اتنا حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ لوگ آرام سے گزارہ کرلیں لیکن ان کا شمار خوش حال یا درمیانہ درجے کے کسانوں میں بمشکل ہی کیا جاسکتا تھا۔

دونوں لڑکے ابھی نوجوان تھے اور ان کی شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ ان کا باپ بہوؤں کو گھر میں لانے کی اور پوتوں سے کھیلنے کی خواہش کو دل میں لئے ہوئے اچانک اس دنیا سے سدھار گیا۔

بڈھا تو مر گیا لیکن اس کے ساتھ ہی کئی نئے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔

تاج دین اپنے باپ کی اکلوتی اولاد تھا اور اسے یہ زمین اپنے باپ سے ورثے میں ملی

تھی۔ ملکیت اور وراثت کا کوئی جھگڑا نہیں تھا لیکن اب معاملہ ذرا دوسرا تھا۔

تاج دین نے دو شادیاں کی تھیں۔ اس کی پہلی بیوی کا نام نسیمہ تھا اور وہ شادی کے کوئی دو سال بعد ہی مر گئی تھی۔ اس وقت کرم دین کی عمر ایک سال کی تھی۔

نسیمہ نہر میں ڈوب کر مری تھی اور اس کی موت کو ایک اتفاقی حادثہ سمجھا گیا تھا لیکن سارا گاؤں اس بات سے واقف تھا کہ نسیمہ اتفاقیہ طور پر ہلاک نہیں ہوئی تھی بلکہ اس نے خودکشی کی تھی۔

اس خودکشی کا ایک پس منظر موجود تھا۔ شادی سے پہلے نسیمہ ایک ایسے نوجوان سے محبت کرتی تھی جس کا تعلق اس کی برادری سے نہیں تھا اور اس لئے یہ شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نوجوان نے نسیمہ کو اپنے ساتھ بھاگ چلنے کی ترغیب دی لیکن نسیمہ اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکی۔ اس نے رو رو کر اس لڑکے سے کہا کہ وہ ہمیشہ کے لئے اسے بھول جائے۔ وہ لڑکا مایوس ہو کر گاؤں سے چلا گیا اور نسیمہ کی شادی تاج دین سے ہو گئی۔

لیکن تاج دین نے نسیمہ کی زندگی کو دوزخ بنا کر رکھ دیا۔ وہ اسے مویشیوں کی طرح مارتا اور اس کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرتا تھا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ نسیمہ شادی سے پہلے کسی اور نوجوان سے محبت کرتی تھی اور اب اسے اس کے پلے باندھ دیا گیا ہے۔ وہ اس لڑکی سے نفرت کرتا تھا جس کے دل میں پہلے ہی کسی دوسرے مرد کے لئے محبت کا جذبہ موجود تھا۔ وہ نسیمہ کو اس بات کی سزا دینا چاہتا تھا کہ اس نے کسی اور سے محبت کیوں کی اور نسیمہ کسی بے زبان جانور کی طرح یہ ساری مار پیٹ برداشت کرتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ہی قصوروار سمجھتی تھی۔ تاج دین مرد تھا اور کوئی مرد بھلا یہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی بیوی کے دل میں کسی دوسرے مرد کے لئے جگہ موجود ہو۔

جب تک دل میں حوصلہ اور بدن میں طاقت رہی، وہ یہ ظلم برداشت کرتی رہی لیکن پھر آخر وہ وقت بھی آیا جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک شام اس نے چپکے سے نہر میں کود کر خودکشی کر لی۔ نسیمہ کی لاش اگلے دن کئی میل کے فاصلے پر بہتی ہوئی ملی۔ اس کی شناخت کر لی گئی۔ کچھ عرصے کے بعد تاج دین نے دوسری شادی کر لی۔ اس کی دوسری بیوی کا نام امینہ تھا۔

وہ زندگی بھر امینہ سے خوفزدہ رہا تھا کیونکہ امینہ کے چار بھائی تھے اور وہ چاروں بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ وہ لوگ اس سے پہلے نسیمہ کا حشر دیکھ چکے تھے اور انہوں نے

پہلے ہی تاج دین کو یہ بات بتا دی تھی کہ اگر اس نے امینہ کے ساتھ بدسلوکی کی تو وہ اس کا دماغ ٹھکانے لگا دیں گے۔

نسیمہ بے چاری کا تو بوڑھے ماں باپ کے علاوہ اور کوئی تھا ہی نہیں۔ اس لئے وہ گدھے کی طرح پٹتی رہی اور جب اس میں مزید پٹنے کی سکت نہ رہی تو اس نے جان دے دی لیکن امینہ کا معاملہ مختلف تھا۔ وہ کسی منہ زور گھوڑی کی طرح دندناتی تھی اور اس نے پہلے دن سے ہی تاج دین کو دبا کر رکھا تھا۔ امینہ ان لوگوں میں سے نہیں تھی جو ہر چیز کو قسمت کا لکھا مان کر خاموشی سے برداشت کر لیتے ہیں۔ وہ قسمت سے اور حالات سے لڑنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اس میں حالات کو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی غرض سے جدوجہد کرنے کا جذبہ اور ہنر موجود تھا۔

امینہ اور تاج دین کی شادی کے ایک سال بعد علم دین پیدا ہوا۔ تاج دین بہت خوش تھا۔ دوسری بیوی سے بھی بیٹا ہی پیدا ہوا تھا۔ اب اسے اپنے دو ہاتھوں کے علاوہ چار ہاتھ اور بھی مل گئے تھے۔

کرم دین اور علم دین کی عمروں میں بمشکل دو سال کا فرق تھا اور تاج دین کو وہ دونوں ہی یکساں طور پر عزیز تھے کیونکہ دونوں ہی اس کی اولاد تھے۔ وہ دونوں مل کر اس کے لئے چار ہاتھ بنے تھے۔ چار ہاتھ، اس کے اپنے ہاتھ، جو زندگی کا بوجھ ڈھونے میں اس کی بہت زیادہ مدد کر سکتے تھے۔

دونوں لڑکے چھوٹے ہی تھے کہ انہوں نے زندگی کا بوجھ ڈھونا شروع کر دیا۔ ان کی قسمت کے خانے میں کسی اسکول کا نام نہیں لکھا تھا۔ انہوں نے خوبصورت کھلونے صرف شہر کی دکانوں میں رکھے دیکھے تھے اور وہ کتاب کے لمس سے بھی ناآشنا تھے۔

دیہات کے لاکھوں بچوں کی طرح ان کی زندگی کا بھی آغاز کھیتوں میں کام کرنے اور مویشیوں کی دیکھ بھال سے ہوا تھا اور اپنے کاموں میں وہ رفتہ رفتہ طاق ہوتے گئے۔

تاج دین کی دوسری بیوی امینہ نے کرم دین کے ساتھ شروع سے ہی اچھا سلوک کیا اور اس میں اس کی ایک خاص غرض کارفرما تھی۔ اس کے بڑے بھائی نوروز خاں نے اسے پہلے ہی اونچ نیچ سمجھا دی تھی۔ کرم دین کو راضی رکھنا ضروری تھا۔

روایات کے مطابق باپ کے مرنے کے بعد کرم دین کو ہی خاندان کا سربراہ بننا تھا کیونکہ وہی بڑا تھا۔ زمین بھی اس کی تحویل میں رہنی تھی۔ تاوقتیکہ اس کا بٹوارہ نہ ہو جائے۔

لیکن زمین اتنی کم تھی کہ اگر اس کا بٹوارہ کیا جاتا اور دونوں بھائیوں کے حصے میں آدھی آدھی زمین آتی تو وہ ایک کنبے کی کفالت کے لئے بمشکل ہی کافی ہو سکتی تھی۔ اس وقت بھی اس سے بس کھینچ تان کر گزارا ہو جاتا تھا۔ وہ اگر دو ٹکڑوں میں بٹ جاتی تو اس کی افادیت اور بھی کم ہو جاتی۔

چنانچہ زمین کی تقسیم کا سوال تو خارج از بحث تھا۔ البتہ کرم دین کو راستے سے ہٹانے کی بات ضرور سوچی جا سکتی تھی لیکن وہ بھی تاج دین کی موت کے بعد۔ جب تک تاج دین زندہ تھا' تب تک کوئی اگر کرم دین کو انگلی بھی لگاتا تو قیامت برپا ہو جاتی۔

نوروز خاں نے یہ ساری باتیں اپنی بہن کو بہت پہلے سمجھا دی تھیں۔ اس وقت دونوں لڑکے بہت چھوٹے تھے اور اسی کے ساتھ نوروز خاں نے اپنی بہن سے یہ بات بھی طے کر لی تھی کہ وہ اپنی بڑی بیٹی شاہدہ کی شادی علم دین کے ساتھ کر دے گا لیکن اس معاملے میں رازداری سے کام لیا گیا تھا اور دونوں بہن بھائی کسی مناسب وقت پر اس کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔

"زمین علم دین کو ملنی ہے امینہ!" نوروز خاں نے اسے سمجھایا۔ "مگر تُو ہوشیاری کے ساتھ چل۔ بڑا لمبا سفر ہے۔ صبر سے کام لینا ہو گا۔ کرم دین کو یہ کبھی محسوس نہ ہونے دے کہ تُو اس کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کے دل کو مٹھی میں رکھ۔ اسے تجھ پر اور تیرے بیٹے پر پورا بھروسہ ہونا چاہئے۔ بس' اسی بھروسے سے تو کام نکالنا ہے۔"

زمین کا وہ حقیر سا ٹکڑا' جو چند جانوں کا پیٹ پالنے کے لئے بھی بمشکل کافی ہوتا تھا' ان لوگوں کے لئے کسی انمول خزانے کی طرح قیمتی تھا اور گدھ جیسی حریص نظریں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ نوروز خاں اپنی بیٹی کو اس زمین کا مالک دیکھنا چاہتا تھا۔

چنانچہ تاج دین کی موت کے ساتھ ہی ایک نئی کہانی شروع ہو گئی۔ تاج دین اچانک اور خلاف توقع بہت جلدی مر گیا تھا۔ امینہ سوچ ہی رہی تھی کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ اس سے علم دین کے ساتھ نوروز خاں کی بیٹی کی شادی کی بات کر لے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ فوراً یہ کہے گا کہ پہلے بڑے بیٹے کی شادی ہونی چاہئے لیکن اس کے جواب میں وہ بآسانی کہہ سکتی تھی کہ وہ اس کی طرف سے غافل نہیں ہے اور اس کے لئے بھی لڑکی تلاش کر رہی ہے لیکن علم دین کے لئے تو لڑکی گھر میں ہی موجود تھی اور اس کے جوڑ کی بھی تھی۔

تاج دین کے مرنے کے بعد کرم دین ہی اس گھر کا بڑا اور سربراہ قرار پایا اور اب اس زمین کا مالک بھی وہی تھا۔ علم دین اس کا چھوٹا بھائی تھا اور اسے اپنے بڑے بھائی کو

اپنے باپ کی جگہ سمجھتا تھا۔

بہت سے لوگوں کی موجودگی میں' جن میں نوروز خاں بھی شامل تھا' امینہ نے رو رو کر اپنے بیٹے کو ہدایت دی کہ آج کے بعد سے وہ اپنے بڑے بھائی کو اپنے باپ کی جگہ سمجھے اور اس کا ہر حکم مانے۔ دیکھنے والے اور سننے والے امینہ کے اس طرز عمل سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ واقعی ایک مثالی سوتیلی ماں تھی۔ آج کل کے زمانے میں بھلا کون سوتیلی ماں ایسا رویہ اختیار کرتی ہے۔

امینہ' نوروز خاں کی ہدایت پر پوری طرح عمل کر رہی تھی۔ کرم دین کے خلاف جال بچھایا جا رہا تھا اور کرم دین اس سے بالکل بے خبر تھا۔

کرم دین نے ورثے میں اپنی ماں کی خصوصیات زیادہ پائی تھیں جو اپنی فطرت کے اعتبار سے ایک سیدھی اور سادہ لوح عورت تھی۔ اس کے مزاج میں شاطری اور طراری نہیں تھی۔ وہ ایک صاف اور سچی عورت تھی اور اس کے لئے کسی کو دھوکا دینا بہت مشکل تھا۔ کرم دین بھی ایسی ہی طبیعت اور مزاج کا آدمی تھا۔ اس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوچا کہ اس کی سوتیلی ماں' اس کا ماموں اور دوسرے رشتے دار اس کے خلاف کسی سازش میں مصروف ہیں۔

اور اگر وہ اپنے کانوں سے ان دونوں بھائی بہنوں کی باتیں نہ سن لیتا تو اسے کبھی اس بات کا یقین نہ آتا کہ اس کے خلاف ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اپنے باپ کے انتقال کے کوئی دو مہینے کے بعد اس نے اپنی سوتیلی ماں اور نوروز خاں کی گفتگو سن لی۔ وہ دونوں اسی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ نوروز خاں کے اپنے گاؤں واپس چلے جانے کے بعد امینہ کرم دین دن کو کسی کام سے نوروز خاں کے گاؤں بھیجے گی اور پھر جب وہ وہاں سے واپس آ رہا ہو گا تو راستے میں کسی سنسان جگہ پر نوروز خاں کے بیٹے جو پہلے ہی سے وہاں چھپے ہوئے ہوں گے' لاٹھیوں سے اس پر حملہ کر کے اور اسے ہلاک کر کے فرار ہو جائیں گے۔ بعد میں یہ مشہور کر دیا جائے گا کہ کرم دین' نوروز خاں سے کافی رقم لے کر اپنی ماں کو دینے کے لئے جا رہا تھا جو نوروز خاں نے اپنی بہن سے ادھار لی تھی کہ چوروں نے اسے گھیر کر مار دیا اور اس سے رقم چھین لی۔

کرم دین نے یہ سب کچھ سنا اور خوف و دہشت کے عالم میں اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے اب تک

وہ کسی طلسم کدے میں قید تھا اور پھر اچانک وہ طلسم کدہ ٹوٹ گیا۔ ساری عمارت ہوا میں تحلیل ہو گئی اور اس نے اپنے آپ کو ایک تپتے ہوئے ویران ریگستان میں پڑے ہوئے پایا۔

اس روز پہلی بار کرم دین پر یہ دردناک انکشاف ہوا کہ وہ تو اس دنیا میں اکیلا ہے۔ ماں تھی لیکن ماں نہیں تھی۔ بھائی تھا لیکن بھائی نہیں تھا۔ زمین کا وہ حقیر سا ٹکڑا اسے یکبارگی قبرستان کی طرح بھیانک اور مرگ آفریں لگنے لگا تھا۔ وہ' جو ان سب لوگوں کی روزی کا وسیلہ تھا' وہی کرم دین کو اب اپنے لئے ایک مقتل معلوم ہوتا تھا۔

تنہائی اور محرومی کے اس احساس نے کرم دین کو اندر سے بالکل توڑ کر رکھ دیا۔ اس کے دل و دماغ میں شکست و ریخت کا ایک عمل شروع ہو گیا۔+ باپ کی موت اپنی جگہ پر بلاشبہ ایک بڑا صدمہ تھی لیکن موجود صدمہ اس سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ باپ تو مر گیا تھا اور موت انسان کا مقدر ہے۔ کسی نہ کسی دن ہر انسان اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے اور اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ موت پر دل دکھتا ہے' کلیجے میں درد کی ٹیسیں اٹھتی ہیں لیکن پھر رفتہ رفتہ سب کچھ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ مرنے والوں کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں اور وہ خود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عدم کے سرد خانوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔

لیکن جو لوگ جیتے جی مر جائیں ان کو رونے کے لئے آنسو کہاں سے لائے جائیں؟ ان کی موت کا صدمہ تو جسمانی موت سے کہیں زیادہ گہرا اور جان لیوا ہوتا ہے۔ موت کا صدمہ تو ایک دن صبر کی صورت اختیار کر کے ختم ہو جاتا ہے لیکن اس صدمے کو کیا نام دیا جائے؟

کرم دین کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ جن لوگوں کو اپنا سمجھتا تھا وہ تو اس کے بدترین دشمن' اس کے خون کے پیاسے اور اس کی جان کے لاگو نکلے۔ وہ ماں مر گئی تھی جس کی وہ اپنی سگی ماں کی طرح عزت کرتا تھا۔ وہ بھائی مر گیا تھا جس پر وہ جان دیتا تھا۔ ان لوگوں کی موت کا صدمہ باپ کی موت کے صدمے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بھاری تھا۔

کرم دین ان سب لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تنہا تھا بالکل تنہا۔ اس کے باپ کے رشتے داروں وغیرہ میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اس کی مدد کر سکتا۔

وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اس گھر میں اب اس کا گزارہ نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کے درمیان کس طرح رہ سکتا تھا جو اس کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے اور اس کے دل میں درد

کی ایک تیز لہر اٹھی اور اس لہر نے ان تمام لوگوں کو' اس فضا کو' اس بستی کو اس کے لئے اجنبی بنا دیا۔

کرم دین نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اب یہاں نہیں رہے گا۔ دنیا بہت بڑی تھی اور اس کی اکیلی جان تھی' وہ کہیں بھی جا سکتا تھا' کہیں بھی رہ سکتا تھا۔ ہاتھ پیر سلامت تھے' محنت مزدوری کا عادی تھا۔

کسان کے لئے اپنی زمین سے رشتہ توڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے لیکن جب زمین خود اس کے خون کی پیاسی بن جائے تو پھر یہ رشتہ آسانی سے ٹوٹ جاتا ہے۔ کرم دین نے بھی اس رشتے کو توڑ دیا۔

دو دن کے بعد اس کی سوتیلی ماں نے اس کو کچھ چیزیں دے کر اپنے بھائی نوروز خاں کے گاؤں جانے کی ہدایت کی۔ کرم دین نے اس پر بالکل نہیں ظاہر ہونے دیا تھا کہ وہ ان لوگوں کے عزائم سے واقف ہو چکا ہے۔ اس کے پاس کچھ رقم موجود تھی' وہ اس نے رکھ لی اور خاموشی سے گھر سے روانہ ہو گیا۔

کرم دین اگر چاہتا تو اور بھی بہت کچھ اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ وہ اپنی ماں کے زیورات وغیرہ بھی لے جا سکتا تھا لیکن اس نے کسی اور چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ کوشش کے باوجود ان لوگوں سے نفرت نہیں کر سکا تھا اور وہ انہیں نقصان پہنچانے کا حوصلہ نہیں کر سکا تھا۔ شاید یہ طبعی نرم مزاجی اور سیر چشمی' عفو و درگزر کی یہ غیر معمولی صلاحیت اسے اپنی ماں سے ورثے میں ملی تھی جو اپنے اس وصف کی بدولت بالآخر ایک دن نہر میں جا کودی تھی۔

کرم دین گھر سے نکلا اور نوروز خاں کے گاؤں جانے کی بجائے اس نے سیدھا ریلوے اسٹیشن کا رخ کیا۔

اس نے کراچی کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا۔ اس کی کئی ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی تھی جو کراچی گئے تھے یا وہاں جاتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کی باتیں سن سن کر اس کے دل و دماغ میں ایک ایسے شہر کا خاکہ ابھرتا تھا جہاں آدمی کے کرنے کے لئے اتنے بہت سے کام تھے کہ وہ بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح روٹی کما لیتا تھا۔

کرم دین کو کھیتی باڑی اور مویشی پالنے کے علاوہ اور کچھ نہیں آتا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں اسی نوعیت کے دیہی کاموں کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا تھا لیکن اسے ایک بات کا یقین تھا اور وہ یہ کہ وہ ہر قسم کی محنت کر لے گا اور بتانے والوں نے اسے یہی بتایا تھا کہ

کراچی میں محنت کے پیسے مل جاتے ہیں۔ اس نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

تھوڑی سی رقم اس کے پاس موجود تھی۔ کچھ دن تک گزارا ہو سکتا تھا۔ پھر آگے کی آگے دیکھی جائے گی۔ کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔

اسٹیشن جانے سے پہلے وہ آخری بار اپنی زمین کے پاس گیا اور وہاں بڑی دیر تک کھڑا حسرت اور محبت بھری نظروں سے اس چھوٹے سے قطعہ اراضی کو دیکھتا رہا جس پر وہ اپنے مرحوم باپ اور بھائی کے ساتھ برسوں سے محنت کرتا چلا آیا تھا۔ اسے تو اپنے پسینے کی ان بوندوں کا بھی شمار نہیں تھا جو اس زمین کی مٹی میں جذب ہو چکی تھیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پہلے سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ ابا زندہ تھے۔ سب مل کر کام کرتے تھے اور خوش رہتے تھے۔ محنت کی ایک الگ خوشی ہوتی تھی۔ پھر نہ جانے وہ خفیہ ہاتھ کہاں سے نمودار ہو گیا جس نے ان ساری خوشیوں کا گلا گھونٹ دیا۔

کرم دین اپنے کھیتوں کے پاس سے رخصت ہوا تو بڑی دیر تک مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا رہا۔ اُن کی مٹی کی خوشبو اسے بلا رہی تھی۔ اسے لطیف اشارے کر رہی تھی لیکن کرم دین کے لئے تو سب کچھ جیسے اجنبی ہو گیا تھا۔

کرم دین جب ریلوے اسٹیشن پہنچا تو وہاں پہنچتے پہنچتے اس کے دل کا بوجھ کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ اس گہری اداسی کے ساتھ ساتھ، جو اس کی نس نس میں سرایت کئے ہوئے تھی، آئندہ کے امکانات، مستقبل کے خدشات، ایک نئی زندگی کے مسائل بھی اس کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنا رہے تھے۔

کراچی جانے والی ٹرین پکڑنے کے لئے اسے کئی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ کرم دین ایک نوجوان لڑکا تھا لیکن وہ آج تک ٹرین میں نہیں بیٹھا تھا۔ اس کی دنیا اپنی بستی تک اور ملتان شہر تک محدود تھی۔ کہیں اور آنے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ٹرین میں پہلی بار بیٹھنے کا ہیجان اپنے اندر ایک مخفی سرشاری بھی لئے ہوئے تھا۔

کتنے بہت سے جذبات ہوتے ہیں جو انسان کے دل میں بیک وقت موج زن ہوتے ہیں۔ اداسی اور افسردگی، اضطراب و ہیجان، خوش آئند امکانات، توقعات اور امیدیں، جدوجہد کی لگن، سب کچھ ایک ساتھ موجود رہتا ہے اور ان سارے جذبوں کی تیزی و تندی کے بہاؤ میں برابر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایک جذبہ غالب آ جاتا ہے اور باقی تمام جذبوں کو مغلوب کر دیتا ہے اور پھر کسی وقت کوئی دوسرا جذبہ ابھر کر باقی جذبوں کو دبا دیتا ہے اور یہ کشاکش انسان کے ساتھ مرتے دم تک موجود رہتی ہے۔

کرم دین جب گاڑی میں بیٹھا اور کچھ دیر کے بعد گاڑی ملتان کے ریلوے اسٹیشن سے روانہ ہوئی تو کرم دین کے لئے ایک نامعلوم دنیا کی جانب سفر کا آغاز ہوا۔ وہ ایک ایسے جہان کی طرف جا رہا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا لیکن جان بچانے کی خواہش اور زندہ رہنے کی آرزو تمام انسانی جذبوں میں سب سے زیادہ طاقتور اور منہ زور جذبہ ہے جو باقی تمام جذبوں پر حاوی ہو جاتا ہے اور یہی وہ جذبہ تھا جو کرم دین کو ان دیکھی نامانوس، نامعلوم، اجنبی اور بیگانہ دنیا کی جانب لے جا رہا تھا۔ کراچی میں اس کا کوئی نہیں تھا۔ وہ وہاں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس نے صرف لوگوں کی زبانی ملک کے اس سب سے بڑے شہر کے بارے میں سنا تھا۔

وہ جون 1962ء کی ایک صبح تھی جب کرم دین نے کراچی سٹی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ اسٹیشن پر لوگوں کا بہت ہجوم تھا اور کرم دین کو چلنے میں بہت دقت ہو رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف بڑا زبردست شور و غل مچا ہوا تھا۔ چیخ و پکار کا بازار گرم تھا۔ کرم دین ان آوازوں کو بغور سن رہا تھا۔ وہ ان آوازوں میں اپنی زبان سرائیکی کو تلاش کر رہا تھا لیکن وہ اسے کہیں نہیں مل رہی تھی۔ تقریباً ساری آوازیں اردو کی تھیں۔ کرم دین پر سراسیمگی سی طاری ہونے لگی۔ اب کیا ہو گا؟ اس سے اردو کیسے بولی جائے گی؟

پلیٹ فارم کے ہجوم نے اسے زیادہ حیرت زدہ نہیں کیا لیکن جب وہ اسٹیشن سے باہر نکل کر میکلو روڈ پر پر آیا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ تقریباً دس بجے کا وقت تھا اور میکلو روڈ گاڑیوں اور انسانوں سے بھری ہوئی تھی۔ تیز رفتار کاریں سڑک کے دونوں اطراف سے بھاگتی دوڑتی گزر رہی تھیں اور انسانوں کا ہجوم فٹ پاتھوں پر رواں دواں تھا۔

کرم دین بے چارے نے ملتان شہر کے دو تین منزلہ، پرانی وضع قطع کے مکانوں کے علاوہ اور دیکھا ہی کیا تھا۔ اب اس کی نظروں کے سامنے دور دور تک ایسی بلند و بالا عمارات کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن کی چوٹیاں اسے آسمان سے باتیں کرتی معلوم ہوتی تھیں۔ کہیں کوئی میدان نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی کھیت نہیں تھا۔ کوئی خالی جگہ نہیں تھی۔ اس کے دائیں اور بائیں دونوں جانب بھی سڑک تھی۔ لوگ تھے۔ بے پناہ لوگ، اور گاڑیاں تھیں۔ کرم دین نے کبھی آج تک اتنی بہت سی گاڑیوں کو، اتنے بہت سے انسانوں کو، ایک ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہونقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے اس طلسمی دنیا کو دیکھ رہا تھا۔

اس کا کُل سرمایہ تھوڑی سی رقم اور ایک گٹھری پر مشتمل تھا۔ رقم کو اس نے سنبھال کر اپنی صدری کی جیب میں رکھا تھا جسے وہ کُرتے کے نیچے پہنے ہوئے تھا اور گٹھری اس کی بغل میں تھی۔

وہ فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر بہت سے لوگ اور گاڑیاں آخر کہاں جا رہے ہیں۔ کیا اس شہر میں آج کہیں کوئی میلہ لگا ہے؟ کوئی تہوار وغیرہ کا موقع ہے کیا؟ یہ اس غضب کی بھاگ دوڑ کیوں مچی ہوئی ہے؟

اس نے کئی بار چاہا کہ سڑک کو پار کرکے دوسری طرف چلا جائے لیکن وہ اپنے اندر سڑک کو پار کرنے کی ہمت نہیں پیدا کر سکا۔ جب بھی وہ آگے بڑھنے کی کوشش کرتا' زن زن کرتی گاڑیاں اس کے سامنے سے گزرنے لگتیں اور وہ سہم کر پیچھے ہٹ جاتا۔

اسے وہاں کھڑے ہوئے کافی دیر گزر گئی اور اس کا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا۔ عجیب قسم کی گرمی تھی اور کرم دین اس سے سخت پریشان ہو رہا تھا۔ اس کے پسینے میں بھیگے ہوئے کپڑے اس کے جسم سے چپک رہے تھے اور ہر چیز میں ایک عجیب طرح کی چپکن کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کی گٹھری بھی چپک رہی تھی۔ اسے اپنی انگلیاں' اپنے ہاتھ بھی چپکتے ہوئے لگ رہے تھے۔ اگرچہ ہوا چل رہی تھی لیکن یہ ہوا بھی الگ طرح کی تھی۔ اس میں ٹھنڈک تو تھی لیکن ایسا لگتا تھا جیسے یہ گرم پانی ملی ہوئی ٹھنڈک ہے۔ اس کے جھونکے جسم کو گرم پانی کی طرح چھو رہے تھے۔

بالآخر اس نے اپنے اندر سڑک پار کرنے کی ہمت پیدا کرلی۔ ٹریفک کا خوف اس کے دل سے کافی حد تک دور ہو گیا تھا وہ دوسرے لوگوں کو دیکھتا رہا تھا کہ وہ کس طرح سڑک پار کرتے تھے۔ اس نے بھی چند لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر سڑک پار کرلی اور دوسری طرف چلا گیا۔ وہاں سے وہ گھومتا بولٹن مارکیٹ تک آ گیا۔

اس کے اعصاب اب جواب دے چکے تھے اور اس کے دل و دماغ پر شدید تناؤ طاری تھا۔ اس نے صبح کو ٹرین میں کچھ تھوڑا سا کھانا کھا لیا تھا۔ یہ اس کھانے کا آخری حصہ تھا جو وہ اپنے گھر سے لے کر چلا تھا اور تب سے اب تک وہ جس حیرت کدے میں بھٹک رہا تھا وہاں اس کی بھوک پیاس' سب ختم ہو گئی تھی۔

وہ ڈرتے ڈرتے ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ سامنے کاؤنٹر پر جو موٹا سا' کالا سا آدمی بیٹھا ہوا تھا' وہی گاہکوں سے پیسے وصول کر رہا تھا۔ کرم دین اب تک بہت سے ہوٹلوں اور چائے خانوں کے سامنے سے گزرا تھا اور اس نے سوچا تھا کہ اس شہر کے گھروں میں شاید

چولہے نہیں ہوتے۔ یہاں تو ہر شخص ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا اور چائے پیتا تھا۔ تمام ہوٹل گاہکوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان کی آمدورفت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اس نے لوگوں کو سہ پہر کے تین بجے اور چار بجے بھی ہوٹلوں میں کھانا کھاتے دیکھا اور اسے سخت تعجب ہوا۔ بھلا یہ کھانا کھانے کا کون سا وقت تھا؟

وہ کچھ دیر تک کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہوا اس موٹے اور کالے شخص کو دیکھتا رہا جو لوگوں سے پیسے لے لے کر ایک دراز میں جمع کرتا جا رہا تھا اور پھر اس نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے اس شخص سے سرائیکی زبان میں پوچھا۔ "مجھے کام کی تلاش ہے کیا مجھے یہاں کوئی کام مل سکتا ہے؟" کرم دین نے چاہا تھا کہ وہ اس شخص سے یہ سوال اردو میں کرے لیکن اس کی زبان نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ صرف اپنی مادری زبان ہی بول سکا۔

لیکن اسے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ اس شخص نے اس کی زبان سمجھ لی۔ وہ چند لمحوں تک اسے گھور گھور کر دیکھتا رہا اور پھر اردو میں اس کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کرم دین بھی اس کی بات سمجھ رہا تھا۔

"کہاں رہتے ہو؟ رہنے کی کوئی جگہ ہے تمہارے پاس؟" اس شخص نے پوچھا۔

"نہیں۔" کرم دین نے جواب دیا۔ "میرے پاس کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" سیٹھ نے کہا۔ "رات کو ہوٹل کے باہر تھڑے پر سو جانا۔ دن بھر کام کرنا ہو گا۔" کرم دین اس کا مطلب بڑی مشکل سے سمجھ سکا لیکن جب وہ اس کی بات سمجھ گیا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نئی زندگی کا آغاز ہو چکا تھا۔

سیٹھ نے کرم دین کو اسی وقت سے کام پر لگا دیا۔ اسے میزوں پر کپڑا مارنے کے لئے' فرش دھونے کے لئے اور صفائی وغیرہ کے دوسرے کاموں کے لئے ایک آدمی کی ضرورت تھی اور اس کام کے لئے اگر کسی بالکل اجنبی آدمی کو بھی رکھ لیا جاتا تو کوئی ہرج نہیں تھا اور یہ احمق دیہاتی تو آدھی اجرت پر کام کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ اسے کراچی میں کام کرنے والوں کی اجرتوں کے بارے میں کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔ سیٹھ نے اسے بتایا کہ اسے دونوں وقت کا کھانا اور صبح کا ناشتہ ہوٹل سے مل جائے گا اور وہ دن میں تین بار چائے بھی پی سکتا ہے۔

کرم دین کے لئے جیسے جنت کا دروازہ وا ہو گیا۔ کراچی کی سرزمین پر قدم رکھنے کے پہلے ہی دن اسے کام مل گیا تھا اور پیٹ بھرنے کا اور شب بسری کا بندوبست ہو گیا تھا۔ اس سے زیادہ فی الحال اور کیا چاہئے تھا؟

چند ہفتوں کے اندر اندر کرم دین کے دل و دماغ نے برسوں کے فاصلے طے کر لئے۔ ایک عظیم الشان صنعتی شہر کی زندگی کے پیچ و خم آہستہ آہستہ کھل رہے تھے۔ یہ شہر اس پر اپنے اسرار و رموز کا انکشاف کر رہا تھا اور وہ خود کو بھی اب اس بھاگتی دوڑتی رواں دواں زندگی کا ایک حصہ سمجھنے لگا تھا۔

اسے اب یہ شہر نہ کوئی طلسم خانہ لگتا تھا نہ حیرت کدہ اور نہ اس کے شہری اسے کسی عذاب میں گرفتار نظر آتے تھے۔ وہ اب اس فرق کو سمجھنے لگا تھا جو اس کی سابقہ دنیا اور موجودہ دنیا میں تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے اب تک وہ کسی ٹھہرے ہوئے پانی کے تالاب میں ڈبکیاں لگاتا رہا ہے اور اب یکایک کسی تیز دریا میں سرکش موجوں کے تلاطم کے ساتھ ساتھ ہاتھ پیر مارتا ہوا آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

بولٹن مارکیٹ میں واقع یہ ہوٹل رات کے گیارہ بجے بند ہوتا تھا اور صبح چھ بجے کھل جاتا تھا اور صبح سے لے کر رات تک اس میں ہزاروں آدمی آتے جاتے تھے۔ کرم دین کا کام میزوں پر مسلسل کپڑا مارتے رہنا اور ہر تین گھنٹے کے بعد فرش پر جھاڑو دینا تھا۔ اس کے علاوہ بھی صفائی کے دوسرے کام تھے۔ وہ بڑی خوش دلی اور ذوق و شوق کے ساتھ اپنا کام کرتا تھا۔

ہوٹل میں دن بھر طرح طرح کے لوگ آتے تھے اور نہ جانے کن کن چیزوں کے بارے میں باتیں کرتے تھے۔ کرم دین اب ان کی زبان سمجھنے لگا تھا۔ خود اس کی اپنی سرائیکی میں اردو کا عنصر غالب ہوتا جا رہا تھا۔

چھ ماہ کا عرصہ ایسے گزر گیا کہ کرم دین کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ بہت اچھی طرح اردو بولنے اور سمجھنے لگا ہے' وہ بڑی باقاعدگی کے ساتھ چائے کا عادی ہو چکا ہے' اس نے بہت سی نئی گالیاں سیکھ لی ہیں اور وہ سخت تھڑے پر سونے کا عادی ہو چکا ہے۔ کھانا تو اسے ہوٹل سے مل جاتا تھا۔ سگریٹ یا پان کا وہ عادی بن نہیں سکا۔ خرچہ برائے نام تھا۔ اس دوران اگر اس نے تھوڑے بہت پیسے خرچ کئے تھے تو اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے پر۔ ہوٹل ہفتے کے ہر دن کھلتا تھا اور کسی دن بھی چھٹی نہیں ہوتی تھی۔ اگر کسی ملازم کو چھٹی کرنا ہوتی تو اس کی اس دن کی اجرت کاٹ لی جاتی۔ سارے ملازم یومیہ اجرت پر کام کرتے تھے۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں کرم دین نے صرف چار دن کی چھٹی کی تھی اور وہ بھی اس لئے کہ وہ شہر کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ وہ بسوں میں بیٹھ کر مختلف جگہوں پر گیا اور اس نے نئے مناظر دیکھے۔ کنڈکٹروں کی زبان سے نکلنے والے عجیب و غریب الفاظ اب اس کے

لئے نامعلوم و نامانوس نہیں رہے تھے۔ وہ ان کے مفہوم' ان کی معنویت سے آشنا ہو چکا تھا۔ بسوں کی طرف بھاگتے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر اسے کوئی تعجب نہیں ہوتا تھا اور نہ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر اتنے بہت سارے لوگ ایک ہی وقت میں کہاں بھاگے چلے جا رہے ہیں۔

وہ ہوٹل میں اب صرف صفائی کرنے والا ہی نہیں رہا تھا بلکہ بیرا بن چکا تھا۔ درجنوں کھانوں کے نام اس کی نوکِ زبان پر رہتے تھے اور وہ گاہک کو ایک ہی سانس میں یہ سارے نام سنا دیتا تھا۔ زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔

کرم دین کی زندگی شاید ہوٹل کی بیراگیری سے آگے نہ بڑھ پاتی اگر اس روز ہوٹل کے نل کی ٹونٹی نہ خراب ہو جاتی۔

"بشیر سینیٹری والے کے پاس بھاگ کر جاؤ۔" سیٹھ نے کرم دین کو بلا کر اس سے کہا۔ "اس سے کہنا کہ کسی پلمبر کو بھیج دے وہ فوراً آ کر ٹونٹی کو ٹھیک کرے۔ سارے فرش پر پانی بہہ رہا ہے۔"

بشیر سینیٹری والے کی دکان دوسری گلی میں تھی۔ اس دکان میں اکثر اس ہوٹل سے چائے اور کھانا وغیرہ بھی جاتا تھا۔ کرم دین دکان کے مالک بشیر کو جانتا تھا اور وہاں کام کرنے والے لوگوں کو بھی۔ وہ لوگ بھی ہوٹل کے بیرے کرمو سے بخوبی واقف تھے۔ جو چوبیس گھنٹے اسی علاقے میں رہتا تھا۔

کرم دین' جو اپنا اصلی نام شاید خود بھی بھول چکا تھا اور اب صرف کرمو کے نام سے جانا جاتا تھا' سیٹھ کا حکم پاتے ہی سیدھا بشیر سینیٹری والے کی دکان کی طرف دوڑ پڑا۔ وہاں جا کر اس نے سیٹھ کا پیغام دیا اور بشیر نے سلطان کو اس کے ساتھ بھیج دیا۔ سلطان کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا جس میں اس کے اوزار تھے۔

سلطان کوئی پینتالیس چھیالیس سال کا ایک سن رسیدہ آدمی تھا اور بشیر کی دکان پر کام کرتا تھا۔ کرمو اسے جانتا تھا۔ ہوٹل میں پہنچ کر سلطان نے نل کا معائنہ کیا اور کرمو سے کہا کہ اس کے پاس ہی رکا رہے۔

سلطان نے ٹونٹی کو کھول کر الگ کر دیا اور اس عرصے میں کرمو نل کے پائپ میں کپڑا ٹھونسے ہوئے' اسے سختی کے ساتھ ہاتھ سے دبائے ہوئے وہیں کھڑا رہا اور پھر وہ سلطان کو کام کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"اس کا یہ واشر خراب ہو گیا ہے۔" سلطان نے جیسے اپنے آپ سے کہا اور اپنے

تھیلے میں سے نیا واشر نکال کر ٹونٹی میں لگا دیا۔ پھر اس نے ٹونٹی پائپ میں فٹ کر دی۔ اب اس میں سے پانی نہیں بہہ رہا تھا۔

"یہ تو بہت آسان کام تھا سلطان چاچا!" کرمو نے سلطان سے کہا۔ "اگر میرے پاس اوزار ہوتے تو میں خود بھی اس کو کر سکتا تھا۔"

"ابے تجھے کیا آتا ہے پلمبر کا کام؟" سلطان چاچا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تُو کیا جانے کون سی خرابی کو کس طرح دور کیا جا سکتا ہے؟ کبھی تُو نے یہ کام کیا ہے؟"

"کیا تو نہیں ہے سلطان چاچا! لیکن کر سکتا ہوں۔" کرمو نے ترنگ میں آ کر کہا۔ نئی زندگی نے اس کی خوداعتمادی میں بہت اضافہ کر دیا تھا اور اس کی متجسس فطرت اس کو مختلف چیزوں میں دلچسپی لینے پر ابھارتی رہتی تھی۔

سلطان نے اسے غور سے دیکھا اور پھر وہ اچانک ہنس پڑا۔ "کب سے کام کر رہا ہے تُو اس ہوٹل میں؟" اس نے پوچھا۔

"چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے چاچا!" کرمو نے فخر کے ساتھ جواب دیا۔ "ہوٹل کا کوئی کام اب ایسا نہیں ہے جسے میں نہ کر سکوں اور اب تو میں کئی طرح کے کھانے بھی پکا سکتا ہوں۔"

"ابے کھانا پکانا اور بیرا گیری کرنا اور بات ہے اور پلمبر کا کام کرنا اور بات ہے۔" سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ "ابے یہ تو ہنر ہے ہنر۔ بڑی محنت کرنی پڑتی ہے تب جا کر آدمی سیکھ پاتا ہے۔ میز پر کپڑا مارنا تھوڑی ہے۔"

"تو تم مجھے یہ ہنر سکھا دو نا سلطان چاچا!" کرمو روانی میں کہہ گیا۔ "میں بھی یہ کام سیکھ کر تمہاری طرح پلمبر بن جاؤں گا۔" کرمو نے جب یہ الفاظ کہے تھے تو اس کا اس وقت اس کام کو سیکھنے کا اور پلمبر بننے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ انسان جس طرح بعض اوقات بہت سی باتیں بلا ارادہ کہہ جاتا ہے' اسی طرح اس نے بھی یہ کہہ دیا تھا۔

"اچھا' دوپہر کو موقع نکال کر میرے پاس آنا۔" سلطان نے اس سے کہا۔ "پھر بات کریں گے۔"

لیکن سلطان کے جاتے ہی کرمو اس بات کو بالکل بھول گیا۔ وہ اپنے کام میں لگا رہا اور سلطان کے ساتھ ہونے والی بات چیت اسے یاد ہی نہ رہی۔ اس نے کوئی سنجیدگی سے تھوڑی کہا تھا کہ وہ پلمبر کا کام سیکھنا چاہتا ہے۔ سلطان سے اس کی ملاقات کوئی چار پانچ دن کے بعد اس وقت ہوئی جب سلطان چائے پینے اس ہوٹل میں آیا۔

"ابے تُو تو اس روز کہہ رہا تھا کہ پلمبر کا کام سیکھنا چاہتا ہے؟" سلطان نے اسے اپنائیت کے انداز میں ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ بھی کوئی کام ہے۔ کوئی ڈھنگ کا کام کیوں نہیں کرتا؟ ابھی تو تُو نوجوان ہے۔ ہاتھ پیروں میں دم ہے۔ کوئی ہنر سیکھ لے۔ ابے ہنر کے ہی تو پیسے ملتے ہیں۔ اس دن میں نے یہاں کتنی دیر کام کیا؟ زیادہ سے زیادہ دس منٹ اور کیا لے کر گیا تیرے سیٹھ سے؟ پورے دو روپے اور تُو' ابے بے وقوف' اسی طرح زندگی خراب کرتا رہے گا؟"

اس دن پہلی بار کرمو کو اپنے کام سے کراہت محسوس ہوئی۔ واقعی سلطان چاچا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہ بھی کوئی کام تھا بھلا دن بھر لوگوں کے جھوٹے برتن اٹھاتے رہو۔ میزیں صاف کرتے رہو۔ جھاڑو دیتے رہو۔ واقعی اس طرح تو میں ساری عمر گزارنے کے باوجود لطیف چاچا کی طرح بیرے کا بیرا ہی رہوں گا۔

کرمو کے ذہن میں کوئی نئی چیز کلبلانے لگی تھی۔ سلطان کی باتوں نے اسے ایک نیا راستہ دکھایا تھا۔ چنانچہ اس شام اس نے دکان پر جا کر سلطان سے تفصیلی بات چیت کی۔

"سارا کام سکھا دوں گا تجھے۔" سلطان نے کہا۔ "پورا پلمبر بنا دوں گا۔ پھر کبھی بھوکا نہیں مرے گا۔ آدمی کے ہاتھ میں ہنر ہو تو کام ضرور مل جاتا ہے۔ شہر میں روز نئے مکانات بن رہے ہیں۔ پلمبروں کی ہر جگہ ضرورت ہے اور جب مکانات بن جاتے ہیں تو پھر بھی پلمبروں کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ کیا سمجھا؟ سیکھے گا کام؟"

کرمو تو تیار ہی تھا لیکن مسئلہ اس کے رہنے کا تھا۔ ابھی تو اس کا سارا دن ہوٹل میں گزرتا تھا اور رات کو وہ تھڑے پر پڑ کر سو جاتا تھا لیکن ہوٹل کی نوکری چھوڑنے کے بعد یہ سہولت تو باقی نہیں رہ سکتی تھی۔

سلطان نے اس کا بھی بندوبست کر دیا۔ جب تک کام جاری تھا' تب تک وہ ایک زیر تعمیر مکان میں چوکیدار کے ساتھ رہ سکتا تھا۔ "بعد میں کہیں اور بندوبست کر دوں گا۔" سلطان نے کہا۔ "تیری اکیلی تو جان ہے' یں بھی رات کو پڑ رہیو۔"

اس طرح کرمو کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ چھ ماہ تک بولٹن مارکیٹ کے ایک ہوٹل میں بیرا گیری کرنے کے بعد اب وہ ناظم آباد کے ایک زیر تعمیر مکان میں منتقل ہو گیا۔ سلطان نے مکان کے مالک سے بات کر لی تھی اور اس نے پلمبر کے آدمی کو چوکیدار کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی تھی۔

کام تقریباً فوراً ہی شروع ہو گیا۔ کرمو کی ملاقات رئیس سے ہوئی۔ جو تقریباً تیس

بتیس سال کا ایک آدمی تھا اور سلطان کے ساتھ کام کرتا تھا۔

کرمو کے لئے یہ کام بالکل نیا تھا۔ شروع شروع میں تو اسے اوزاروں اور چیزوں کے نام یاد کرنے میں بھی کئی دن لگ گئے لیکن وہ اس کام میں گہری دلچسپی لے رہا تھا کیونکہ یہ محنت کی ایک نئی شکل تھی اور کرمو نے تو ہوش سنبھالتے ہی محنت شروع کر دی تھی۔ زندگی نے اسے چین کا سانس لینے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔

جب تک اس مکان میں پلمبنگ کا کام پورا ہوا' تب تک کرمو بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ اس نے کم اجرت ملنے کے باوجود بڑی دلجمعی کے ساتھ کام کیا تھا۔ یہ کام وہ سلطان کے لئے نہیں کر رہا تھا۔ یہ سب کچھ وہ اپنے لئے کر رہا تھا۔

اس مکان کا کام ختم ہوتے ہی سلطان کو اسی علاقے میں ایک اور مکان کا کام مل گیا۔ یہاں بھی اسے سینیٹری لائن ڈالنے کا پورا ٹھیکہ مل گیا تھا' کرمو اب ایک پلاٹ سے دوسرے پلاٹ پر منتقل ہو گیا۔ یہاں بھی اسے چوکیدار کے ساتھ رہنے کی اجازت مل گئی۔

اگلے آٹھ دس ماہ کے اندر اندر کرمو ایک بہت کامیاب اور ہوشیار پلمبر بن چکا تھا۔ سلطان اس کے کام سے بہت خوش تھا۔ کرمو میں سیکھنے کی صلاحیت تھی اور وہ ایک ذہین لڑکا تھا اور اب وہ سلطان کی ضرورت بن چکا تھا۔ کیونکہ سلطان اس پر پورا بھروسہ کرتا تھا۔ سلطان نے اس کے پیسے بھی بڑھا دیئے تھے۔ انہی دنوں رئیس' سلطان کا ساتھ چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا۔ دونوں میں لین دین کے معاملے میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا اور انہوں نے ساتھ کام کرنا چھوڑ دیا۔ اس طرح اب رئیس کی جگہ کرمو نے لے لی۔

لیکن رئیس میں اور کرمو میں بڑا فرق تھا۔ رئیس تو سلطان کا جونیئر پارٹنر تھا لیکن کرمو پارٹنر نہیں تھا۔ وہ ملازم تھا۔ وہ تو دیہاڑی پر کام کرتا تھا۔

ایک سال کا عرصہ گزرتے گزرتے کرمو سلطان کے کاروبار کا ایک جزو بن گیا۔ وہ اب ایک کامیاب پلمبر تھا اور سلطان کی نگرانی اور ہدایت کے بغیر آزادانہ طور پر اپنا کام کر سکتا تھا۔ پہلے سلطان نے اسے اپنی اور رئیس کی مدد کے لئے رکھا تھا۔ اب خود کرمو کی مدد کے لئے اس نے دو لڑکے رکھے تھے۔ کام بڑھتا اور پھیلتا جا رہا تھا۔ نئے مکانات بڑی تیزی کے ساتھ بن رہے تھے اور کوئی بھی مکان پلمبنگ کے کام کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا اور اس وقت شہر میں پلمبروں کی بہتات نہیں تھی۔

سلطان ناظم آباد کی پہلی چورنگی کے قریب مسلم لیگ کوارٹرز میں رہتا تھا۔ یہ کوارٹر اس کا اپنا تھا جو اس نے بڑی جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا۔ اس میں وہ اپنی بیوی اور اس

کے ایک بھائی شجاعت کے ساتھ رہتا تھا۔ سلطان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ پھر شجاعت کو' جس نے اس سال بی کام کا امتحان پاس کیا تھا' کوئٹہ میں سرکاری نوکری مل گئی اور وہ چلا گیا۔ سلطان اور اس کی بیوی اکیلے رہ گئے۔

سلطان اور اس کی بیوی رابعہ نے طے کیا کہ اب کرمو ان کے ساتھ رہے گا۔ اس سے پہلے کرمو برابر سلطان کے گھر آتا جاتا رہتا تھا اور اس کی بیوی کو وہ چاچی کہتا تھا۔

کرمو کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ فوراً اس کے لئے تیار ہو گیا۔ اس کا تو رواں رواں سلطان چاچا کا احسان مند تھا۔ وہ اب اگر ایک ہنرمند تھا' ایک اچھا کاریگر تھا تو یہ سلطان چاچا کی ہی بدولت تھا اور اب وہ اس وقت کو یاد کر کے ہنستا تھا جب وہ ہوٹل میں کام کرتا تھا اور یہ سوچتا تھا کہ لطیف چاچا کی طرح وہ بھی ساری زندگی ہوٹل کا کام کرتا رہے گا اور اسی میں خوش رہے گا۔ بھلا ایک کاریگر کے کام سے ہوٹل کی بیرا گیری کا کیا مقابلہ تھا!

چنانچہ کرمو اب سلطان کے ساتھ اس کے گھر میں رہنے لگا۔ اب سلطان چاچا صرف "چاچا" رہ گیا تھا اور رابعہ تو پہلے سے ہی چاچی تھی۔ جلد ہی کرمو اس مختصر سے خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ سلطان اور رابعہ لاولد تھے۔ انہوں نے کرمو کو اپنا بیٹا بنا لیا اور کرمو کو نئے ماں باپ مل گئے۔

☆======☆======☆

کرمو کو سلطان کے گھر میں رہتے ہوئے اور اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے دو سال کا عرصہ گزر گیا اور اس عرصے کے دوران کرمو کی زندگی نے کئی نئی کروٹیں لیں۔ رابعہ نے اسے لکھنا پڑھنا سکھایا۔

وہ اردو اچھی خاصی لکھنا پڑھنا سیکھ گیا اور اردو کے اخبارات اور رسالے اکثر پڑھتا تھا اور جہاں تک بولنے کا تعلق تھا تو اب مکمل روانی اور صحت کے ساتھ بولتا تھا۔ اس کی زبان سن کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی مادری زبان کچھ اور ہے۔ وہ جس ماحول کا حصہ بن گیا تھا یہ اس کا قدرتی اثر تھا۔

سلطان کے سامنے والے کوارٹر میں ایک ماسٹر صاحب رہتے تھے جن کا نام نبی بخش تھا اور ساری گلی میں ماسٹر نبی بخش کے نام سے جانے جاتے تھے۔ کسی ہائی اسکول میں ٹیچر تھے اور محلے میں ان کی بڑی عزت تھی۔ ماسٹر نبی بخش کی دو اولادیں تھیں۔ ایک بیٹا جس کا نام ساجد تھا اور اس سے کوئی سال بھر چھوٹی بیٹی' جس کا نام تمینہ تھا۔ ساجد نے اسی

سال میٹرک کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور تہمینہ اب میٹرک میں آئی تھی۔

کرمو جب شروع شروع میں یہاں رہنے کے لئے آیا تو وہ اکثر صبح کو تہمینہ کو کتابیں لئے، تیز تیز قدموں سے، گھر سے نکل کر گلی میں سے گزرتا ہوا دیکھتا۔ دبلی پتلی، دراز قد، گوری رنگت، سیاہ آنکھوں اور چمکیلے بالوں والی یہ نوعمر لڑکی کرمو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اُسے بس یونہی دیکھتا رہتا۔

شروع شروع میں تو یہ ایک سادہ سا منظر تھا، گلی کے بہت سے دوسرے مناظر میں سے ایک، جس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن رفتہ رفتہ اس منظر نے کرمو کے لئے ایک خاص نوعیت اختیار کر لی اور تہمینہ کا وجود اس کے لئے ایک گہری معنویت اختیار کرتا گیا۔ یہ سب کچھ اس قدر خاموشی سے، اتنے غیر محسوس طریقے پر ہوا کہ کرمو کو خود بھی اس کا علم نہیں ہو سکا کہ کب اور کیسے تہمینہ اس کے خواب و خیال کی دنیا میں آباد ہو گئی۔ اب وہ ہر صبح اپنے کام پر جانے سے پہلے اس منظر کا منتظر رہتا تھا۔ ہوا کے ایک جھونکے کی طرح، خوشبو کی ایک موج کی طرح، کرمو اس سے بہت دور ہوتا تھا لیکن پھر بھی اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس کے شاخِ گل کی طرح لچکتے ہوئے پیکر کی مہک سونگھ رہا ہے، اس کے سرسراتے ہوئے ریشمی پیراہن کو اپنی موٹی، بھدی اور مسلسل کام کے باعث پتھر کی طرح سخت ہو جانے والی انگلیوں سے ہولے ہولے، بہت احتیاط کے ساتھ چھو رہا ہے کہ کہیں اس کی انگلیوں کے کھردرے لمس سے اس محبوب لباس کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

یہ ایک عجیب جذبہ تھا جس کی لذت اور سرخوشی کو کرمو کا نوجوان دل پہلی بار محسوس کر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ تہمینہ کے لئے اس کے احساسات، حسن نزاکت اور سرخوشی کی بلندیوں کو چھونے لگے۔ وہ جب تہمینہ کے بارے میں سوچتا تو اسے لگتا کہ دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی کہ تہمینہ کے بارے میں سوچا جائے، اس کے پُرجمال سراپا کا تصور کیا جائے اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کا انتظار کیا جائے۔ زندگی میں ایک نامعلوم سی شیرینی گھل گئی تھی۔ ہر چیز خود بخود اچھی لگنے لگی تھی۔ تہمینہ کو دیکھنے کے بعد جب وہ کام پر جاتا تو اسے کام کرنا اور بھی زیادہ اچھا لگتا۔ سارا کام خوبصورت لگتا۔ ساری دنیا خوبصورت لگتی۔ وہ لوگ بھی اچھے لگنے لگتے جو اس کے ساتھ کام کر رہے تھے۔

یوں کرمو کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ تہمینہ کے لئے اس کے دل میں بتدریج پیدا ہونے والی محبت خود اس کے اپنے وجود کی ایک نئی دریافت تھی۔ اس نے اپنے آپ

کو نئے سرے سے تلاش کیا تھا۔

ماسٹر نبی بخش ان بدنصیب سفید پوشوں میں تھے جو سماج کے سب سے زیادہ پیچیدگیوں سے بھرپور طبقے کی تشکیل کرتے ہیں۔ محدود آمدنی، سفید پوشی کا بھرم، تعلیم یافتہ ہونے کا تفاخر، شرافت اور اعلیٰ نسبی کی انا اور جسمانی محنت کرنے والوں کو اپنے سے کمتر اور حقیر جاننے کا مریضانہ رجحان۔ یہ ساری صعوبتیں اس درمیانہ طبقے کا خاصہ ہوتی ہیں جس سے ماسٹر نبی بخش تعلق رکھتے تھے اور وہ بلاشبہ اپنے طبقے کے ایک مکمل نمائندے بھی تھے۔ ایک اسکول ٹیچر کو ملنے والی معمولی تنخواہ میں گھر کا خرچ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر چلایا جاتا تھا۔ ماسٹر صاحب کی بیوی آمنہ ایک سادہ مزاج عورت تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی آمدنی میں کسی بڑے اور قابل لحاظ اضافے کا تازندگی کوئی امکان نہیں تھا۔ ماسٹر نبی بخش اسکول میں پڑھانے کے علاوہ شام کو کئی ٹیوشنز بھی پڑھاتے تھے۔ اس طرح کچھ فاضل آمدنی ہو جاتی تھی۔

سلطان اور ماسٹر نبی بخش کی مالی حیثیتوں میں بہت بڑا فرق تھا۔ ماسٹر نبی بخش کو جو ماہانہ تنخواہ ملتی تھی، سلطان اتنے پیسے ایک ہفتے سے بھی کم مدت میں کما رہا تھا اور اس کی آمدنی میں مسلسل اضافہ بھی ہو رہا تھا جبکہ ماسٹر نبی بخش تو برسوں سے ایک ہی تنخواہ پر زندگی کی گاڑی کو گھسیٹتے ہوئے چل رہے تھے اور اس تنخواہ میں ہر سال جو معمولی سا اضافہ ہوتا تھا، وہ روز افزوں مہنگائی کی نذر ہو جاتا تھا اور کبھی بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مہینے کے آخر میں تنگی کا احساس نہ ہوتا ہو۔

وہ اتوار کا دن تھا اور ماسٹر نبی بخش کے گھر میں ایک نل خراب ہو گیا۔ اس کی ٹونٹی بند ہی نہیں ہوتی تھی اور پانی مسلسل بہے جا رہا تھا۔ ساجد نے اسے ٹھیک کرنا چاہا لیکن ایک تو اس کے پاس اوزار نہیں تھے، دوسرے اسے یہ کام آتا ہی نہیں تھا۔ ماسٹر نبی بخش نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ سلطان کے گھر چلا جائے اور سلطان یا کرمو کو بلا لائے۔

دونوں گھرانوں میں آپس میں پڑوسیوں جیسے رسمی تعلقات تھے اور تمام افراد ایک دوسرے سے واقف تھے۔ ماسٹر نبی بخش کے گھر والوں کو وہ وقت بھی یاد تھا جب سلطان اِدھر اُدھر جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا اور اس کی بیوی ایک میلا کچیلا، پھٹا پرانا برقع گھسیٹتی ہوئی پڑوسیوں سے دو دو چار چار روپے ادھار مانگا کرتی تھی اور محلے کی پرچون کی دکان سے ادھار سامان خریدا کرتی تھی۔ بلکہ ایک بار تو دکاندار نے اسے ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا اور اس کی خاصی بے عزتی بھی کر ڈالی تھی۔

لیکن اب تو ان لوگوں کے حالات بالکل ہی بدل چکے تھے۔ رابعہ کا پھٹا پرانا برقع تو عرصہ ہوا کسی کوڑا گھر کی زینت بن چکا تھا۔ بلکہ اب تو اس نے سر سے برقع ہی اتار پھینکا تھا۔ اس کے جسم پر جھلملاتے ہوئے قیمتی کپڑے ہوتے۔ بسوں میں سفر کرنا تو اس نے تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا۔ جہاں جاتی رکشہ میں بیٹھ کر جاتی۔ گلی میں آنے والے رکشوں میں تین چوتھائی رکشے ایسے ہوتے تھے جو سلطان کے دروازے پر آ کر رکتے تھے۔ خود سلطان اور کرمو بھی زیادہ تر رکشہ سے آتے جاتے تھے۔

ساجد ان کے گھر آیا تو اس کی ملاقات سلطان سے ہوئی اور اس نے سلطان کو نل کی خرابی کے بارے میں بتایا۔

"چھٹی کا دن ہے سلطان چچا!" اس نے بتایا۔ "اب اگر چورنگی جاؤں بھی تو کوئی دکان کھلی نہیں ملے گی۔ آپ اگر ذرا مہربانی کریں............"

"ارے بیٹا! اس میں مہربانی کی کون سی بات ہے۔" سلطان نے ہنس کر کہا۔ "ہمارا تو کام ہی یہی ہے بیٹے۔ ہنر ہے یہ ہمارا۔ ہم تو اسی ہنر سے رزق حاصل کرتے ہیں اور تم لوگ تو پڑوسی ہو۔ بھلا تمہارا کام کیوں نہیں کریں گے؟ تم چلو میں ابھی کرمو کو بھیجے دیتا ہوں۔ وہ آ کر نل ٹھیک کر دے گا۔"

سلطان نے جب کرمو سے ماسٹر نبی بخش کے گھر جا کر نل ٹھیک کرنے کو کہا تو کرمو کا دل ایک میٹھی میٹھی مسرت کے نرم اور لطیف احساس کے ساتھ دھڑکنے لگا۔ وہ اس سے پہلے صرف ایک بار ماسٹر نبی بخش کے گھر گیا تھا' جب آمنہ چچی نے اس سے کچھ سودا منگوایا تھا۔ کیونکہ گھر میں اس وقت کوئی نہیں تھا اور کچھ چیزوں کی فوری ضرورت آ پڑی تھی۔

کرمو فوراً اوزاروں کا تھیلا لے کر وہاں جا پہنچا اور اس کی متجسس نظروں نے سب سے پہلے تمینہ کو تلاش کیا۔ وہ اسے برآمدے میں نظر آئی جہاں وہ پائیدان والی مشین کے سامنے بیٹھی ہوئی کچھ سی رہی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بہت قریب سے دیکھا اور کرمو کے دل میں جیسے رنگ برنگی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ اسے یہ سارا گھر تمینہ کی خوشبو سے مہکتا ہوا لگ رہا تھا۔ کتنا اچھا تھا یہ گھر اور اس گھر کے سارے لوگ۔ ماسٹر صاحب' آمنہ چچی اور ساجد۔ ہاں یہ سب لوگ اچھے تھے۔ یہ اس لئے اچھے تھے کیونکہ یہ تمینہ کے گھر والے تھے۔ ان میں سے ہر ایک میں تمینہ کا رنگ تھا' تمینہ کی خوشبو تھی۔ تمینہ کا وجد آفریں جلوہ تھا۔

یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی ایک شخص' صرف تنہا ہی نہیں' بلکہ اپنے جملہ لواحقین کے ساتھ کسی انسان کے لئے ایک گہری اپنائیت اور معنویت اختیار کر جاتا ہے۔ وہ شخص اور اس کے لواحقین اس انسان کے لئے لطافت' پاکیزگی' سرخوشی اور نرمئی احساس کا سرچشمہ بن جاتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی معاملہ کرمو کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ اسے اس گھر کے ہر ہر فرد میں ایک بے نام سی کشش محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سب لوگ اسے بہت پیارے لگ رہے تھے اور اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ان کے ساتھ بیٹھا رہے۔ باتیں کرتا رہے اور یہ ملاقات کبھی ختم نہ ہو۔

اس نے جان بوجھ کر اپنے کام میں زیادہ وقت لگایا۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ کا کام تھا لیکن اس نے پورے پندرہ منٹ لگا دیئے۔ اس دوران تمینہ برآمدے میں بیٹھی سلائی کرتی رہی اور اس نے چند بار نظریں اٹھا کر اس طرف دیکھا جہاں صحن میں لگے ہوئے نل کو کرمو ٹھیک کر رہا تھا اور پھر وہ سلائی بند کر کے خود بھی وہاں آ گئی۔

"کیا ہوا کرمو؟" اس نے براہِ راست کرمو سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "کیا کچھ زیادہ خرابی ہو گئی ہے اس میں؟ ٹھیک نہیں ہو رہا ہے؟"

کرمو کا سارا وجود جیسے پگھلنے لگا' بہنے لگا۔ اس کا جسم بالکل سبک اور لطیف ہو کر جیسے ہوا میں تحلیل ہونے لگا۔ تمینہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کے پاس موجود تھی۔ اس کے بالکل قریب موجود تھی۔ اتنی قریب کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا تھا۔

"ابھی ٹھیک ہوتا ہے دو منٹ میں۔" اس نے اپنی روح کی ساری نرمی کو' ساری حرارت کو اپنے لب و لہجے میں سمویا۔ "ٹھیک کیوں نہیں ہو گا؟"

اور اس سے اگلے منٹ ٹونٹی ٹھیک ہو گئی۔ کرمو نے اپنے اوزار سمیٹ کر تھیلے میں ڈالے اور جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت ماسٹر نبی بخش کمرے سے نکل کر آئے اور انہوں نے کرمو کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ان کے ہاتھ میں کچھ پیسے موجود تھے۔

"یہ رکھ لو کرمو! اور بھئی تمہارا بہت بہت شکریہ۔" انہوں نے ایک سرپرستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نہیں ماسٹر صاحب!" کرمو نے جلدی سے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اور وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

کرمو کے دل میں جو ایک نیا طوفان برپا ہو گیا تھا وہ اب اپنی نکاسی کے لئے راستہ

تلاش کر رہا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا کہ اگر اس نے تہمینہ سے بات نہیں کی تو اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا۔ اس کے امنڈتے ہوئے جذبات نے اسے حوصلہ بخشا اور اگلے دن وہ کام پر جانے کے لئے گھر سے ذرا جلدی نکل گیا۔ اب معمول یہ تھا کہ سلطان تو کافی دیر سے گھر سے نکلتا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ سارے کام کو سنبھالنے کے لئے کرمو تو موجود تھا۔ پھر سلطان کو صبح ہی صبح بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔

چنانچہ کرمو گھر سے نکلا اور گلی کے نکڑ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس طرح کہ گلی میں سے اسے نہ دیکھا جا سکے اور اب وہ ایک ایسے عذاب سے گزر رہا تھا جو اسے جلائے ڈال رہا تھا۔ یہ انتظار کا عذاب تھا اور یہ عذاب تھا ان نامعلوم اور نادیدہ کڑی ساعتوں کا جب وہ اس سے ہمکلام ہو گا۔ خدا جانے وہ کیا کہے گی؟

اور پھر وہ آ گئی .... روز کی طرح .... ہوا کے جھونکے اور خوشبو کی موج کی طرح .... اس نے کرمو کو گلی کے نکڑ پر کھڑے دیکھا اور خود ہی رک گئی۔ اس نے مسکرا کر کرمو کی طرف دیکھا اور کرمو کو لگا کہ یہ ساری کائنات، صرف ابھی اور اسی لمحے پیدا ہوئی ہے۔

"تم یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو کرمو!" اس نے پوچھا۔

"میں رکشہ کا انتظار کر رہا ہوں۔" کرمو نے فوراً جواب دیا۔ "تم تو اب اسکول جا رہی ہو؟"

"ہاں۔" تہمینہ نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے کرمو کی طرف دیکھا۔ "اسکول جا رہی ہوں۔ آج کل بہت پڑھائی کرنی پڑ رہی ہے۔ امتحان جو قریب ہیں۔ گھر پر بھی بہت پڑھنا پڑتا ہے۔ رات کو ابا سے پڑھتی ہوں۔"

تہمینہ خود ہی باتیں کئے جا رہی تھی اور کرمو کی نس نس میں یہ وجد آفریں اور زندگی بخش احساس جاگ اٹھا تھا کہ وہ اس سے گریزاں نہیں ہے، متنفر نہیں ہے، بلکہ وہ تو خود اس سے باتیں کرنا چاہتی ہے۔

"بہت زیادہ پڑھتی ہو تم؟" کرمو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تھک نہیں جاتیں اتنا پڑھتے پڑھتے؟"

"ارے .... بھلا پڑھنے سے بھی کوئی تھکتا ہے؟" تہمینہ نے ہنس کر کہا۔ "اور ہاں، کل تم نے اپنے کام کے پیسے کیوں نہیں لئے؟"

"پیسے؟" کرمو نے اپنی بھرپور نظریں تہمینہ کے چہرے پر گاڑ دیں۔ جو صبح کے وقت

کھلے ہوئے گلاب کے پھول کی طرح تر و تازہ اور شگفتہ تھا۔ کیا دنیا میں اس سے زیادہ خوبصورت شے بھی کوئی اور ہو سکتی تھی؟ "لو بھلا میں تم لوگوں سے پیسے لوں گا؟ اور پھر میں تو گھروں پر جا کر کام بھی نہیں کرتا اب، پہلے کرتا تھا لیکن اب تو نئے مکانوں میں پوری پوری فٹنگ کے لئے اتنے کام ہوتے ہیں کہ انہی سے فرصت نہیں ملتی۔ پھر رات کو چاچی سے پڑھتا بھی ہوں۔" اس نے تہمینہ کو یہ بتانا ضروری سمجھا۔

"تم پڑھتے بھی ہو؟" تہمینہ نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں۔" کرمو نے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "چاچی نے مجھے کافی پڑھا دیا ہے اور خوب اچھی طرح سے لکھ پڑھ سکتا ہوں اور روز رات کو چاچی اب بھی مجھے پڑھاتی ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" تہمینہ نے کہا۔ "تم ہمارے ابا سے کیوں نہیں پڑھنے آ جاتے؟ وہ تو بہت اچھی طرح سے پڑھاتے ہیں۔"

"ہاں۔" کرمو نے خوشی کے ساتھ سوچتے ہوئے کہا۔ "لیکن ماسٹر صاحب کے پاس معلوم نہیں وقت ہو یا نہ ہو۔"

"اچھا، میں خود ابا سے بات کروں گی۔" تہمینہ نے کہا۔ "وہ میری بات نہیں ٹالیں گے۔ اگر تمہیں پڑھنے کا شوق ہے تو ابا سے پڑھ لو۔ ان جیسے اچھے استاد کم ہی ہوتے ہیں۔"

"اچھا، تم ضرور بات کرنا۔" کرمو نے کہا۔ "اور چلو میں تمہیں رکشہ میں اسکول تک چھوڑ دوں..........."

"نہیں نہیں۔" تہمینہ ایک دم گھبرا گئی۔ "میں تو روز پیدل جاتی ہوں۔ چورنگی یہاں سے دور ہی کتنی ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ اچھا اب میں جاتی ہوں۔" اس نے مسکرا کر آہستہ سے گردن ہلائی اور وہاں سے چل پڑی۔

کرمو سے ان لمحوں کی خوشی سمیٹی نہیں جا رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ پر گم صم کھڑا ہوا ایک نشاط آفریں سحر میں گرفتار تھا اور اسے ڈر تھا کہ اگر اس نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو یہ سحر ٹوٹ جائے گا، نہیں اسے ٹوٹنا نہیں چاہئے۔ وہ ان لمحوں کو، ان لمحوں میں حاصل ہونے والی سرخوشی و شادمانی کو اور اس نشاط آفریں سحر کو بہت سنبھال کر رکھے گا۔ یہ تو بہت بڑی دولت ہے۔ اسے بچا کر رکھنا ہے اور کرمو نے ان ساعتوں کی روح پرور شگفتگی کو چپکے سے اپنے دل کے نہاں خانے میں بند کر کے قید کر لیا۔ آنے والے کل کا تصور اس کے لئے اور بھی زیادہ راحت افزا اور جنوں خیز تھا۔

اگلے دن سے ماسٹر نبی بخش نے اسے پڑھانا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنی بیٹی کی سفارش قبول کرلی تھی۔ "بے چارہ اَن پڑھ مزدور ہے۔ دو حرف سیکھ لے گا تو اچھا ہی ہے۔ اسے کوئی نوکری نہیں کرنی ہے لیکن پھر بھی پڑھنا لکھنا کام ہی آ جائے گا۔" ماسٹر صاحب کے دل میں کرمو کے لئے رحم اور ہمدردی کے جذبات جاگے تھے۔

کرمو کا ماسٹر صاحب کے گھر میں آنا جانا شروع ہو گیا اور کرمو اور تہمینہ کے درمیان چپکے ہی چپکے محبت کے وہ اَن دیکھے شگوفے پھوٹنے لگے جن کی مہک کو ان دونوں کے علاوہ اور کسی نے اب تک محسوس نہیں کیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ پر بہت محتاط تھے۔ کھل کر اقرارِ محبت تو کسی طرف سے بھی نہیں ہوا تھا لیکن شاید اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ جذبوں کا اظہار صرف زبان سے ہی تو نہیں ہوتا۔ وہ دونوں اس بات سے بخوبی واقف ہو چکے تھے کہ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے کیسی کیسی خاموش قیامتیں موجود ہیں اور اشاروں کنایوں میں بہت سی باتیں ہو جاتی تھیں۔

کرمو کے لئے یہ خوشی ناقابلِ برداشت تھی۔ بھلا تہمینہ کی محبت سے بڑی کوئی اور دولت بھی اس دنیا میں ہو سکتی تھی؟ تہمینہ اس کو چاہتی تھی اور شاید یہی اس کی زندگی کا واحد مدعا تھا۔ تہمینہ .... تہمینہ .... تہمینہ .... اس کی ہر سانس میں یہی نام بس کر رہ گیا تھا اور وہ جہاں بھی جاتا' جہاں بھی ہوتا اس نام کی خوشبو اس کے ساتھ ہوتی۔

"کیوں رے' یہ کیا چکر ہے؟" رابعہ نے ایک شام اچانک اس سے پوچھا۔ "تو ماسٹر صاحب کے گھر کے ہر وقت صدقے قربان کیوں ہوتا رہتا ہے؟"

کرمو ایک دم سٹپٹا گیا۔ اس نے تو اپنے اس قیمتی راز کو بہت چھپا کر رکھا تھا اور کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی لیکن وہ اس بات سے واقف نہیں تھا کہ پہچاننے والے تو لفافہ دیکھ کر خط کے مضمون کو بھانپ لیتے ہیں۔

"میں .... میں وہاں ماسٹر صاحب سے پڑھنے کے لئے جاتا ہوں چاچی!" اس نے چور نظروں سے رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "بھلا اس میں کیا برائی ہے؟ اور وہ مجھ سے ٹیوشن کے پیسے بھی نہیں لیتے۔ میں نے بہت کہا مگر وہ مانے ہی نہیں۔ کہنے لگے آدھے پونے گھنٹے کی پڑھائی کے کیا پیسے لوں اور وہ بھی ایک پڑوسی سے۔"

"دیکھ بھائی کرمو' محلے پڑوس کا معاملہ ہے۔" رابعہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "اگر کوئی ایسی ویسی بات ہے تیرے دل میں تو مجھے بتا دے۔ ایسا نہ ہو کہ بعد میں شکایت آئے۔ وہ شریف اور خاندانی لوگ ہیں اور اگر لڑکی ایک بار بدنام ہو جائے تو پھر یہ داغ چھٹائے نہیں

چھوٹتا۔ تیرا وہاں اتنا زیادہ آنا جانا مجھے پسند نہیں ہے۔ یہ چکر ختم کر دے۔"

"چاچی!" کرمو نے سہم کر کہا۔ "میں تو صرف ماسٹر صاحب سے پڑھنے..........."

"مجھے اُلّو بناتا ہے۔" رابعہ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ابھی اٹھاؤں گی جوتی اور مار مار کر چندیا گنجی کر دوں گی۔ کل کا لونڈا چلا ہے مجھے بہلانے۔ سچ سچ بتا' کیوں گھستا ہے وہاں جا جا کر تو؟"

کرمو کے دل میں ایک نئی امید نے' ایک نئی امنگ نے کروٹ لی۔ یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔ اب جب چاچی نے خود ہی بات چھیڑ دی ہے تو انہیں سب کچھ کیوں نہ بتا دوں؟ آخر وہ میری ماں کی جگہ ہیں۔ ان لوگوں کے علاوہ میرا ہے ہی کون؟

"اچھا تو میری پیاری چاچی! اچھی چاچی! میری بات سن لو۔" اس نے رابعہ کے قریب فرش پر بیٹھ کر اس کے دونوں پیروں کو تھامتے ہوئے کہا۔ "کر دو نا میری شادی تہمینہ سے .... وہ بہت اچھی لڑکی ہے..........."

"ہوں۔" رابعہ نے معنی خیز انداز میں گھورتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "تو یہ لچھن ہیں تیرے۔ اسی لئے وہاں گھستا ہے جا جا کر۔ ارے نامراد اگر ماسٹر صاحب کو پتہ چل گیا تو بیچ سڑک پر تیرے سینکڑوں جوتے لگائیں گے۔ یہ تیرے دل میں خیال کہاں سے آیا کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دیں گے؟"

"مگر چاچی .... اگر .... میرا مطلب ہے .... یعنی یہ کہ .... اگر خود ان کی بیٹی بھی اس کے لئے خوشی سے تیار ہو تو پھر؟"

رابعہ ایک دم چپ ہو گئی اور سناٹے میں آ کر کرمو کو دیکھنے لگی۔ کرمو نے نظریں جھکا لیں اور جلدی جلدی رابعہ کے پاؤں دابنے لگا۔ رابعہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"اچھا اگر یہ بات ہے تو میں تیرے چاچا سے بات کروں گی۔" رابعہ نے کہا۔ "اور اب دور ہو میرے سامنے سے' چھوڑ میرے پیر۔ کم بخت کے ہاتھ ہیں کہ ہتھوڑے' میری تو ہڈیاں دکھنے لگیں۔"

کرمو ہنستا ہوا اس کے پاس سے ہٹ گیا اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بات کچھ بنتی نظر آ رہی تھی۔

اس رات رابعہ نے اپنے شوہر سے اس بارے میں گفتگو کی۔ کرمو باہر صحن میں تھا اور کھلی ہوئی کھڑکی کے پاس موجود تھا تاکہ اس گفتگو کو خود بھی سن سکے۔

"کچھ باؤلا تو نہیں ہو گیا ہے سالا۔" سلطان نے گرج کر کہا۔ "اپنی اوقات بھول گیا ہے بے وقوف کا بچہ۔"

"کیوں؟ کیا خرابی ہے اس کی اوقات میں؟" رابعہ نے اس کی طرفداری کرتے ہوئے کہا۔ "کوئی آوارہ نکھٹو ہے وہ؟ کماؤ پوت ہے' کچھ لاتا ہے یہ جھولی بھر کے اور ماسٹر صاحب کہاں کے رئیس اعظم ہیں؟ ان کے دروازے پر کون سے ہاتھی جھول رہے ہیں؟ کون سی رئیسی کی گنگا بہہ رہی ہے ان کے آنگن میں؟"

"یہ بات نہیں ہے نیک بخت!" سلطان نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "وہ سب لوگ پڑھے لکھے ہیں' تعلیم یافتہ ہیں اور ہم .... ہم ٹھہرے جاہل کبڈے۔ ہمارا ان کا جوڑ نہیں ہے۔ مانا کہ ہم نے کرمو کو بیٹا بنا لیا ہے اور اسے بیٹے ہی کی طرح رکھتے ہیں لیکن بھائی' وہ اپنی بیٹی ہمیں نہیں دیں گے۔"

"تو اگر کرمو زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہے تو کیا ہوا؟" رابعہ نے اصرار جاری رکھا۔ "دس پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ کماتا ہے۔ پڑھے لکھے بے چارے تو نوکری کے لئے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور اسے تو زندگی بھر کسی نوکری کی ضرورت نہیں ہو گی۔ سونے چاندی میں تول دے گا اپنی دلہن کو۔"

رابعہ نے کسی نہ کسی طرح اپنے شوہر کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کرمو کا پیغام لے کر ماسٹر نبی بخش کے گھر جائے۔ سلطان پہلے تو بہت گھبرا رہا تھا اور کسی طرح تیار ہی نہیں ہوتا تھا لیکن رابعہ نے اس کی ہمت بندھائی۔

"ارے بھئی زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ انکار کر دیں گے؟" اس نے کہا۔ "تو کون سا آسمان پھٹ پڑے گا۔ آخر جہاں بیری ہوتی ہے وہاں ڈھیلے آتے ہی ہیں۔ ایک ڈھیلا ہماری طرف سے بھی سہی۔ اگر نہیں مانتے تو نہ مانیں۔ ہماری طرف سے ایک روٹی زیادہ کھائیں' وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش۔"

اگلے روز سلطان احمد نے نہا دھو کر بہترین کپڑے پہنے' خوشبو لگائی۔ بالوں میں خوشبودار تیل ڈال کر خوب اچھی طرح کنگھی کی اور بہت بن سنور کر' نک سک سے درست ہو کر ماسٹر نبی بخش کے گھر پہنچا۔ ماسٹر صاحب گھر پر ہی موجود تھے۔ انہوں نے ایک مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ سلطان احمد کا خیر مقدم کیا۔

"آؤ سلطان میاں!" انہوں نے کہا۔ "بیٹھو' آج کہاں نکل پڑے ادھر! تم تو بہت دنوں سے آئے ہی نہیں۔"

"بس' ماسٹر صاحب! کیا کروں۔" سلطان نے ایک مسکین اور عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کام بڑھتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ سر اٹھانے کی مہلت نہیں ملتی۔ وہ تو خدا بھلا کرے بیٹے کرم دین کا اس نے زیادہ تر کام خود سنبھالا ہوا ہے۔ ورنہ میں اکیلا تو کبھی بھی اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایک ہی وقت میں چار چار چھ چھ مکانوں کا کام چلتا رہتا ہے اور وہ سب سنبھال لیتا ہے۔"

"اچھا ہونہار لڑکا ہے۔" ماسٹر صاحب نے کہا۔ "اسے پڑھنے کا بھی شوق ہے۔ میں تھوڑا سا وقت نکال کر اسے کچھ پڑھا دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم اگلے سال اسے پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دلوا دو۔ میرے ایک جاننے والے گولی مار میں ایک شبینہ سکول کھولنے والے ہیں جہاں بڑی عمر کے لڑکوں کو پڑھایا جائے گا۔ کرمو اگر محنت کرے تو میٹرک کر لے گا۔"

"اس وقت .... میں دراصل ایک خاص غرض سے آپ کے پاس آیا تھا ماسٹر صاحب!" اس نے وہ جملے بولنے شروع کئے جو اس نے اپنی ساری ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے پہلے سے سوچ کر تیار کر رکھے تھے۔ "میں آپ سے کچھ مانگنا چاہتا ہوں.........."

"مجھ سے؟" ماسٹر صاحب نے سخت حیران ہو کر کہا۔ "مجھ سے کیا مانگنا چاہتے ہو سلطان میاں! ہاں بولو۔ کیا کام ہے؟"

"میں اور آپ کی بھابی .... ہم دونوں کی دلی خواہش تھی کہ آپ کرمو کو اپنی فرزندی میں قبول کر لیتے .... اور تہمینہ بٹیا کو ہم اپنی بیٹی.........."

"کیا .... کیا؟" شدید ترین حیرت اور ناقابل بیان صدمے سے ماسٹر صاحب کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ "کیا کہہ رہے ہو سلطان میاں؟"

"ہم کرم دین کا رشتہ دینا چاہتے ہیں تہمینہ بٹی کے لئے.........."

"سلطان میاں!" ماسٹر صاحب کسی چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح پھنپھنا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی ٹانگیں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ انہوں نے جلدی سے میز کے کونے کو پکڑ لیا۔ "تمہاری اتنی بڑی بات کہنے کی ہمت کیسے ہوئی سلطان میاں!" ماسٹر صاحب کی آواز بھی کانپ رہی تھی۔ "تم لوگ .... تم لوگ .... تم اپنی اوقات بھول گئے؟ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ اس دو ٹکے کے مزدور کے ہاتھ میں دے دوں گا؟ تمہاری جیب میں چار پیسے کیا آ گئے کہ تمہاری آنکھوں پر چربی چڑھ گئی۔ ارے کیا

اندھیر مچایا ہے تم نے؟ کیا بالکل ہی پاگل ہو گئے ہو؟" ماسٹر صاحب کو اپنے جذبات کے اظہار کے لئے صحیح الفاظ بھی نہیں مل پا رہے تھے۔ شدید غم و غصے نے ان کی حالت خراب کر دی تھی۔

"اس میں برا ماننے کی تو کوئی بات نہیں ہے ماسٹر صاحب!" سلطان کا نرخرہ تیزی سے اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ "میں نے خدا نہ کرے آپ کو کوئی گالی تو نہیں دے دی۔"

"اس سے بڑی گالی اور کیا دو گے سلطان میاں!" ماسٹر صاحب نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایک سڑک چلتے مزدور کے لئے تم میری بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے ہو؟"

"کرم دین سڑک چلتا مزدور نہیں ہے۔" سلطان نے اب اپنے آپ کو بڑی حد تک سنبھال لیا تھا اور وہ ماسٹر صاحب کو سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا لیکن اس طرح کہ انہیں مزید توہین و تذلیل کا احساس نہ ہو۔ "وہ ہمارا بیٹا ہے ماسٹر صاحب! میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہم نے اسے بیٹا بنا کر رکھا ہے۔ کئی ماسٹروں کی ملا کر جو ماہانہ تنخواہ ہوتی ہو گی' اس سے زیادہ کماتا ہے اور پھر .... بات یہ ہے ماسٹر صاحب کہ وہ دونوں .... میرا مطلب ہے .... کرمو اور تہمینہ .... دونوں کی خواہش بھی یہی ہے۔"

ماسٹر نبی بخش دھم سے کرسی پر دوبارہ بیٹھ گئے اور ان کے چہرے پر جیسے خاک اڑنے لگی۔ کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔ سلطان بھی خاموش بیٹھا رہا۔ فضا سخت کشیدہ ہو گئی تھی اور سلطان کو حبس کی سی کیفیت کا احساس ہو رہا تھا۔

"چلے جاؤ سلطان میاں!" آخر ماسٹر نبی بخش اپنی جگہ سے اٹھے۔ انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "مہربانی کر کے چلے جاؤ اور آخری بات کان کھول کر سنتے جاؤ۔ اپنے نوکر کو سنبھال کر رکھنا۔ اس کی زبان پر میری بیٹی کا نام کبھی نہ آئے۔"

"اچھا' اچھا ٹھیک ہے ماسٹر صاحب!" سلطان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "ہم بھی کوئی گرے پڑے نہیں ہیں۔ آپ تو اس طرح گرم ہو رہے ہیں جیسے کسی نے بارود میں چنگاری دکھا دی ہو۔" اور وہ تیزی سے ماسٹر صاحب کی بیٹھک سے باہر آ گیا۔

رابعہ اور کرمو' سلطان کے انتظار میں گھر میں موجود تھے۔ سلطان جیسے ہی گھر میں داخل ہوا اور کرمو نے اس کی شکل دیکھی تو اس کے ہاتھ پیروں میں ایک دم سے سنسنی سی دوڑنے لگی۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اور ٹانگیں جیسے اچانک کمزور ہو گئیں۔ چاچا کے چہرے پر سب کچھ لکھا ہوا تھا۔

سلطان گھر میں داخل ہوا تو کرمو جلدی سے باہر صحن میں چلا گیا۔ وہاں کھڑکی میں

سے ان دونوں کی گفتگو بآسانی سن سکتا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس آ گیا۔

"کیا ہوا؟" رابعہ نے ناامیدی کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ گو کہ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سلطان کی شکل ہی ایسی ہو رہی تھی جیسے وہ کہیں سے درجن بھر جوتے کھا کر آ رہا ہو۔

"کیا ہوا؟ ہوا میرا سر۔" سلطان نے سخت غصے کے عالم میں کہا۔ "منع کر رہا تھا میں کہ مجھے وہاں مت بھیجو۔ مگر تم دونوں کے دماغ میں تو جیسے الو نے انڈے دے دیئے تھے۔ ذلیل کروانا تھا سو جی بھر کے ذلیل کروا لیا۔ ماسٹر صاحب کا بس نہیں تھا کہ مجھے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیں۔ صاف انکار کر دیا جو بے عزتی کی سو الگ۔"

"اے خاک ڈالو۔" رابعہ نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "ہم کون سے ایسے گرے پڑے ہیں۔ نہیں کرتے تو نہ کریں۔ مگر انہیں ہماری بے عزتی کرنے کا کیا حق ہے؟ ویسے انہوں نے کہا کیا تم سے؟" رابعہ کا تجسس اس کے غصے کے باوجود برقرار تھا۔

"کہنا کیا خاک تھا؟" سلطان نے جھلا کر کہا اور پھر اپنی بیوی کو اس گفتگو سے آگاہ کر دیا۔ کرمو کھڑکی کے پاس صحن میں کھڑا ہوا' یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔

"اب اچھی طرح سمجھا دینا اس الو کے پٹھے کو۔" سلطان نے بہت گرم ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر کبھی ماسٹر کے گھر کا رخ بھی کیا تو ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا سالے کی۔ اس قدر تو ذلت کروا دی۔ اب اور کیا کسر رہ گئی ہے؟"

"کرمو کے لئے لڑکیوں کی کون سی کمی ہے؟" رابعہ نے چمک کر کہا۔ "ان کی تہمینہ میں کون سے لعل لگے ہوئے ہیں؟ وہ نکڑ والے ارشاد علی خاں' جن کی دکان ہے برنس روڈ پر' ان کی بیٹی بھی تو اس سال میٹرک کا امتحان دے رہی ہے۔ کسی طرح بھی تہمینہ سے کم خوبصورت نہیں اور ان کی بیوی کئی بار مجھ سے اشارے کنایوں میں کرمو کے لئے بات کر چکی ہیں۔"

"اچھا' اب خدا کے لئے اس قصے کو ختم کر دو۔" سلطان نے کہا۔ "کوئی جلدی نہیں پڑی ہے۔ ہو جائے گی شادی جب وقت آئے گا۔"

کرمو وہیں آنگن میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ سلطان بک جھک کر خاموش ہو گیا تھا اور پھر وہ کہیں باہر چلا گیا۔ رابعہ باورچی خانے میں چلی گئی۔ اسے معلوم تھا کہ کرمو نے سب کچھ سن لیا ہے اور اب اس سے کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔

آنگن میں سناٹا تھا .... بہت گہرا' بہت پراسرار سناٹا اور یہ سناٹا کرمو کی روح کی

گہرائیوں میں اتر رہا تھا' اس کے دل کو ہولے ہولے مسل رہا تھا۔ وہ صدمے کے بوجھ تلے دبا ہوا چارپائی پر خاموش بیٹھا تھا۔

کرمو کی زندگی کا پہلا صدمہ وہ تھا جب اس کا باپ مرا تھا۔ پھر دوسرا صدمہ اسے تب پہنچا جب اسے معلوم ہوا کہ اس کی سوتیلی ماں اور ماموں اسے ہلاک کر دینا چاہتے ہیں لیکن یہ دونوں صدمے اس صدمے کے مقابلے میں بہت چھوٹے تھے جو کرمو کو آج پہنچا تھا۔ آج اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور گھر کے باہر چلا گیا۔ سارا شہر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ ساری دنیا سوگواری میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر شے نے ایک ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ وہ ماسٹر صاحب کے گھر کے سامنے سے گزرا جس کا دروازہ بند تھا۔ کلیجے میں ایک ہوک اٹھی اور وہ وہاں سے آگے بڑھ گیا۔

اس رات کرمو نے خاموشی سے آنسوؤں کے بہت سے خزانے لٹا دیئے اور وہ سب اس کے بستر میں جذب ہو کر خشک ہو گئے۔ صبح کو وہ جلدی اٹھا اور گلی کے نکڑ پر پہنچ گیا۔ وہ تہمینہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ مگر تہمینہ اپنے مقررہ وقت پر نہیں آئی۔ کرمو اس کا بہت دیر تک انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی۔ شاید اسے گھر سے نکلنے سے روک دیا گیا تھا۔ کرمو بوجھل قدموں سے وہاں سے چل پڑا۔

اور اس کے بعد کرمو اور تہمینہ کی ملاقات نہ ہو سکی۔ اگلے چند دن بعد اسکول بند ہو گیا۔ کیونکہ اب امتحانات ہونے والے تھے اور تہمینہ کا باہر نکلنا بالکل ہی موقوف ہو چکا تھا۔ کرمو ہزار کوشش کے باوجود اس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکا۔

اس گہرے صدمے نے نوجوان کرمو کو بالکل نڈھال کر کے رکھ دیا۔ اسے اپنے اردگرد کی ہر چیز بے کیف' بے مایہ' مہمل اور معنویت سے خالی نظر آنے لگی۔ دنیا کا جتنا حسن تھا' کائنات کی جتنی خوشی تھی' زندگی میں جتنی جاذبیت اور نشاط آفرینی تھی' وہ صرف تہمینہ کی بدولت ہی تو تھی اور اب اس کے بغیر تو کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ ویسے تو ہر چیز جوں کی توں موجود تھی' کچھ بھی نہیں بدلا تھا لیکن پھر بھی سب کچھ بدل گیا تھا۔ آسمان کا وہ رنگ نہیں تھا فضا میں وہ مہک نہیں تھی۔

رابعہ نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اسے اپنے انداز میں نرمی اور شفقت کے ساتھ سمجھایا۔ "کیوں مرا جاتا ہے' کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں اس لونڈیا میں؟ ارے تیرے لئے لڑکیوں کی کوئی کمی ہے۔ تہمینہ سے ہزار درجہ بہتر لڑکیاں تجھے مل جائیں گی۔"

"ہاں چاچی!" اس نے کہنا چاہا مگر کہہ نہ سکا۔ "لڑکیاں تو بیشک ضرور موجود ہیں اور

تہمینہ سے بہتر بھی' مگر ان میں تہمینہ تو کوئی نہیں ہے نا! تہمینہ تو صرف ایک ہی ہے۔ دوسری تہمینہ کہاں ہو سکتی ہے؟"

"اس مجنوں کی اولاد کو سمجھاؤ کہ کام میں دل لگائے۔" سلطان نے اس رات غصے میں اپنی بیوی سے کہا۔ "یہ کام کرنے کا زمانہ ہے۔ کام بڑھتا جا رہا ہے اور وہ سالا پاگلوں کی طرح بیٹھا آسمان کو تکتا رہتا ہے۔ دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟ سارے کاروبار کو چوپٹ کر کے رکھ دے گا کیا؟ اگر فاقے کرنے پڑیں تو سارا عشق وشق رفو چکر ہو جائے گا صاحبزادے کا۔"

"ارے کچھ دنوں کی بات ہے۔" رابعہ نے کہا۔ "پہلا پہلا دھچکہ لگا ہے۔ آہستہ آہستہ خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

کرمو اس انتظار میں تھا کہ شاید اسے تہمینہ کی طرف سے کوئی پیغام ملے' کوئی اشارہ ملے' وہ کسی ذریعے سے اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دن گزرتے گئے۔ ہجر کی آگ میں تپتے ہوئے دن اور وہ تہمینہ کی صورت بھی نہیں دیکھ سکا۔

وہ ساجد کو اکثر دیکھتا۔ ماسٹر صاحب بھی نظر آتے اور آمنہ چچی بھی دکھائی دیتیں۔ ماسٹر صاحب نے ذلیل و حقیر قرار دے کر اسے دھتکار دیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ماسٹر صاحب سے' ساجد سے' آمنہ چچی سے' کسی سے نفرت نہ کر سکا۔ وہ ان لوگوں سے نفرت کیسے کر سکتا تھا؟ ان میں تو تہمینہ کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

رفتہ رفتہ اس کی شدید صدمے کی کیفیت میں ٹھہراؤ کا عمل شروع ہوا' جو انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اس نے کام میں بھی دلچسپی لینی شروع کر دی اور رنج والم کا وہ بھیانک طوفان جس نے اس کے وجود کو ریزہ ریزہ کر ڈالا تھا' اپنے کبھی نہ مٹنے والے باقیات کو چھوڑ کر گزر گیا۔ ریزہ ریزہ وجود آہستہ آہستہ مجتمع ہوتا گیا اور زندگی اپنا راستہ خود بخود بنانے لگی۔

اور پھر اگلے دو ماہ کے بعد اس نے یہ خبر سنی کہ ماسٹر نبی بخش اپنا مکان فروخت کر کے اس محلے سے جا رہے ہیں۔ انہوں نے کہیں اور رہنے کا بندوبست کر لیا ہے۔

اور پھر وہ لوگ چلے گئے۔ کرمو نے بہت چاہا کہ کسی طرح تہمینہ کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ لوگ چلے گئے۔ ان کا مکان چند دن تک خالی رہا اور پھر اس میں ایک دوسرا خاندان آ کر آباد ہو گیا۔

کرمو نے اپنی یورش صدمات کو سمیٹ کر اپنے دل کے نہاں خانے میں سب سے زیادہ قیمتی سرمائے کی طرح محفوظ کر لیا اور وہ اپنے کاموں میں لگ گیا۔ تہمینہ کے ساتھ ملاقاتوں کا عرصہ بہت مختصر تھا۔ یہ مدت ایک سال بھی نہیں تھی لیکن یہی وہ ساعتیں تھیں جنہیں کرمو نے اپنی زخمی روح کے پردوں میں چھپا لیا تھا۔ تہمینہ نہیں تھی تو کیا ہوا یہ دولت بھی تو کچھ کم نہیں تھی کہ انہوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ اس چاہت کے سہارے تو پوری زندگی کاٹی جا سکتی تھی۔

☆======☆======☆

ان واقعات کے کوئی چھ ماہ بعد ہی سلطان ایک رات جب گھر واپس آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ کرمو بھی اس وقت گھر پر موجود تھا۔ سلطان نے اپنی بیوی اور کرمو کو یہ خوشخبری سنائی کہ اسے سعودی عرب میں کام مل رہا ہے۔

"جدہ جانا ہو گا۔" اس نے بتایا۔ "کنسٹرکشن کا بہت بڑا کام ہے' کئی سال کا' جس میں پلمبروں کی بھی ضرورت ہے اور مجھے پلمبنگ کا سارا کام مل رہا ہے۔ کچھ دوسرے لوگ بھی ہوں گے میں کرمو کو ساتھ لے کر جاؤں گا اور پھر اپنی نگرانی میں پلمبنگ کا کام کراؤں گا۔ اتنے پیسے ملیں گے' اتنے پیسے ملیں گے کہ تم سمیٹ نہیں پاؤ گی رابعہ بیگم!"

سلطان بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا۔ "ایک سال میں اتنی کمائی ہو جائے گی کہ یہاں کراچی میں تو پندرہ سال میں بھی نہیں ہو سکتی اور پھر.......... پھر ہم یہاں مسلم لیگ کوارٹرز میں نہیں رہیں گے۔ پھر تو ہم سوسائٹی میں بنگلہ بنوائیں گے۔"

اگلے چند ماہ تیاریوں میں گزر گئے۔ باہر جانے کے لئے بڑے جھمیلے کرنے پڑتے تھے اور کرمو کو تو ان ساری چیزوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ خود سلطان کو بھی زیادہ معلومات نہیں تھیں اور وہ کوئی پڑھا لکھا آدمی بھی نہیں تھا لیکن اس کے سرپرست خواجہ صاحب نے اس کی کافی مدد کی جو اس سے پانچ ہزار روپے کی رقم یہ کہہ کر پہلے ہی وصول کر چکے تھے کہ اوپر والوں کو بھی تو کچھ دینا دلانا ہوتا ہے۔

اور پھر روانگی کا وقت آ گیا۔ کرمو اپنی زندگی میں پہلی بار ہوائی جہاز میں بیٹھا۔ اسے کراچی آئے ہوئے کوئی چار سال کا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان چار برسوں میں تو سب کچھ بالکل ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ اس شہر میں اس نے ہوٹل کی معمولی بیرا گیری سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا اور اب وہ ایک ہنرمند کاریگر کی حیثیت سے بھاری معاوضے پر کام کرنے کے لئے ملک سے باہر جا رہا تھا۔

ملتان سے کراچی آنے کے فوراً بعد اسے کچھ دنوں تک جو اجنبیت کا احساس ہوتا رہا تھا' وہ بہت جلد ختم ہو گیا تھا۔ اس مہربان اور دردمند شہر نے باہر سے آنے والے لاکھوں لوگوں کی طرح کرمو کو بھی اپنے دامن شفقت میں پناہ دی تھی۔ یہ شہر بہت مہربان تھا۔ اس کا دل بہت بڑا' بہت وسیع تھا۔ کراچی کرمو کا وطن بن چکا تھا۔

لیکن اب جس جگہ کام کرنے کے لئے وہ پہنچا تھا وہاں اسے سب کچھ بالکل مختلف نظر آیا۔ جدہ ایئرپورٹ پر اترتے ہی اسے سب سے پہلا احساس یہ ہوا تھا کہ وہ تو گونگا ہے۔ انگریزی اسے برائے نام آتی تھی اور عربی سے وہ بالکل نابلد تھا۔ اس کے اور سلطان کے ساتھ چند آدمی اور بھی تھے جنہیں خواجہ صاحب نے کراچی سے بھیجا تھا اور ان سب لوگوں کو لینے کے لئے کمپنی کا ایک نمائندہ ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ اس کا نام ماتھر تھا اور وہ ہندوستانی تھا۔ وہ واحد آدمی تھا جس سے کرمو بات کر سکتا تھا۔

اور پھر ایک دور دراز کے غیر معروف علاقے میں کام کا آغاز ہو گیا۔ ایک بہت بڑی عمارت تھی جس کی تعمیر ہو رہی تھی۔ کرمو نے کبھی اتنی بڑی عمارت میں کام نہیں کیا تھا۔ سلطان کے ساتھ وہ زیادہ تر چھوٹے بڑے اور درمیانہ درجے کے مکانوں میں کام کرتا رہا تھا لیکن یہ بلڈنگ تو ہزارہا مربع گز پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی لمبائی تو اس پوری گلی سے بھی زیادہ تھی جس میں کرمو رہتا تھا۔

تپتی ہوئی دھوپ میں' کھلے آسمان کے نیچے کام کرتے کرتے کرمو کا رنگ سیاہ ہو گیا۔ جھلسا دینے والی گرمی نے اس کو جھلس کر رکھ دیا اور موسم کی نامہربانی سے زیادہ ماحول کی نامہربانی اس کو نڈھال کر رہی تھی۔ یہاں ہر ہر قدم پر اسے اپنی تحقیر و توہین کا احساس ہوتا تھا۔ غریب غیر مقامیوں کی یہاں کوئی اوقات نہیں تھی۔

تین سال کا عرصہ پلک جھپکتے گزر گیا۔ اس دوران سلطان ایک بار کراچی گیا اور اپنی بیوی اور دوسرے رشتہ داروں سے مل کر آیا۔ کراچی میں قیام کے دوران طارق روڈ پر اس نے ایک رہائشی پلاٹ بھی خرید لیا۔ رابعہ کے ساتھ اس کے بھائی اور بھاوج رہ رہے تھے۔ سلطان ہر ماہ اپنے گھر رقم بھیجتا تھا اور رابعہ اس رقم کو جمع کر رہی تھی۔ بہت رقم جمع ہو چکی تھی۔ سلطان وہاں سپروائزر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس کا معاوضہ کرمو سے زیادہ تھا لیکن کرمو کا معاوضہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ اس تین سال کی مدت میں اس کے پاس ڈھیروں رقم جمع ہو گئی تھی۔

"میں سوچتا ہوں چاچا کہ کچھ پیسے چاچی کو بھیج دوں۔" ایک رات اس نے سلطان

سے کہا۔

"کیوں؟" سلطان نے کہا۔ "تمہاری چاچی کیا کرے گی تمہارے پیسوں کا؟ اس کے پاس جمع کرانا چاہتے ہو کیا؟"

"نہیں، جمع کرانے کے لئے نہیں۔ خرچ کرنے کے لئے۔" کرمو نے کہا۔

"نہیں کرمو!" سلطان نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہاری چاچی کو تمہارے پیسوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آخر میرے پیسے کس کے کام آئیں گے؟ تم سے زیادہ کما رہا ہوں۔ ہم دونوں میاں بیوی کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ ہے۔ بس ایک مکان کا معاملہ ہے۔ اب انشاء اللہ وہ بھی ہو جائے گا۔ زمین تو میں نے خرید لی ہے۔ رحمت اللہ ٹھیکیدار سے بات بھی کر کے آیا تھا۔ نقشے وغیرہ کے بارے میں مَیں نے اسے سمجھا دیا ہے۔ وہ نقشہ بنوا کر تمہاری چاچی کو دکھا دے گا اور پھر مجھے اس کی کاپی بھیج دے گا۔ پھر وہ نقشہ منظور بھی کروا لے گا۔ اس سارے کام میں کوئی سال بھر تو لگ ہی جائے گا۔ اس کے بعد میں جب کراچی جاؤں گا تو آر سی سی کا کام اپنے سامنے جتنا زیادہ سے زیادہ ہو سکے گا کروا دوں گا۔ باقی کام بھی چلتا رہے گا۔ تمہاری چاچی رحمت اللہ کے سر پر سوار ہو کر اس سے کام کرواتی رہے گی۔ اسے خود بھی تو نیا گھر بنوانے کا بہت شوق ہے .... اب خدا نے چاہا تو گھر بھی بن جائے گا۔ چند سال بعد تو مجھے کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ کراچی واپس جا کر سینیٹری کے سامان کی ایک دکان کھول لوں گا۔ بس کافی ہے۔"

"مکان بنانے کے لئے کافی پیسہ چاہئے ہو گا چاچا!" کرمو نے آہستہ سے کہا۔ "کچھ مجھ سے بھی لے لو۔"

"ابے کیا پاگل ہو گیا ہے سالے!" سلطان نے آنکھیں نکال کر کہا۔ "بہت کھکھا شاہ بن گیا ہے؟ ابے کیوں لے لوں میں تیرے پیسے؟ میرا قرضہ ہے تیرے اوپر؟ سن بھائی تیرے سامنے تو پوری زندگی پڑی ہے۔ ہم تو اپنی عمر گزار چکے ہیں۔ اولاد ہمارے کوئی ہے نہیں، بس بہت کما لیا۔ اب کیا کریں گے اور زیادہ کما کر؟ بس مکان جیسے تیسے بن جائے گا اور پھر ابھی تو کام چل رہا ہے۔ کنٹریکٹ میں مزید تین سال کی توسیع ہو گئی ہے اور پیسہ آ جائے گا۔ تُو اپنے پیسے سنبھال کر رکھ۔ تجھے تو ابھی شادی کرنی ہے۔ گھر بسانا ہے۔ اپنے بچوں کے بارے میں سوچ اور یہ جو قدرت کی طرف سے موقع ملا ہے، اسے غنیمت سمجھ یہ تو آندھی کے آم ہیں میرے بھیا۔ بس جتنے بٹور سکتا ہے، بٹور لے۔ کون جانے کب سالے کان پکڑ کر نکال دیئے جائیں۔ ذرا ذرا سی بھول پر آدمی کو لات مار کر باہر کر دیتے

ہیں۔ پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وقت گزار لے زیادہ سے زیادہ کام کر لے۔ کراچی واپس جا کر کوئی بڑا دھندا کرنا۔ جیب میں پیسہ ہو تو آدمی سو دھندے کر سکتا ہے۔"

پانچ سال کے بعد کرمو کراچی گیا تو وہ ایک بہت امیر آدمی تھا۔ سعودی عرب میں اس کی ملازمت جاری تھی اور فی الحال اس کے ختم ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کئی نئی بلڈنگیں بن رہی تھیں اور کمپنی نے کرمو کی ملازمت کو بحال رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ کرمو جیسے ہوشیار، قابل اعتماد اور ہنرمند کاریگر کی ضرورت تھی۔ کراچی میں سلطان کا نیا مکان بن چکا تھا اور وہ لوگ اب نئے مکان میں رہ رہے تھے۔

کرمو اور سلطان ساتھ ساتھ کراچی گئے تھے۔ کرمو تین ماہ کی چھٹی لے کر آیا تھا اور اپنے ساتھ بہت بڑی رقم بھی لایا تھا۔ وہاں اس کے اخراجات بہت کم تھے۔ زیادہ تر سہولتیں تو کمپنی کی طرف سے حاصل تھیں۔ کرمو کا کوئی گھر نہیں تھا جہاں اسے رقم بھیجنی پڑتی۔ وہ تو صرف رقم جمع کرتا رہا تھا اور پانچ سال کی مدت کے دوران اس کے پاس بہت پیسہ جمع ہو گیا تھا۔ اتنا پیسہ کرمو نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا شمار اب بلاشبہ بہت امیر آدمیوں میں ہوتا تھا اور آئندہ اس کی مالی حیثیت میں اضافے کی ہی امید تھی۔

"اے ہے، تُو تو اتنا بڑا ڈھو کا ڈھو ہو گیا!" رابعہ نے اس کو پانچ سال کے بعد دیکھ کر حیرت آمیز مسرت کے ساتھ کہا۔ "اور کالا کس قدر ہو گیا ہے تُو؟ تیرا رنگ تو بڑا صاف ستھرا ہوا کرتا تھا۔"

"سارا سارا دن تپتی ہوئی دھوپ میں کام کرنا ہوتا ہے چاچی!" اس نے ہنس کر کہا۔ "اور پھر وہاں کی گرمی، تم تو سوچ بھی نہیں سکتیں۔ آدمی جہاں کھڑا ہوتا ہے وہاں کی زمین اس کے پسینے سے گیلی ہو جاتی ہے۔"

"ہاں بھیا، پیسہ آسانی سے تو نہیں مل جاتا۔" رابعہ نے ایک لمبی سانس بھر کر کہا۔ "خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر دو پیسے ہاتھ میں آتے ہیں۔"

"اور اب میں تیری شادی کر رہی ہوں۔" رابعہ نے اعلان کیا۔ "لڑکی میں نے دیکھ لی ہے، پسند کر لی ہے۔ وہ لوگ بھی بالکل راضی ہیں۔ بس ہماری طرف سے پیغام دینے کی دیر ہے۔ ان کی تیاریاں بھی پوری ہیں۔"

"مگر چاچی .... میں شادی کر کے کیا کروں گا؟" کرمو نے ایک اداس مسکراہٹ

کے ساتھ کہا۔ ”میں تو بس ایسے ہی ٹھیک ہوں‘ گزر رہی ہے۔“

”اے تو کیا زندگی بھر لنڈورا گھومتا پھرے گا؟“ چاچی نے اسے جھڑکتے ہوئے کہا۔ ”شادی نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟ گھر کیسے آباد ہو گا؟ آخر تجھے گھر بسانا ہے یا نہیں؟“

”یہ گھر ہے تو چاچی!“ کرمو نے کہا۔ ”کیا یہ میرا گھر نہیں؟“

”وہ تو ٹھیک ہے بیٹے!“ چاچی نے بڑی نرمی اور محبت کے ساتھ کہا۔ ”بیشک یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ تم ہمارے اپنے ہو اور ہم لوگ بھی تمہارے ہیں۔ مگر بیٹا! زندگی کی کچھ ضرورتیں ہوتی ہیں۔ ہر آدمی کو اپنا گھر بسانا پڑتا ہے اور گھر کی روشنی عورت ہوتی ہے۔ عورت ہی کے دم سے تو گھر میں اجالا ہوتا ہے۔ تم یہیں رہو گے اسی گھر میں رہو گے مگر اپنی بیوی کے ساتھ۔“

اس رات تنہائی میں کرمو نے رابعہ سے تہمینہ کے بارے میں پوچھا۔ پانچ سال کی مدت میں پہلی بار اس کی زبان پر وہ نام آیا جو اس کے دل سے ایک لمحے کے لئے بھی جدا نہیں ہوا تھا۔ تہمینہ پل بھر کو بھی اس کے ساتھ نہیں رہی تھی لیکن وہ کبھی اس سے الگ بھی نہیں ہوئی تھی۔

”زیادہ تو معلوم نہیں بھیا!“ رابعہ نے اسے بتایا۔ ”وہ لوگ عزیز آباد میں جا کر رہنے لگے تھے۔ میری تو پھر ان میں سے کسی سے ملاقات ہوئی نہیں۔ البتہ ارشاد علی کی بیوی صفیہ نے مجھے کچھ دنوں پہلے بتایا تھا کہ تہمینہ کی شادی ہو گئی ہے............“

”کس کے ساتھ؟“ کرمو نے آہستہ سے پوچھا۔

”کوئی اسکول ماسٹر ہے‘ یا شاید ہیڈ ماسٹر ہے۔ اے ہو گا‘ تمہیں کیا؟ خاک ڈالو۔ میں نے تو تمہارے لئے ارشاد علی کی بیٹی صالحہ کو کب سے روک رکھا ہے۔ صالحہ نے اس سال بی اے کیا ہے اور وہ اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی ہے۔ بس تم ہاں کرو اور میں بات پکی کر دوں۔ اب تم پانچ سال کے بعد آئے ہو۔ پھر خدا جانے کب آؤ گے۔ اب میں تمہیں شادی کئے بغیر نہیں جانے دوں گی۔“

”جیسا تمہارا جی چاہے چاچی!“ کرمو نے آہستہ سے جواب دیا اور وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے اس معاملے کے بارے میں زیادہ سوچا ہی نہیں تھا۔ صالحہ کو شاید اس نے کبھی دیکھا ہو لیکن وہ اس کے ذہن میں بالکل نہیں تھی۔ صالحہ ہو یا کوئی اور اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر تہمینہ نہیں تھی تو پھر کچھ بھی نہیں تھا۔

”اگر تہمینہ کی شادی کسی اور سے ہو گئی اور میری شادی کسی اور سے ہو رہی ہے تو ہونے دو!“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ”تہمینہ کو مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔ وہ پہلے بھی میرے ساتھ تھی اور آج بھی میرے ساتھ ہے۔ وہ چاہے کہیں بھی رہے کسی بھی حال میں رہے مجھ سے الگ تو نہیں ہو سکتی۔“

اور پھر اس نے اس اسکول ماسٹر یا ہیڈ ماسٹر کے بارے میں سوچا جس کے ساتھ تہمینہ کی شادی ہو گئی تھی۔ کیا وہ شخص کبھی بھی یہ بات جان سکے گا کہ تہمینہ کیا چیز ہے؟ کیا وہ کبھی یہ سوچ سکے گا کہ اس دنیا میں بس ایک ہی لڑکی تھی تہمینہ اور وہ اس کے حصے میں آ گئی۔

کرمو کی رضامندی پاتے ہی رابعہ نے ارشاد حسین کی بیٹی صالحہ کے ساتھ کرمو کی بات پکی کر دی۔ سارے معاملات جلد از جلد طے پا گئے اور ایک ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ اس کے دو ماہ بعد کرمو کو واپس چلا جانا تھا۔

”تجھ سے اگر کوئی بھی پوچھے کہ تُو سعودی عرب میں کیا کرتا ہے‘ تو تُو یہ کہنا کہ میں پلمبنگ سپروائزر ہوں۔“ سلطان نے اس سے کہا۔ ”کسی سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تُو خالی پلمبر ہے۔ لوگ پلمبر کے نام سے تو ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن سالے پلمبنگ سپروائزر کا نام سن کر رعب میں آ جاتے ہیں۔ اب کوئی سالا وہاں دیکھنے تو نہیں آ رہا ہے کہ تُو کیا کام کر رہا ہے اور کس طرح کر رہا ہے۔ ویسے میں تجھے بتاؤں‘ اگلے سال تک تُو ضرور پلمبنگ سپروائزر ہو جائے گا۔ ماتھر صاحب تیرے کام سے بہت زیادہ خوش ہیں۔“

اور پھر یہ شادی بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہو گئی۔ ”دولہا کیا کرتا ہے؟“ ”سعودی عرب میں ہے۔“ ”اچھا پھر تو بہت پیسے کماتا ہو گا۔ لڑکی کے تو عیش ہو گئے۔“ ”دولہا کی کوالیفکیشن کیا ہے؟“ ”ٹیکنیکل آدمی ہے۔ ٹیکنیکل کوالیفکیشن ہے۔“ ”ہاں بھئی‘ اب تو زمانہ ہی ٹیکنیکل لوگوں کا ہے۔ ایم اے‘ بی اے کو کون پوچھتا ہے؟ اجی کلرکی بھی نہیں ملتی۔“ ”پیسہ کمانا ہے تو آدمی ملک سے باہر جائے۔ یہاں کیا رکھا ہے؟“ ایسی بہت سی باتیں کہی اور سنی گئیں۔

رابعہ اور سلطان اس شادی سے بہت خوش تھے اور خاص طور پر رابعہ تو جیسے خوشی کے مارے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ اس کا اپنا تو کوئی بیٹا تھا نہ بیٹی۔ کرمو اس کے لئے اولاد کی طرح تھا اور کرمو کی شادی پر اس نے دل بھر کر اپنے ارمان پورے کر لئے تھے۔ شاید وہ اپنے سگے بیٹے کی شادی بھی کرتی تو اتنی ہی دھوم دھام سے کرتی۔ وہ صالحہ کو اپنے ہی گھر

میں بیاہ کرلائی تھی۔ یہی تو کرمو کا بھی گھر تھا اور پھر اتنے بڑے گھر میں گنجائش بھی بہت تھی۔

کرمو نے، جب شادی کی پہلی رات صالحہ کو دیکھا تو وہ اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ تہمینہ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ اس کا رنگ تہمینہ سے زیادہ صاف تھا۔ اس کی آنکھیں تہمینہ کی آنکھوں سے زیادہ بڑی اور سیاہ تھیں۔ اس کے بال بہت گھنے اور لمبے تھے۔

مگر وہ تہمینہ نہیں تھی۔ اس میں تہمینہ کی خوشبو نہیں تھی۔ وہ تو ایک اجنبی لڑکی تھی۔ جس کے لئے کرمو کے دل میں اپنائیت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔ احساس کی کوئی نرمی پیدا نہیں ہوئی۔ خوشی اور انبساط کی کوئی لہر اس کے وجود میں نہیں سرسرائی وہ بس ایک خوبصورت اور حسین لڑکی تھی جیسے اور بہت سی سینکڑوں لڑکیاں ہوا کرتی ہیں اور خاص بات صرف یہ تھی کہ اسے کرمو کی بیوی بنا دیا گیا تھا اور کرمو نے ایک معاشرتی ضرورت کے تحت اسے قبول کرلیا تھا۔

شادی کے ابتدائی چند دنوں کے دوران ہی کرمو کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ صالحہ کی آنکھوں میں اپنے لئے وہ نرمی، وہ چمک کبھی تلاش نہ کر سکے گا جو اسے تہمینہ کی آنکھوں میں اپنے لئے نظر آتی تھی۔ تہمینہ جب اس کی طرف دیکھتی تھی، اس سے بات کرتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے اس کے وجود کی ساری نرمی، اس کی روح کی ساری گرمی اور احساس کی ساری نزاکت اس کی آنکھوں میں سمٹ آئی ہے۔ وہ جب چپ ہوتی تھی تو اس وقت بھی اس کی آنکھیں بولتی تھیں۔ مگر صالحہ کی آنکھیں تو اسے بالکل سپاٹ لگتی تھیں۔ ان میں تو اس کے لئے کچھ بھی نہیں تھا، کوئی جذبہ نہیں تھا، کوئی نرمی نہیں تھی۔ یہ تو بس ایسی ہی تھیں جیسے کسی اجنبی کی آنکھیں۔

شادی کے دس پندرہ دن کے بعد ہی صالحہ نے کرمو سے اس کے بارے میں تفتیش شروع کر دی۔ اس نے سب سے پہلے تو اس سے اس کی آمدنی کے بارے میں پوچھا اور کرمو نے اسے سب کچھ صاف صاف بتا دیا لیکن اسے لگا کہ صالحہ اس کی اس بات سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئی حالانکہ وہ ان خوش نصیب لڑکیوں میں سے تھی جنہیں اس قدر کمانے والا شوہر ملا تھا۔

"میری کالج کی ایک دوست ہے صابرہ۔" اس نے کرمو سے کہا۔ "اس کا میاں بھی سعودی عرب میں ہے، وہ ریاض میں ہے۔ انجینئر ہے۔ بڑی بھاری تنخواہ پاتا ہے۔ تمہاری

تنخواہ سے کوئی ڈھائی تین گنا زیادہ تو ہو گی ہی۔"

"ہاں، ظاہر ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہئے؟" کرمو نے قدرے خفت کے ساتھ کہا۔ "وہ انجینئر ہے اور انجینئروں کی تنخواہیں تو زیادہ ہوتی ہیں لیکن ہر انجینئر کو تو سعودی عرب جا کر کمانے کا موقع نہیں ملتا۔"

"کیا مطلب؟" صالحہ نے چونک کر پوچھا اور کرمو کو تعجب ہوا کہ اس سادی سی بات پر صالحہ کو چونکنے کی کیا ضرورت تھی۔

"میرا مطلب یہ ہے کہ وہی انجینئر زیادہ کما سکتا ہے جسے باہر جانے کا موقع ملتا ہے اور یہ موقع ہر ایک کو نہیں مل پاتا۔ آج کل پاکستان میں دیکھو کتنے انجینئر بے چارے بے روزگار گھومتے پھر رہے ہیں۔"

"مگر پلمبر کوئی بے روزگار نہیں گھومتا۔" صالحہ نے ایک خاص انداز سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں، بشرطیکہ وہ اچھا پلمبر ہو، کام جانتا ہو اور ٹھیک سے کام کرے۔" کرمو نے سادہ دلی کے ساتھ کہا۔

"اگر تم کچھ پڑھے لکھے ہوتے اور پلمبر کے بجائے انجینئر ہوتے تو اس سے کہیں زیادہ پیسے کما سکتے تھے جتنے کہ اب کما رہے ہو۔" صالحہ نے کہا۔ "باہر رہ کر آدمی اگر بہت سے پیسے نہ کما سکے تو پھر باہر رہنے کا فائدہ ہی کیا؟"

"میں کوئی کم پیسے تو نہیں کما رہا ہوں۔" کرمو نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "بہت کما رہا ہوں بھئی اور اس سے زیادہ بھی کما سکتا ہوں۔ اس کے لئے انجینئر ہونے کی شرط نہیں ہے۔ اس کے لئے اوور ٹائم کرنے کی ضرورت ہے اور وہ میں نہیں کرتا ہوں کیونکہ مجھے اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"پیسہ جتنا بھی ہو کبھی زیادہ نہیں ہوتا۔" صالحہ نے آہستہ سے کہا۔ "آدمی کو کبھی یہ نہیں سوچنا چاہئے کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہو گیا ہے۔ جب خرچ کرنے پر آؤ تب پتہ چلتا ہے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

صالحہ کی بات سن کر کرمو خاموش ہو گیا۔ اسے یہ بات کچھ پسند نہیں آئی تھی اور پھر اس کے چند ہی روز بعد صالحہ نے اس سے مکان کی بات چھیڑ دی۔ کرمو اس کی بات سن کر کچھ بھونچکا سا رہ گیا۔

"مکان؟ مگر مکان ہے تو ہم رہ رہے ہیں اس مکان میں۔" اس نے کہا۔

"یہ تمہارا ہے؟" صالحہ نے قدرے کڑوے لہجے میں کہا۔ "تمہارا تو نہیں ہے۔ سلطان چچا کا ہے۔ کیا میں عمر بھر دوسروں کے مکان میں بیٹھی رہوں گی؟ آخر ہمیں علیحدہ مکان کی ضرورت نہیں ہے کیا؟"

کرمو کو محسوس ہوا کہ واقعی صالحہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس نے تو اب تک اس بارے میں کچھ سوچا ہی نہیں تھا۔ دراصل وہ چاچا اور چاچی کے ساتھ اس قدر شدت سے وابستہ رہا تھا کہ اپنے آپ کو ان سے الگ تصور ہی نہیں کرتا تھا۔ ان کی ہر چیز کو وہ غیر محسوس طور پر اپنا سمجھتا تھا اور یہ گھر بھی اسے جیسے اپنا ہی گھر لگتا تھا لیکن یہ واقعی اس کا اپنا گھر نہیں تھا۔

"ہاں یہ بات تو ہے۔" کرمو نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "مکان تو چاچا اور چاچی کا ہے۔ ہمیں اپنے لئے ایک الگ گھر چاہئے۔ چند سال کے بعد میں واپس کراچی آؤں گا۔ تب ہمیں ایک الگ ٹھکانہ چاہئے ہو گا۔"

"ایک ایسا ہی گھر بنوا لو جیسا کہ یہ ہے۔" صالحہ نے بڑی آسانی سے کہہ دیا۔

"ایسا گھر۔" کرمو نے قدرے حیرت سے کہا۔ "نہیں صالحہ میں ایسا گھر نہیں بنوا سکتا۔ اتنا پیسہ نہیں ہے میرے پاس۔ میں تو کوئی چھوٹا سا مکان بنوا سکتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟ آخر تم بھی پلمبر ہو' سلطان چاچا بھی پلمبر ہیں۔" صالحہ نے کہا۔ "تو کون سے انجینئر لگے ہوئے ہیں جو تم ہو وہی وہ ہیں۔ پھر کیوں نہیں بنوا سکتے تم ایسا گھر۔"

"ارے بھئی چاچا تو سپروائزر ہیں۔" کرمو نے کہا۔ "اور میں .... میں بس ایک کاریگر۔ میری اور ان کی تنخواہوں میں بہت فرق ہے۔ میں ان کا مقابلہ کس طرح کر سکتا ہوں؟"

"ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ اگر اوور ٹائم کرو تو زیادہ کما سکتے ہو۔" صالحہ نے کہا۔ "تو تم اوور ٹائم کیوں نہیں کرتے آخر وہاں پردیس میں تمہارے پاس کرنے کے لئے اور ہے ہی کیا؟ جتنا زیادہ کام کرو گے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"لیکن اوور ٹائم بھی کتنا کر سکتا ہوں؟" کرمو نے کہا۔ "اس کے بھی کچھ قاعدے قوانین ہوتے ہیں۔ ایسا گھر بنوانے کے لئے تو کافی پیسہ چاہئے۔ اس کے لئے تو پھر انتظار کرنا پڑے گا۔"

"تو کون سے ہمیں درجن بھر گھر بنوانے ہیں؟" صالحہ نے کہا۔ "بس ایک ہی بن جائے لیکن ڈھنگ کا' ایسا کہ جو دیکھے وہ تعریف کرے۔ ہم انتظار کریں گے۔ تم ایسا کرو فی

الحال زمین خریدنے کا بندوبست کرو۔ زمین ہو جائے تو پھر مکان بھی بن جائے گا۔"

کرمو کو یہ خیال پسند آیا اور اس نے صالحہ کے ساتھ مل کر پلاٹ ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ سلطان کو بھی اس کی اس بات سے اتفاق تھا کہ کوئی پلاٹ لے کر ڈال دیا جائے اور وہ خود بھی پلاٹ کی تلاش میں ان لوگوں کی مدد کر رہا تھا۔ رابعہ نے تو فوراً ہی کرمو سے یہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ "دیکھا اس کو کہتے ہیں گھر والی۔ اس کو کہتے ہیں سگھڑ بیوی۔ اس نے تو آتے ہی کل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔"

اور جہاں تک کرمو کا تعلق تھا تو وہ یہ سب کچھ ایک مشینی انداز میں کر رہا تھا۔ چونکہ اب اس نے شادی کر لی تھی۔ صالحہ اس کی بیوی بن کر اس کے پاس آ گئی تھی اس لئے اب اسے وہ ساری سماجی ذمہ داریاں پوری کرنی تھیں جو ایک کماؤ شوہر کی حیثیت سے اسے پوری کرنی چاہئے تھیں۔ اس نے اب سارے معاملات کو صالحہ کی صوابدید پر چھوڑ دیا تھا۔

صالحہ نے جو پلاٹ پسند کیا وہ ایک ہزار گز کا تھا اور فیڈرل بی ایریا میں واقع تھا۔ کرمو نے وہ پلاٹ خرید تو لیا لیکن پھر اس کے پاس کچھ زیادہ رقم نہیں بچ سکی۔ بہت سارا پیسہ تو شادی میں خرچ ہو گیا تھا۔ پھر وہ صالحہ کو بھی خالی ہاتھ چھوڑ کر تو یہاں سے نہیں جا سکتا تھا۔ گو کہ چاچی کے گھر میں وہ بالکل آرام سے رہ سکتی تھی لیکن اب وہ کرمو کی بیوی تھی اس کی سماجی اور اخلاقی ذمہ داری تھی۔ وہ اسے دوسروں کے سر تھوپ کر نہیں جا سکتا تھا۔

جو رقم اب باقی بچی تھی وہ مکان بنوانے کے لئے ناکافی تھی۔ اس کے لئے تو بہت پیسہ چاہئے تھا۔ کرمو نے خاموشی سے اپنا جلد واپس آنے کا ارادہ ترک کر دیا اور سعودی عرب چلا گیا۔

اس کے بعد اس نے زیادہ رقم کمانے کی غرض سے اوور ٹائم کرنا شروع کر دیا۔ ایک دو گھنٹے مزید کام کر لینے سے کچھ زیادہ آمدنی ہو جاتی تھی اور اوور ٹائم کے مواقع بھی تھے۔ وہ تھوڑے سے پیسے اپنے پاس رکھ کر باقی ڈرافٹ صالحہ کو بھیج دیتا تھا۔ صالحہ وہاں کراچی میں پیسہ جمع کر رہی تھی۔

لیکن صالحہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں تھی۔ اس نے کرمو کو لکھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تعمیر بھی مہنگی ہوتی جا رہی ہے اور وہ چاہتی ہے کہ مکان جلد از جلد بن جائے اس لئے کرمو کوشش کر کے زیادہ رقم کے ڈرافٹ بھیجے۔

کرمو نے اوور ٹائم کچھ اور زیادہ کر دیا۔ اسے امید تھی کہ اگلے سال اسے سپروائزر

بنا دیا جائے گا اور پھر اس کی تنخواہ بھی بڑھ جائے گی تب مکان بنانا اور زیادہ آسان ہو جائے گا۔

اگلے سال وہ کراچی نہیں آیا۔ اس نے آنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا لیکن صالحہ نے اسے خود ہی منع کر دیا۔ اس نے لکھا کہ اس کے آنے کی صورت میں مالی نقصان ہو گا اس لئے بہتر ہو گا کہ وہ اس سے اگلے سال آئے۔ کرمو نے اس کی بات مان لی۔ ویسے بھی صالحہ کی جدائی اس کے لئے کوئی المیہ نہیں تھی۔

وہ اسی طرح اسی ماحول میں، اسی فضا میں کام کرتا رہا۔ ایک مکمل اجنبی کی طرح جس کا اس سرزمین سے جہاں وہ کام کر رہا تھا، صرف ایک ہی رشتہ تھا۔ سولہ سولہ، اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک بیل کی طرح کام کرنے اور اس کے بدلے میں جھولی بھر نوٹ سمیٹ لینے کا رشتہ۔ اسے یہاں کام کرتے ہوئے سات سال گزر گئے تھے لیکن نہ تو وہ اس سرزمین کو اپنا سکا اور نہ اس سرزمین نے اسے اپنایا۔ اجنبیت کی جو خلیج روزِ اوّل سے حائل تھی وہ آج بھی اسی طرح حائل تھی۔

اگلے سال جب کرمو کراچی گیا تو سلطان بھی اس کے ساتھ تھا۔ صالحہ زیادہ تر اپنے میکے میں ہی رہتی تھی لیکن سلطان کے گھر میں اس کا الگ کمرہ تھا اور وہ جب بھی چاہتی تھی یہاں آ کر رہ سکتی تھی۔ سلطان کا گھر اس کی سسرال تھا۔

مکان کا نقشہ منظور ہو چکا تھا۔ صالحہ نے دو منزلہ مکان کا نقشہ بنوایا تھا اور بنیادوں کی کھدائی بھی شروع کرا دی تھی۔ کرمو نے یہ سب کچھ دیکھا لیکن اس طرح جیسے وہ کسی اور کے معاملات کو دیکھ اور سن رہا ہو۔ وہ ہر ماہ زیادہ سے زیادہ رقم صالحہ کو بھیج دیتا تھا اور مطمئن تھا کہ اس طرح وہ اپنی سماجی، قانونی اور خاندانی ذمہ داری پوری طرح نبھاہ رہا ہے۔

اس سے اگلے سال صالحہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ کرمو کو جب اس کی خبر ملی تو قدرتی طور پر اسے بہت خوشی ہوئی۔ وہ ایک بیٹے کا باپ بن گیا تھا لیکن وہ اس سال کراچی نہیں جا سکا اور خواہش کے باوجود اپنے بیٹے کی صورت نہیں دیکھ سکا۔ صالحہ نے لکھا تھا کہ فی الحال آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلاوجہ پیسہ ضائع ہو گا اور پیسوں کی ابھی سخت ضرورت ہے۔ مکان کی تعمیر شروع کرنی ہے۔

ایک ہزار گز پر بننے والے اس مکان کے لئے بہت پیسے کی ضرورت تھی۔ کرمو محنت کرتے کرتے ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ ایک پیسہ کمانے والی مشین میں تبدیل ہو گیا ہو۔ زندگی کا واحد مقصد یہ رہ گیا تھا کہ بس پیسہ کماتے جاؤ۔ کماتے

جاؤ۔ کماتے جاؤ۔

"خیر چلو ایک بار مکان پورا بن جائے تو صالحہ کی یہ خوشی بھی پوری ہو جائے گی۔" وہ سوچتا۔ "آخر وہ میری بیوی ہے۔ اس کی خواہشات کا احترام کرنا میرے لئے ضروری ہے اور ویسے بھی مکان تو ایک اہم خاندانی ضرورت ہے۔"

اس نے اپنے بیٹے عامر کو پہلی بار اس وقت دیکھا جب عامر کی عمر ایک سال کی تھی اس کے آنے پر عامر کی پہلی سالگرہ منائی گئی اور سالگرہ کی یہ تقریب کسی شادی کی تقریب سے کم نہ تھی۔ صالحہ نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ پانی کی طرح پیسہ بہایا تھا۔ کم از کم پانچ چھ سو مہمانوں کو مدعو کیا گیا تھا۔ کھانے میں مرغ بریانی، قورمہ، تافتان، کھیر اور متعدد دوسری چیزیں شامل تھیں۔ تقریب کا سارا اہتمام صالحہ نے اور اس کے گھر والوں نے کیا تھا۔ کرمو کی حیثیت تو بس ایک تماشائی کی سی تھی۔ بہت سے دوسرے مہمانوں کی طرح وہ بھی اس تقریب میں شریک تھا۔

کرمو کا پسینہ صحرائے عرب کی سنگلاخ اور تپتی ہوئی ریت میں جذب ہوتا رہا۔ اس کا جسم کڑی اور جان توڑ مشقت کے بوجھ تلے دب کر ہانپتا رہا اور کراچی میں صالحہ ساری دنیا کے عیش و آرام کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی۔ شادی کو پانچ سال گزر چکے تھے اور صالحہ اب ایک بیٹے کے علاوہ ایک بیٹی کی بھی ماں تھی جس کا نام ارجمند تھا۔ ارجمند عامر سے دو سال چھوٹی تھی۔ مکان کی پہلی منزل بن کر تیار ہو چکی تھی اور صالحہ دونوں بچوں کے ساتھ اس میں منتقل ہو گئی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اخراجات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ مہنگائی کا گراف بھی برابر اوپر جا رہا تھا اور رقم کی زیادہ سے زیادہ ضرورت تھی۔ گھر میں دو نوکر، ایک آیا تھی، ان کی تنخواہیں تھیں، کھانا پینا تھا۔ آخر ایک ہزار گز کے رقبے پر بنے ہوئے مکان کی صفائی ستھرائی اور دیکھ بھال کے لئے دو سے کم نوکر کس طرح کافی ہو سکتے تھے؟

اور پھر مکان کے بن جانے کے بعد بہت بڑی رقم اس کو ڈیکوریٹ کرنے کے لئے چاہئے تھی۔ گھر میں سب کچھ ہونا چاہئے تھا۔ بہترین فرنیچر، قالین، فریج، ٹی وی، کراکری، پردے سب ہی کچھ تو چاہئے تھا اور ہر چیز ایک عالی شان کوٹھی کے معیار کے مطابق ہونی چاہئے تھی۔

ان پانچ برسوں کے دوران اور بھی کئی اہم واقعات ہوئے تھے۔ سلطان کافی بیمار رہنے لگا تھا اور پھر وہ واپس کراچی چلا گیا جہاں ایک سال بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ کرمو

خاص طور سے چھٹی لے کر اس کی تدفین کے موقع پر کراچی گیا تھا اور اس سے چاچی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ دونوں کا چالیس برس کا ساتھ تھا اور چاچی رو رو کر بتاتی تھیں کہ انہوں نے کیسا کیسا کڑا وقت ایک ساتھ گزارا تھا۔ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا تھا کہ دن میں صرف ایک بار کھانا میسر آتا تھا اور وہ بھی روکھا سوکھا لیکن وہ وقت بھی گزر گیا اور پھر قسمت نے اچھے دن دکھائے اور پھر اس سے بھی زیادہ اور اچھے دن دکھائے لیکن جب سلطان کے آرام کرنے اور سکون سے سانس لینے کا وقت آیا تو وہ ابدی آرام کے لئے چلا گیا۔

"میں تو ان سے کب سے کہہ رہی تھی کہ اب واپس آ جائیں۔" رابعہ زار و قطار روتے ہوئے کہتی تھی۔ "بس بہت ہو گیا۔ پچھلے چار سال سے میں ان سے کہہ رہی تھی کہ اب واپس آ کر آرام سے یہاں رہیں۔ اب ہمیں کچھ نہیں چاہئے اور دو سال پہلے تو انہوں نے واپس آنے کا پورا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن پھر کمپنی والوں نے دو سال کے لئے اور روک لیا۔"

کرمو چاچی کے بین سن رہا تھا اور اس کے دل میں ایک عجیب سا احساس جاگ رہا تھا۔ اسے باہر کام کرتے ہوئے دس سال گزر گئے تھے اور شادی کو پانچ سال کا عرصہ ہو گیا تھا لیکن اس کی بیوی نے ایک بار بھی اس سے نہیں کہا تھا کہ وہ وطن واپس آ جائے۔

"لیکن وہ ابھی یہ بات کیسے کہہ سکتی ہے؟" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ "ابھی تو میں جوان ہوں' میرے ہاتھ پیروں میں طاقت ہے۔ کام کر سکتا ہوں۔ وہ سوچتی ہے کہ باہر کام کرنے والے دوسرے مردوں کی طرح مجھے بھی اس کو اور اس کے بچوں کو بہترین زندگی دینی چاہئے اور وہ میں دے رہا ہوں۔"

کرمو 1962ء میں ملتان سے کراچی آیا تھا۔ پھر چار سال کراچی میں گزارنے کے بعد 1966ء میں وہ سعودی عرب چلا گیا تھا اور وہاں جانے کے تقریباً پانچ سال بعد 1970ء میں اس کی شادی ہو گئی تھی اور اب وہ دو بچوں کا باپ تھا اور اسے وہاں کام کرتے ہوئے دس سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔

کراچی واپس آنے کا اس کا خواب پورا ہی نہیں ہو پا رہا تھا۔ ہر چند سال کے بعد وہ سوچتا کہ اب وطن واپس چلا جائے گا اور کراچی میں ہی رہ کر کچھ کرے گا لیکن گھر کی ضرورتوں میں جس انداز سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا ان کو پورا کرنا کراچی میں رہ کر ممکن نہیں تھا۔

پچھلی بار جب وہ کراچی آیا تھا تو اس نے صالحہ سے کہا تھا کہ وہ اب واپس آنا چاہتا ہے کیونکہ وہ اکیلی ہے اور بچوں کو باپ کی شفقت اور سرپرستی کی ضرورت ہے۔

"بچوں کو ایک بہتر اور اعلیٰ معیارِ زندگی کی ضرورت ہے۔" صالحہ نے جواب میں کہا۔ "انہیں بہترین تعلیم کی ضرورت ہے۔ زندگی کی جملہ آسائشوں کی ضرورت ہے۔ ذرا سوچو تم کراچی آ گئے تو کیا کرو گے؟ تم ہو کیا؟ پلمبر' کوئی تعلیم کوئی کوالیفکیشن' کوئی ڈگری' کوئی ڈپلوما ہے تمہارے پاس؟ وہاں رہ کر تم جو کچھ کما رہے ہو صرف اپنی محنت اور تجربے کے بل بوتے پر کما رہے ہو۔ یہاں آ گئے تو کیا ملے گا؟ خاک! کون سی نوکری مل جائے گی تمہیں؟ ظاہر ہے کہ تم نوکری تو کر نہیں سکتے کیا پلمبر کی ہزار بارہ سو روپے کی نوکری کرو گے؟ یا پھر پلمبر کا کام کرو گے؟ ہنہ' اتنی عالیشان کوٹھی میں رہنے والا شخص جہاں تین تین نوکر ہوں' ہاتھ میں ہتھوڑی اور پانے لے کر گھروں گھروں پلمبر کا کام کرے گا؟

"میں پلمبر کا کام نہیں کروں گا۔" کرمو نے دبے الفاظ میں کہا۔ "میں کوئی اور کاروبار کروں گا۔"

"کاروبار؟ کاروبار کہاں سے کرو گے؟" صالحہ نے فوراً ہی جواب دیا۔ "کاروبار کے لئے بھاری رقم چاہئے۔ رقم کہاں ہے تمہارے پاس؟ جو کچھ آتا ہے خرچ ہو جاتا ہے اور ابھی تو اخراجات بڑھتے ہی جائیں گے۔ عامر کو میں نے انگلش میڈیم اسکول میں داخل کروا دیا ہے' اگلے سال سے ارجمند بھی اسکول جانے لگے گی۔ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے جائیں گے ان کے اخراجات بھی بڑھتے جائیں گے۔ آخر ہمیں بچوں کے مستقبل کے بارے میں بھی تو سوچنا ہے۔"

"میں کچھ نہ کچھ تو کر ہی لوں گا یہاں۔" کرمو نے کہا۔ "بچوں کے ساتھ رہوں گا تو ذرا اچھا رہے گا.........." اس کے لہجے میں التجا آمیز بے بسی تھی۔

"انسان جس معیار زندگی کا عادی ہو جاتا ہے پھر اس سے نیچے اترنا مشکل ہو جاتا ہے۔" صالحہ نے اسے سمجھایا۔ "تم یہ بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ ذرا پاکستان کے حالات پر تو نظر ڈالو۔ کیسی دوڑ لگی ہوئی ہے باہر جانے کی۔ جسے دیکھو' منہ اٹھائے مڈل ایسٹ کی طرف بھاگ رہا ہے۔ ہر شخص اس کوشش میں ہے کہ کچھ نہ کچھ کر کے باہر نکل جائے۔ لوگ ہزارہا روپے خرچ کر رہے ہیں باہر کے ویزوں کے لئے اور ایک تم ہو۔ تم باہر سے واپس آ جانا چاہتے ہو۔ تمہیں تو اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہئے اور خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ تم پہلے سے وہاں موجود ہو اور کام کر رہے ہو۔"

صالحہ نے یہ بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں کہی تھی۔ 1962ء سے لے کر اب تک حالات میں زمین آسمان کا فرق نمایاں ہو چکا تھا۔ کرمو جب کراچی آیا تھا تو اس وقت ایوبی آمریت کی حکمرانی تھی۔ 1965ء میں جب پاک بھارت جنگ ہوئی تو اس وقت وہ کراچی میں ہی تھا۔ پھر 1966ء میں وہ سعودی عرب آ گیا۔ 1970ء میں پاکستان میں عام انتخابات ہوئے۔ کرمو اس وقت سعودی عرب میں تھا۔ پھر اس کے وطن میں بڑی تبدیلیاں رونما ہو گئیں۔ ملک کا ایک حصہ کٹ کر الگ ہو گیا۔ بنگلہ دیش وجود میں آ گیا اور صرف مغربی پاکستان، پاکستان رہ گیا جہاں بھٹو حکومت قائم ہو گئی۔ جس نے کچھ ہی عرصے کے بعد لوگوں کے بیرون ملک جانے اور ملازمت کرنے پر پابندیاں نرم کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی غربت، بے روزگاری، مہنگائی، معاشی عدم استحکام، صنعت کاری کے فقدان اور جاگیردارانہ استحصال کے مارے ہوئے پاکستان سے انسانوں کا ایک سیلاب مڈل ایسٹ کی طرف بہہ نکلا۔ ان میں صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ، فنی ماہرین ہی شامل نہیں تھے بلکہ لاکھوں کی تعداد میں ہنرمند اور غیر ہنرمند محنت کش بھی شامل تھے۔ دور دراز کے دیہات کے لوگ اپنی زمینیں، اثاثے مال مویشی فروخت کر کے مڈل ایسٹ کی طرف بھاگ رہے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ پیسہ کما سکیں۔ پاکستان میں ان گنت ریکروٹنگ ایجنسیاں قائم ہو گئی تھیں اور لوگوں کو باہر بھیجنے کے کام نے ایک باقاعدہ منفعت بخش کاروبار کی حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بڑے پیمانے پر فریب دہی اور فراڈ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ کتنے ہی لوگوں نے انتظامیہ اور پولیس کے ساتھ سازباز کے ذریعے جعلی ریکروٹنگ ایجنسیاں قائم کر لی تھیں اور باہر بھجوانے کے بہانے سادہ لوح محنت کشوں کے کپڑے تک اتروا لئے تھے۔ جعلی ویزوں کی گرم بازاری تھی اور سعودی عرب اور مڈل ایسٹ کے دوسرے ممالک میں کتنے ہی پاکستانی جعلی دستاویزات کے ذریعے ملک میں آنے کے جرم کی پاداش میں جیلوں میں پڑے ہوئے تھے جن کا کوئی پرسان حال نہیں تھا۔ سفارتخانوں کے اہل کاروں کو اتنی فرصت ہی نہیں تھی کہ کبھی اپنے ان بدنصیب ہم وطنوں کے بارے میں بھی سوچیں جو فردا کی بے یقینی اور کمر توڑ مہنگائی اور بے روزگاری کے ہاتھوں پریشان ہو کر رزق کی تلاش میں باہر نکلے اور سفاک زر پرستوں کی ہوس زر کا شکار ہو کر کسی کارگاہ میں پہنچنے کے بجائے جیل میں پہنچ گئے۔

☆======☆======☆

مکان کی پہلی منزل بن گئی۔ اس کی ڈیکوریشن پر بھاری رقم خرچ کر دی گئی۔ عامر کے

بعد ارجمند بھی اسکول جانے لگی دونوں بچے ایک بہت مہنگے انگلش میڈیم اسکول میں جاتے تھے۔ جہاں کے اخراجات کئی ہزار روپے ماہانہ تک پہنچتے تھے۔ صالحہ نے گاڑی خرید لی تھی اور ایک ڈرائیور بھی رکھ لیا تھا۔ آخر بچوں کو اسکول لانا لے جانا ہوتا تھا۔ اگر بچے اسکول کی بس سے جاتے تو انہیں گھنٹوں پہلے گھر سے نکلنا پڑتا تھا اور بہت دیر بعد واپسی ہوتی۔ پھر وہ بہت بڑا اور شاندار اسکول تھا۔ زیادہ تر بچے اپنی اپنی گاڑیوں میں آتے تھے۔ صالحہ کے بچے اگر بس میں جاتے تو احساس کمتری کا شکار ہوتے۔ بچوں کو اس کمپلیکس سے بھی بچانا تھا کہ ان کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ پھر اور جگہ بھی آنا جانا لگا رہتا تھا۔ آخر صالحہ اکیلی یا دونوں بچوں کے ساتھ رکشوں اور ٹیکسیوں میں کہاں کہاں دھکے کھاتی پھرتی۔ چنانچہ گاڑی ایک ایسی اشد ضرورت تھی جسے نظرانداز کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔

گاڑی کا خرچ، پیٹرول کا خرچ، ڈرائیور کی تنخواہ۔ اخراجات بڑھ رہے تھے۔ مزید رقم کی ضرورت تھی۔

کرمو اب پلمبنگ سپروائزر تھا اس کی تنخواہ بھی پہلے سے کافی زیادہ تھی لیکن گھر کے اخراجات کا جو حال تھا اس کے سامنے اس کی تنخواہ کم تھی اور اگر وہ اوور ٹائم نہ کرتا تو پھر بڑی مشکل ہوتی۔ آخر کچھ نہ کچھ بچانا بھی تو ضروری تھا۔ برے وقتوں کے لئے کچھ رقم تو پاس ہونی چاہئے۔

اور اب تو صالحہ نے ایک نیا پروگرام بنا لیا تھا اور وہ اوپر کی منزل کی تعمیر شروع کروانا چاہتی تھی۔ آخر بچے بڑے ہوں گے تو علیحدہ کمروں کی ضرورت ہو گی۔ نیچے بھلا اتنی گنجائش کہاں تھی کہ وہ وہاں رہ سکیں۔ لے دے کر کل پانچ ہی تو کمرے تھے۔ ایک ڈرائنگ روم، ایک ڈائننگ روم، ایک گیسٹ روم، ایک اسٹڈی، ایک بیڈ روم، فی الحال تو بچے اسٹڈی میں رہ رہے تھے لیکن کچھ عرصے بعد انہیں علیحدہ کمروں کی ضرورت تھی۔

"اگلے سال میری چھوٹی بہن دردانہ کی شادی ہونے والی ہے۔" اس نے کرمو کو لکھا۔ "دردانہ کا شوہر ڈاکٹر ہے اور فی الحال وہ ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہے اور اپنا کلینک چلاتا ہے۔ اس کے پاس ایک پلاٹ گلشن اقبال میں موجود ہے لیکن اس بلاک میں ابھی پانی نہیں آیا ہے۔ شاید دو سال اور لگیں گے۔ میں اوپر کی منزل شروع کروا رہی ہوں۔ جب تک دردانہ کا مکان نہیں بن جاتا تب تک دردانہ اپنے شوہر کے ساتھ وہاں رہے گی۔"

کرمو نے صالحہ کے خط کو پڑھا۔ ایک ٹھنڈی سانس بھری اور اپنے ہاتھوں کو دیکھنے

لگا جو دھوپ اور گرمی میں جھلس کر سیاہ پڑ گئے تھے۔ لوہے کے اوزار اور پائپ دھوپ میں تپ کر آگ کی طرح جلنے لگتے تھے اور ان کو ہاتھ سے پکڑنے میں ہاتھوں کی کھال جھلسنے لگتی تھی اور سیاہ پڑ جاتی تھی اور اب تو ہاتھوں کی کھال اتنی زیادہ موٹی اور سیاہ ہو گئی تھی کہ اس کی جیسے حس ہی مر گئی تھی۔

انہی دنوں کرمو کی ملاقات ایک ایسے آدمی سے ہوئی جس سے اسے اپنے گھر والوں کے بارے میں معلوم ہوا۔ وہ جب سے اپنے گاؤں سے نکلا تھا اس دن سے آج تک اسے ان لوگوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ نہ وہ کبھی واپس وہاں گیا نہ اس نے کسی ذریعے سے وہاں کے حالات جاننے کی کوشش کی۔ جو لوگ اسے قتل کرنا چاہتے تھے اس نے اپنے ذہن میں ان سب لوگوں کو قتل کر دیا تھا۔

پاکستان سے آنے والے محنت کشوں کے سیلاب میں بہتا بہتا یہ شخص بھی جو ایک غیر ہنرمند مزدور تھا' سعودی عرب کے اس علاقے میں ایک بلڈنگ کی سائیٹ پر کام کرنے کے لئے آیا جہاں کرمو گزشتہ ڈیڑھ سال سے کام کر رہا تھا۔ وہ بیس سال کا ایک نوجوان تھا اور کرمو اسے بالکل نہیں پہچان سکتا تھا۔ کیونکہ ان دونوں نے جب آخری بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا تو اس وقت مراد علی نامی اس شخص کی عمر چار پانچ سال کی ہو گی۔ دوران گفتگو جب اتفاقاً کرمو کو یہ معلوم ہوا کہ وہ بھی ملتان کے اس نواحی گاؤں کا رہنے والا ہے جہاں کا کرمو ہے تو کرمو نے اپنی اصلیت کو ظاہر کئے بغیر اس سے تاج دین کے بیٹے علم دین اور اس کے خاندان والوں کے بارے میں دریافت کیا۔

"علم دین کی شادی اپنے ماموں نوروز خان کی بیٹی سے ہوئی ہے۔" مراد علی نے کہا۔ "علم دین کا ایک بڑا بھائی کرم دین بھی تھا جو عرصہ ہوا لاپتہ ہو گیا۔ وہ اپنے گاؤں سے اپنے ماموں نوروز خان کے گاؤں جانے کے لئے نکلا تھا لیکن وہاں نہیں پہنچا۔ شاید راستے میں کسی نے اسے لوٹ لیا' مار ڈالا اور لاش کو کہیں چپکے سے دفنا دیا۔ پولیس نے بہت تلاش کیا۔ گاؤں والوں نے بھی ڈھونڈا لیکن کرم دین کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ علم دین اب بھی وہیں رہ رہا ہے۔ وہ سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ علم دین کے دو بیٹے ہیں۔ دونوں اپنے باپ کے ساتھ زمین پر کام کرتے ہیں۔"

"تو وہ سب کے سب زندہ سلامت ہیں' خوش و خرم۔" کرمو نے ایک گہری اداسی کے ساتھ سوچا۔ "وہ جو کچھ چاہتے تھے اور جس کے لئے انہیں میری موت کی ضرورت تھی وہ انہیں میری موت کے بغیر ہی مل گیا۔ وہ لعنت کی ماری زمین اب ان کی ہے میں تو

واقعی مر چکا ہوں۔ ان کے لئے تو میں مر چکا ہوں۔"

کراچی میں اس کے مکان کی دوسری منزل کی تعمیر شروع ہو گئی۔ کرمو کے ہاتھوں کی سیاہی' درشتی اور سختی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ڈرافٹ کی رقم میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ گاڑی پرانی ہو گئی تھی اور زیادہ تکلیف دینے لگی تھی صالحہ نے ایک دوسری زیادہ بہتر گاڑی خرید لی تھی۔ بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی کی جگہ چھبیس انچ کے رنگین ٹی وی نے لے لی تھی اور صالحہ نے لکھا تھا کہ اگلی بار جب وہ آئے تو وی سی آر لے کر آئے۔ بہت سے گھروں میں اب وی سی آر موجود تھے۔ حسب معمول دیگر فرمائشوں کی بھی ایک طویل فہرست تھی۔

1986ء کا سال آ گیا۔ کرمو نے عمر عزیز کے پورے بیس سال سعودی عرب میں مویشیوں کی طرح شبانہ روز مشقت کرتے ہوئے گزار دیئے۔ اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی' چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئیں' آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمودار ہو گئے' زندگی کی بیں بہاریں تپتے ہوئے صحراؤں میں اور جھلسا دینے والی دھوپ کی نذر ہو چکے تھے' جوانی کی ساری ساعتیں صحرا کی ریت کے ذروں میں مل کر ختم ہو گئی تھیں۔ بڑھاپا زندگی کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

1966ء میں جب وہ سعودی عرب آیا تھا تو اس کا ارادہ یہی تھا کہ کچھ عرصے تک یہاں کام کرنے کے بعد واپس کراچی چلا جائے گا اور پھر وہیں رہے گا اور کام کرے گا لیکن تقدیر اس پر خندہ زن تھی۔ کرمو کو اس وقت نہیں معلوم تھا کہ اس اجنبی سرزمین پر اس کی زندگی کے پورے دو عشرے خرچ ہو جائیں گے اور اس کے جسم و جان کی صرف ہونے والی توانائی کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورتوں کی بھٹی کا ایندھن بنتی رہے گی۔ اس نے کتنی بار چاہا کہ وہ واپس کراچی آ جائے اور یہیں آ کر کچھ کام کرے لیکن صالحہ نے کبھی اسے اس کی اجازت نہیں دی۔ مکان' بچے' تعلیم' اخراجات' ضروریات اور اور .... اور .... اور .... اور .... کی ظالم چکی نے کرمو کے جسم کو پیس کر رکھ دیا تھا۔

1986ء کے اواخر میں وہ پندرہ دن کی چھٹی پر پاکستان آیا۔ بچے اب کافی بڑے ہو گئے تھے لیکن ان کے لئے اپنے باپ کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ بچوں کی پیدائش کے بعد سے اب تک کرمو نے ان کے ساتھ بمشکل مجموعی طور پر چھ ماہ کا عرصہ گزارا تھا۔ صالحہ کا ہمیشہ اصرار رہتا تھا کہ وہ بار بار نہ آئے' بار بار چھٹی نہ لے' زیادہ دنوں

کی چھٹی نہ لے' کوشش کرے کہ زیادہ سے زیادہ وقت کام میں گزارے تاکہ آمدنی بڑھے' پیسے کی ضرورت بڑھ رہی تھی۔

اوپر کی منزل بن کر تیار ہو چکی تھی۔ صالحہ کی چھوٹی بہن دردانہ کی شادی عرصہ ہوا ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر ڈاکٹر اعجاز کے ساتھ اوپر کی منزل میں رہ رہی تھی۔

"ڈاکٹر اعجاز کا اپنا مکان ابھی نہیں بنا؟" کرمو نے صالحہ سے پوچھا۔

"بن تو گیا ہے۔" صالحہ نے کہا۔ "اور وہ لوگ وہاں منتقل ہونے والے تھے لیکن میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ مکان کرائے پر اٹھا دیں اور فی الحال یہیں رہیں۔ بچوں کے کمرے بھی اوپر ہیں۔ وہ تنہا رہتے ہوئے ڈریں گے چنانچہ وہ لوگ ابھی وہیں رہ رہے ہیں۔ بچے ذرا اور بڑے ہو جائیں تو وہ لوگ اپنے مکان میں چلے جائیں گے۔ ویسے بھی انہوں نے کون سی زیادہ جگہ گھیر رکھی ہے صرف تین ہی کمرے تو ان کے استعمال میں ہیں۔"

کرمو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس گھر میں سب کچھ صالحہ کی مرضی سے ہوتا تھا۔ وہ سارے فیصلے خود ہی کرتی تھی۔

عامر کی عمر اب تقریباً چودہ سال کی تھی اور ارجمند کی تقریباً بارہ سال کی تھی۔ دونوں بچے فرفر انگریزی بولتے تھے اور اپنی ماں سے زیادہ تر بات چیت انگریزی میں کرتے تھے۔ کرمو عربی نہایت روانی اور عمدگی کے ساتھ بولتا تھا لیکن جہاں تک انگریزی کا تعلق تھا تو جتنی انگریزی اسے اب سے بیس سال پہلے آتی تھی اس میں کچھ زیادہ اضافہ نہیں ہوا تھا۔

"ڈیڈی! کیا آپ نے اسکول میں انگریزی نہیں پڑھی؟" عامر نے ایک روز اس سے پوچھا۔ "آپ انگلش کیوں نہیں بول سکتے؟"

"جتنی تمہاری اسکول کی فیس ہے اس سے آدھی رقم میں ہمارا پورا گھرانہ مہینہ بھر روٹی کھاتا تھا بیٹے!" کرمو نے کہنا چاہا لیکن الفاظ اس کے حلق میں پھنس گئے۔ اس کی زندگی میں تو کوئی بچپن نہیں تھا' کوئی اسکول نہیں تھا' کوئی تعلیم نہیں تھی۔ اس نے تو ہوش سنبھالتے ہی کھیتوں میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔

"مگر میں عربی تو بول سکتا ہوں۔" کرمو نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "تم تو عربی نہیں بول سکتے۔"

"امی کہتی ہیں کہ آپ انجینئر ہیں۔" عامر نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ "لیکن اگر آپ کو انگلش نہیں آتی تو آپ انجینئر کیسے بن گئے؟ اس کے لئے تو انجینئرنگ کا امتحان

پاس کرنا پڑتا ہے اور انگلش کے بغیر کوئی امتحان کیسے پاس کیا جا سکتا ہے؟"

"عامر!" صالحہ نے اسے آواز دی۔ "جاؤ جا کر ہوم ورک کرو۔ ڈیڈی کو تنگ مت کرو۔"

"تم نے بچوں سے یہ کہہ رکھا ہے کہ میں انجینئر ہوں۔" عامر کے جانے کے بعد کرمو نے اپنی بیوی سے کہا۔

"تو اور کیا یہ کہتی کہ تم پلمبر ہو؟" صالحہ نے چمک کر کہا۔ "بچوں کو اگر یہ معلوم ہو کہ ان کا باپ پلمبر ہے تو ان پر نفسیاتی طور پر کتنا خراب اثر پڑے گا۔ آخر وہ ایک دولت مند گھرانے کے بچے ہیں۔"

کرمو کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک اعجاز کمرے میں آ گیا اور کرمو پر اچٹتی ہوئی نظر ڈال کر صالحہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "آپا! ذرا گاڑی کی چابی تو عنایت کیجئے۔ میں اور دردانہ ایئرپورٹ جا رہے ہیں۔ ہمارے مہمان آ رہے ہیں نا' انہیں لینے جانا ہے۔"

"ہاں یاد آیا۔ وہ تمہارا کزن جاوید اور اس کی بیوی نادرہ آج ہی لندن سے آ رہے ہیں۔ انہیں لینے جا رہے ہو؟"

"جی ہاں۔" اعجاز نے جلدی سے جواب دیا۔ "دردانہ نے گیسٹ روم ان کے لئے ٹھیک ٹھاک کر دیا ہے۔ ہاں نئے بیڈ بھی ڈلوا دیئے ہیں۔ آخر وہ لندن سے آ رہے ہیں۔ ہر چیز ان کے شایانِ شان ہونی چاہئے اور ہاں' گاڑی میں پیٹرول تو ہو گا آپا' یا ڈلوانا پڑے گا؟"

"پورا ٹینک فل ہے۔" صالحہ نے کہا۔ "دوپہر کو ہی فل کروایا تھا۔"

اعجاز نے صالحہ سے گاڑی کی چابی لی اور سیٹی بجاتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ کرمو کو مہمانوں کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا اور اسے کسی نے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"کون آ رہا ہے؟" اس نے صالحہ سے پوچھا۔

"اعجاز کا کزن جاوید اور اس کی بیوی نادرہ۔" صالحہ نے جواب دیا۔ "دونوں ڈاکٹر ہیں۔ لندن میں رہتے ہیں اور وہیں پریکٹس کرتے ہیں۔ اعجاز اور دردانہ کی کوشش ہے کہ وہ انہیں بھی لندن بلا لیں اور وہ اس پوزیشن میں ہیں کہ اعجاز اور دردانہ کی مدد کر سکیں۔ مشکل تو یہ ہے کہ تم بیس سال سے مڈل ایسٹ میں ہو لیکن ایسے معاملات میں کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔ اگر انجینئر وغیرہ ہوتے تو بہت کچھ کر سکتے تھے۔ ایک معمولی پلمبر بھلا کیا کر

سکتا ہے؟"

کرمو وہاں سے اٹھا اور باہر برآمدے میں جا بیٹھا۔ یہ گھر' اس کا ماحول' اس کے اپنے بچے سب کچھ اسے اجنبی لگ رہا تھا۔ اس گھر کے در و دیوار میں اپنائیت کی کوئی خوشبو نہیں تھی۔ مکان تو تعمیراتی ساز و سامان کی ترتیب و تزئین کا ایک تراشیدہ بے جان و بے روح پیکر ہوتا ہے۔ اس کی روح اس کے مکین ہوتے ہیں۔ مکینوں کا وجود مکان کو رنگ و نور اور خوشبو کا وہ پیراہن عطا کرتا ہے جو اس کی منفرد کشش کا تعین کرتا ہے۔ پھر تو کچی مٹی کا معمولی سا گھر بھی عشرت کدہ معلوم ہوتا ہے مگر کرمو کے لئے یہ عالی شان دو منزلہ کوٹھی محض تعمیراتی ساز و سامان کا ایک ڈھیر تھی۔ بے جان' بے روح' بے کشش۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی وہ اپنے آپ کو یہاں بالکل بیگانہ اور تنہا محسوس کر رہا تھا۔

اس رات ڈاکٹر اعجاز اور دردانہ کے مہمان آ گئے۔ کھانے کی میز پر سب لوگ موجود تھے۔ دونوں بچے بھی تھے۔ ملی جلی زبان میں گفتگو ہو رہی تھی لیکن انگریزی کا استعمال بہت زیادہ تھا اور بعض اوقات تو صرف انگریزی میں ہی باتیں ہونے لگتیں۔

کرمو کا تعارف مہمانوں سے مسٹر کرم دین پلمبنگ کنٹریکٹر' کی حیثیت سے کرایا گیا تھا جو گزشتہ بیس سال سے سعودی عرب میں پلمبنگ کے بڑے بڑے ٹھیکے لیتا رہا تھا۔

کرمو کا دم گھٹنے لگا۔ ان لوگوں کی آدھی سے زیادہ گفتگو تو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور جو کچھ بھی وہ سمجھ رہا تھا اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھایا اور معذرت کر کے اٹھ آیا۔ ڈرائنگ روم سے بہت دیر تک سب لوگوں کے قہقہوں کی آوازیں آتی رہیں۔

مہمان کوئی مہینہ بھر کے لئے آئے تھے اور صالحہ اور دردانہ رات دن ان کی دلجوئی میں لگی رہتی تھیں۔ بچوں کو بھی ہدایت تھی کہ مہمانوں کو خوش رکھیں اور ان کے ساتھ کوئی بدتمیزی نہ کریں۔ آخر وہ اعجاز اور دردانہ کی مدد کرنے کی پوزیشن میں تھے اور اس لئے ان کا خیال رکھنا بہت ضروری تھا۔

کرمو کے لئے چھٹی کا بچا ہوا ایک ہفتہ کاٹنا مشکل ہو گیا۔ گھر میں کوئی اس سے بات کرنے والا ہی نہیں ہوتا۔ وہ دن بھر اکیلا پڑا رہتا اور شام کو اِدھر اُدھر نکل جاتا۔

ایسی ہی ایک اداس اور ویران شام تھی۔ گھر کے سب لوگ مہمانوں کو ساتھ لے کر کسی ہوٹل میں ڈنر کے لئے گئے ہوئے تھے۔ صالحہ نے اسے بتایا تھا کہ وہاں کچھ اور مہمان بھی موجود ہوں گے' سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ اور انگریزی داں۔

"اچھا نہیں لگے گا کہ تم بات چیت میں شریک نہ ہو سکو اور خاموش بیٹھے رہو۔ ہے نا؟" صالحہ نے کہا۔ "میں کہہ دوں گی کہ تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اس لئے تم نہیں آ سکے۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" کرمو نے جواب دیا۔ "ویسے بھی اتنے زیادہ پڑھے لکھے لوگوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

سب لوگ چلے گئے اور اس کے کچھ دیر بعد کرمو بھی گھر سے نکل کر بس میں بیٹھ کر صدر چلا گیا۔ کافی دیر تک وہ اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ یوں ہی بے مقصد اور پھر اچانک اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔

اس نے تہمینہ کو دیکھا تھا۔ تہمینہ ایک لڑکے کے ساتھ کتابوں کی ایک دکان میں داخل ہو رہی تھی۔

کرمو کے قدم زمین میں جکڑ کر رہ گئے۔ وہ تہمینہ تھی۔ بلاشبہ وہ تہمینہ تھی۔ اس کی آنکھیں آج بیس سال سے بھی زیادہ عرصے کے بعد تہمینہ کو دیکھ رہی تھیں۔

صحرائے عرب کے تپتے ہوئے موسموں' جھلستی ہوئی ریت اور جسم کو جلا دینے والے بادِ سموم کے تھپیڑوں میں جان توڑ مشقت کے کڑے اور صبر آزما لمحات میں اگر کوئی چیز اس کے وجود کو ٹھنڈک بخشتی تھی تو وہ تہمینہ کا تصور تھا۔ شاید کوئی دن کوئی رات ایسی گزری ہو جب اس نے تہمینہ کو یاد نہ کیا ہو۔ تہمینہ کے ہجر کی رعنائی سے اس کا وجود روشن رہتا تھا۔ اس کے غم فرقت سے اس کے دل میں اجالا رہتا تھا۔ تہمینہ کا تصور تو اسے زندگی کا احساس دلاتا تھا۔

صالحہ تھی' بچے تھے' گھر تھا' دولت تھی لیکن یہ ساری چیزیں اس کی زندگی میں کوئی جگہ نہ بنا سکی تھیں۔ صالحہ اور بچے اس سے 'بہت دور تھے' جسمانی طور پر بھی اور ذہنی طور پر بھی لیکن تہمینہ تو اس سے کبھی جدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ کبھی اس سے دور نہیں رہی تھی۔ یہ ایک عجیب رنگ قرب تھا۔ وہ شخص جو پل بھر بھی اس کے ساتھ نہیں رہا تھا وہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوا تھا۔

کرمو اور تہمینہ کی محبت اور ملاقاتوں کا عرصہ مختصر تھا۔ یہ صرف چند ماہ پر مشتمل تھا اور اسے پورا ایک سال بھی نہیں ہوا تھا لیکن یہ مختصر سی ساعتیں کرمو کی زندگی پر اپنے ان مٹ اور لازوال نقوش چھوڑ گئی تھیں۔ انہی ساعتوں میں کرمو نے زندگی کو اس کے پُراسرار رنگوں' لطافتوں اور نزاکتوں کے ساتھ دیکھا تھا اور اس کی مخفی رعنائیوں کا شعور

حاصل کر لیا تھا۔ انہی ساعتوں نے تو اسے بتایا تھا کہ چاند کو دیکھ کر دل پگھلنے کیوں لگتا ہے اور تاروں کی چمک سے رگِ جان پر چوٹ کیسے لگتی ہے۔ عمر رفتہ کے گلستان کی خوشبو کو تو اس نے اپنے پیکر جان میں بسا رکھا تھا۔

اس کی نگاہوں میں تہمینہ کی جو تصویر تھی اور جو آج سے بیس سال سے زیادہ پہلے کی تصویر تھی تہمینہ بالکل ویسی کی ویسی تھی۔ رتی برابر بھی تو فرق نہیں تھا۔ وہی رنگ و روپ وہی حسن و جمال وہی تیکھے نقوش سب کچھ بالکل ویسا ہی تھا۔

اور پھر یکبارگی اسے اپنے دماغی فتور کا احساس ہوا۔ وہ بھلا تہمینہ کس طرح ہو سکتی تھی۔ کیا تہمینہ وقت سے ماورا تھی؟ وقت سے ماورا تو کوئی نہیں ہوتا۔ وقت کس کے لئے رکتا ہے؟ تہمینہ کو تو اب ادھیڑ عمر کی ایک عورت ہونا چاہئے۔ وہ اتنی کمسن، اتنی نوخیز کس طرح ہو سکتی ہے؟

کرمو کے دل و دماغ میں ایک حشر بپا تھا۔ اس نے اس دکان کے آگے سے ہٹ جانا چاہا لیکن کوئی بہت قوی اور سرکش جذبہ اسے وہاں سے جانے سے روک رہا تھا۔ عشروں سے زیادہ کی درد انگیز اور غمناک محرومی آسودگی کے چند لمحاتِ گریزاں کے حصول کے لئے بے قرار ہو رہی تھی۔ وہ لڑکی کون تھی؟ کون تھی؟ کون تھی؟

تھوڑی ہی دیر کے بعد اس نے اس لڑکی کو ایک لڑکے کے ساتھ دکان سے باہر نکلتے دیکھا۔ لڑکے کے ہاتھوں میں کوئی پیکٹ تھا جس میں شاید تازہ خریدی ہوئی کتابیں تھیں۔ لڑکی پرس جھلاتی ہوئی تیز تیز قدموں سے اس کے ساتھ باہر آ رہی تھی۔ اس کے نازک اور لچکیلے جسم سے نوعمری کی زندگی بخش توانائی چھلکی پڑ رہی تھی۔

"بی بی ذرا ایک بات سننا۔" کرمو نے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے ان دونوں کے قریب پہنچ کر لڑکی سے کہا اور ایک دم رک کر وہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔ لڑکا بھی رک گیا۔

کرمو کی زبان گنگ ہوئی جا رہی تھی۔ تہمینہ اس کے سامنے کھڑی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی نگاہوں میں بیتے ہوئے مہ و سال کی آشنائی کی کوئی جھلک موجود نہیں تھی۔ اس کے بجائے وہاں ایک حیرت آمیز بیگانگی تھی۔

"جی فرمایئے؟" لڑکی نے کہا۔

"کون ہیں آپ؟" لڑکا قدرے ناگواری سے کرمو کو گھور رہا تھا۔

"معاف کرنا بٹی!" کرمو نے ان دونوں کو کسی بھی قسم کی غلط فہمی سے فوراً [illegible]کراتے ہوئے کہا۔ "آپ کس کی بیٹی ہیں؟ میرا مطلب یہ ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں

کیا آپ محترمہ تہمینہ صاحبہ کی کوئی رشتہ دار تو نہیں ہیں؟"

"تہمینہ؟" لڑکی کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدل گئے اور اس کے ہونٹوں پر لطافت و نزاکت کی بالیدگی سے بھرپور ایک شیریں مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "جی ہاں، تہمینہ میری والدہ کا نام ہے۔ مگر آپ کون ہیں؟"

"تم .... تم تہمینہ کی بیٹی ہو؟" اچانک کرمو کی آواز کانپنے لگی۔ وہ اپنی آنکھوں میں یکبارگی امنڈ آنے والے آنسوؤں کو روکنے کی سخت کوشش کر رہا تھا۔ اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"جی ہاں۔" لڑکی نے جواب دیا۔ "میرا نام ثوبیہ ہے اور یہ میرے بڑے بھائی ہیں، ناصر۔ مگر آپ کون ہیں اور ہماری امی کو کس طرح جانتے ہیں؟ ہم نے تو آپ کو کبھی نہیں دیکھا؟"

"تم لوگ مجھے نہیں جانتے؟" کرمو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہا۔ "تمہاری امی کہاں ہیں؟ میرا مطلب ہے .... تم لوگ کہاں رہتے ہو؟"

"امی یہیں موجود ہیں۔" ثوبیہ کے بجائے ناصر بول اٹھا۔ "وہ دوسری سڑک پر ابو کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی ہیں۔ میں اور ثوبیہ کتابیں خریدنے یہاں آئے تھے۔ کیا آپ ان لوگوں سے ملنا چاہیں گے؟"

"جانے زندگی کبھی دوبارہ تہمینہ سے ملاقات کا موقع دے یا نہ دے۔" کرمو نے دل میں سوچا۔ "بیس سال سے زیادہ کا عرصہ تو ہو گیا۔ ایک بار اس کی شکل دیکھ لوں جانے وہ اب کیسی لگتی ہو گی؟ بہت بدل گئی ہو گی شاید۔ ہاں ایک بار اس کو دیکھ لوں۔ اس سے دو چار باتیں کر لوں۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ اب رکھا ہی کیا ہے؟"

"ہاں ضرور۔" اس نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا اور ثوبیہ اور ناصر کے ساتھ چل پڑا۔ وہ لوگ اس سڑک کو پار کر کے ایک گلی میں داخل ہو گئے اور وہاں سے دوسری سڑک پر پہنچ گئے۔

"آپ نے اپنے بارے میں بتایا نہیں انکل!" ثوبیہ نے کہا۔ "آپ کا نام کیا ہے اور آپ ہماری امی کو کب سے جانتے ہیں؟"

"میں تمہاری امی کے سارے خاندان کو جانتا ہوں بیٹا!" کرمو ہولے سے مسکرا دیا۔ "تمہارے ساجد ماموں کہاں ہیں، آج کل؟ اور تمہارے نانا ماسٹر نبی بخش صاحب؟"

"ارے، آپ تو واقعی سب کو جانتے ہیں۔" ثوبیہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ماموں تو حیدر آباد میں رہتے ہیں۔ وہ واپڈا میں ملازم ہیں۔ نانا ابا اور نانی امی بھی انہی ک ساتھ رہتے ہیں؟ آپ کہاں رہتے ہیں انکل!؟"

"میں کراچی سے باہر رہتا ہوں بیٹے! بلکہ ملک سے باہر۔" کرمو نے جواب دیا

اس اثنا میں وہ لوگ دوسری سڑک پر ایک پرانی سی فوکسی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ فوکی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک پکی عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے برابر ایک ادھیڑ عمر عورت وہ دونوں اس لڑکے اور لڑکی کو ایک اجنبی کے ساتھ آتے ہوئے غور سے دیکھ رہے تھ جیسے ہی وہ تینوں گاڑی کے بالکل پاس پہنچے مرد دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور عورت بیٹ رہی۔

کرمو کی برسوں کی ترسی ہوئی آرزومند اور محروم نگاہوں نے اس ادھیڑ عم عورت کو دیکھا۔ وہ تہمینہ تھی' اصلی تہمینہ۔ اس کے بال ابھی تک سیاہ تھے۔ آنکھیں و ہی خوبصورت تھیں مگر چہرے پر گزرے ہوئے ماہ و سال کی گرد جمی ہوئی تھی۔ اگر وہ تہمینہ کو اچانک سرِراہ دیکھ لیتا تو شاید وہ اسے پہچان بھی نہ پاتا۔ دو عشروں سے زیاد مدت نے چہرے کے خدوخال کو کتنا بدل ڈالا تھا۔

کرمو کے ہونٹوں پر تبسم کی ایک لرزش اور آنکھوں میں حیرتِ دیدار تھی۔ عجیب لمحات تھے۔ وقت تھم گیا تھا نبضِ ہستی رک گئی تھی۔ سازِ حیات تھرا اٹھا تھا۔ دل کے تمام تیز رو دریا آنکھوں کے دہانوں سے پھوٹ نکلنے کو بیتاب تھے اور کرمو ان روک رہا تھا۔ ساری کائنات جیسے ایک نقطے پر آ کر سمٹ گئی تھی اور ہر لمحہ سانس رو ہوئے تھا۔

"امی!" ثوبیہ نے تہمینہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "یہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چا ہیں۔" اس دوران گاڑی سے اترنے والا شخص اجنبی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

"مجھ سے؟" تہمینہ نے چونک کر کہا اور جلدی سے گاڑی سے اتر کر نیچے آ گئی اس اجنبی کو دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں کے سامنے ایک جلا جھلسا' کرخت اور سیاہ چ جس کے سر میں تقریباً ایک تہائی بال سفید نظر آ رہے تھے۔ چہرہ اجنبی تھا لیکن پھر بھی طور پر اجنبی نہیں معلوم ہوتا تھا۔

"کون .... کون ہیں آپ؟" تہمینہ نے نرمی سے پوچھا۔ "معافی چاہتی آپ کو پہچانا نہیں میں نے۔"

تہمینہ اپنی بڑی بڑی سیاہ اور روشن آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کرم

سامنے اس کے چہرے کا ماہتاب جگمگا رہا تھا لیکن اب تو ان آنکھوں کے نجوم کسی اور کے شبستان میں فروزاں ہوتے تھے۔ یہ ماہتاب تو کسی اور ہی آنگن میں اتر چکا تھا۔ کرمو کے لئے یہ اچانک ملاقات' یہ غیر متوقع دیدار ہی جو برسوں کے بعد میسر آیا تھا اک عمر کا حاصل معلوم ہوتا تھا۔

وہ درد جو برسوں سے کرمو کی آنکھوں سے جوئے خون بن کر بہا تھا' اب شرمندہ اظہار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس درد کو کسی درماں کی ضرورت نہیں تھی۔ درماں کا وقت گزر چکا تھا۔ ہر چیز کا وقت گزر چکا تھا۔ بہت وقت گزر چکا تھا۔ بہت وقت گزر چکا تھا۔ تہمینہ کی دلداری کی خوشبو سے مہکے ہوئے ماہ و سال وقت کے ریگزاروں میں ذرہ ہائے صحرا بن کر غائب ہو چکے تھے۔

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں محترمہ تہمینہ صاحبہ!" کرمو نے بڑی شائستگی اور تکلف سے بھرپور انداز اور لہجے میں کہا۔ "میں کرم دین ہوں۔ کرم دین۔ عرف کرمو۔ جب آپ لوگ مسلم لیگ کوارٹرز میں رہتے تھے............"

"ارے کرمو............" تہمینہ نے اس کی بات پوری نہ ہونے دی اور وہ تقریباً چیخ پڑی۔ "کرمو' کرم دین صاحب! یہ آپ ہیں؟ اللہ .... ہائے اللہ۔ اللہ آپ اس قدر بدل گئے؟ افوہ میں نے تو آپ کو پہچانا بھی نہیں۔"

دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے آپ کہہ کر بات نہیں کی تھی لیکن تب کی بات اور تھی۔ آج وہ جن حالات میں ملے تھے وہ بالکل مختلف تھے۔ وہ نوجوانی اور نوخیزی کا زمانہ تھا۔ جب آنکھوں میں خود بخود خواب اتر آئے تھے۔ یہ بڑھاپے کے آغاز کی منزل تھی اور صرف ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیاں باقی تھیں۔ دونوں شادی شدہ تھے۔ نوجوان اولادوں والے تھے۔ تہمینہ کے ساتھ اس کا شوہر تھا اور بچے تھے۔ اب تو اندازِ گفتگو بدل ہی جانا چاہئے تھا۔

"میں نے آپ کی بیٹی کو دیکھا۔" کرمو نے دھیمی آواز میں کہا۔ "اور مجھے ایسا لگا جیسے آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ پھر میں نے ہمت کر کے آپ کی بیٹی سے ان کے بارے میں پوچھ ہی لیا اور یہ مجھے یہاں تک لے آئیں۔" وہ رک رک کر بول رہا تھا۔ الفاظ بیچ بیچ میں ٹوٹ جاتے تھے۔ جملے بھی کچھ بے ڈھب سے تھے۔

"ان سے ملئے۔" اس نے اپنے شوہر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے شوہر ہیں۔ سرفراز حسین' اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں۔"

سرفراز نے مسکرا کر کرمو کی طرف ہاتھ بڑھایا اور دونوں نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ کرمو کو اس شخص سے ذرا بھی نفرت نہیں محسوس ہوئی۔ وہ اسے بالکل بُرا نہیں لگا بلکہ اس نے اس کی جانب اپنے دل میں اپنائیت کا سا ایک جذبہ محسوس کیا۔ وہ شخص تہمینہ کا شوہر تھا۔ تہمینہ کے بچوں کا باپ تھا۔ وہ تہمینہ کے شوہر سے نفرت کیسے کر سکتا تھا۔

"آپ کا کیا شغل ہے جناب!" سرفراز حسین نے اس کے بے حد سخت اور کھردرے ہاتھ کی کڑی گرفت کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں .... میں پلمبر ہوں۔" کرمو نے ایک لمحے کے تامل کے بغیر فوری جواب دیا۔

"جی!" سرفراز حسین کی زبان سے بے ساختہ نکلا اور وہ کرمو کو گھورنے لگا۔

"پلمبر۔" کرمو نے دہرایا۔ "پلمبر کا کام کرتا ہوں جناب! لڑکپن سے یہی کام کرتا ہوں۔ ساری عمر گزر گئی یہی کرتے ہوئے۔" اور کرمو کو ایسا لگا جیسے یہ الفاظ کہہ کر اس کی روح بہت ہلکی ہو گئی ہے۔

"کرم دین صاحب سعودی عرب میں ہیں۔" تہمینہ نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "ایک عرصے سے وہاں کام کر رہے ہیں۔ بڑے ہنرمند آدمی ہیں۔ جب ہم لوگ مسلم لیگ کوارٹر میں رہتے تھے تو یہ ہمارے پڑوس میں رہتے تھے اور ابا سے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ ہمارے گھرانوں کے درمیان اچھے مراسم تھے۔"

"اوہ' تو پھر آپ تو ہماری سسرال والے ہوئے۔" سرفراز حسین نے ہنس کر کہا۔

کرمو آہستہ سے مسکرا دیا۔

"آپ کو کیسے معلوم کہ میں سعودی عرب میں ہوں؟" کرمو نے تہمینہ سے پوچھا۔ "آپ سے تو ایک زمانے سے ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ کتنے برسوں بعد آج اتفاق سے آپ مل گئیں۔"

"مگر مجھے تو آپ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔" تہمینہ نے ہولے سے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ بتایئے کہ صالحہ کیسی ہیں؟"

"ارے' تو آپ صالحہ کے بارے میں بھی جانتی ہیں۔" کرمو نے تعجب سے کہا۔

"ارے بھئی اس میں تعجب کی کون سی بات ہے؟" تہمینہ نے مسکرا کر کہا۔ "دراصل صالحہ کے گھر والے بھی تو اسی محلے میں رہتے تھے جہاں ہم اور آپ رہتے تھے اور آپ کی شادی میں ہماری امی شریک تھیں' دلہن والوں کی طرف سے۔"

"اچھا!" کرمو نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا۔"

"آپ اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟" تہمینہ نے اس سے پوچھا۔ "کوئی خاص مصروفیت ہے؟"

"نہیں تو۔" کرمو نے کہا۔ "میں تو بس یوں ہی آوارہ گردی کر رہا تھا کہ میں نے ثوبیہ کو دیکھ لیا.........."

"تو پھر آیئے ہمارے ساتھ ہمارے گھر چلیے۔" تہمینہ نے اس کی اداس آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "ہم لوگ ملیر میں رہتے ہیں۔ آپ آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھایئے۔"

"میں آپ کے گھر چلوں گا ضرور لیکن کھانے وغیرہ کا تکلف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" کرمو نے کہا۔ اس کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ تہمینہ کے دل میں آج بھی اس کے لئے چاہت موجود تھی۔ اس چاہت کی چاہے کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو لیکن بہرحال وہ موجود تھی۔ تہمینہ اس سے گریزاں اور متنفر نہیں تھی۔

"ارے صاحب آپ چلئے تو۔" سرفراز حسین نے بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ "ہم کون سا آپ کو مرغ مسلم کھلا رہے ہیں جو دال روٹی پکی ہوئی ہو گی وہ حاضر کر دی جائے گی۔"

سرفراز حسین نے اس کے لئے کار کا دروازہ کھولا اور وہ فوکسی کی پچھلی سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اس کے برابر ناصر بیٹھا اور ناصر کے برابر ثوبیہ۔ دو دروازوں والی پرانے طرز کی فوکسی تھی۔ تہمینہ کے بیٹھنے کے بعد سرفراز حسین بھی بیٹھ گیا اور اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔ سخت ناگوار اور بے ہنگم شور کے ساتھ فوکسی کا پرانا انجن اسٹارٹ ہوا اور پوری گاڑی پر جیسے تھرتھری طاری ہو گئی۔ سرفراز حسین نے جب گیئر میں ڈال کر گاڑی کو آگے بڑھایا تو یہ تھرتھری ذرا کم ہوئی۔

صدر سے ملیر تک کے سفر کے دوران ہی بہت سی باتیں ہو گئیں۔ فوکسی خوب شور کر رہی تھی اور اس کے انجر پنجر کافی ڈھیلے معلوم ہوتے تھے لیکن وہ چل خوب رہی تھی۔

سرفراز حسین اور تہمینہ کا مکان کالا بورڈ کے قریب ہی ایک نئی بننے والی سوسائٹی میں واقع تھا۔ ایک چھوٹا سا معقول مکان تھا جو ایک مختصر سے کنبے کی ضروریات کے لئے کافی تھا۔

اور پھر باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک جاری رہا۔

تہمینہ کی شادی کرمو کی شادی سے دو سال پہلے ہی ہو گئی تھی۔ اس وقت اس کا شوہر جو انگریزی میں ایم اے کے علاوہ بی ایڈ بھی تھا' کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ بعد میں اسے کالج میں لیکچرار شپ مل گئی اور پھر وہ ترقی کر کے اسسٹنٹ پروفیسر ہو گیا۔ تہمینہ نے بی اے کے بعد پڑھائی ختم کر دی تھی لیکن پھر شادی کے بعد اس نے بھی بی ایڈ کر لیا اور اب وہ ایک اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اس کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی ثوبیہ اس سے چھوٹا بیٹا ناصر اور اس کے بعد چھوٹی بیٹی شازیہ۔ تینوں بچے پڑھ رہے تھے۔

ساجد کی شادی تہمینہ کی شادی سے تین سال بعد ہوئی تھی اور اب وہ بیوی اور دو بچوں کے ساتھ حیدر آباد میں رہ رہا تھا جہاں وہ واپڈا میں ملازم تھا۔ ماسٹر نبی بخش ایک زمانہ ہوا ریٹائر ہو چکے تھے اور وہ اور ان کی بیوی اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ حیدر آباد میں رہتے تھے لیکن ریٹائر ہونے کے بعد بھی ماسٹر نبی بخش خالی اور بیکار نہیں بیٹھے تھے۔ انہوں نے صحافت میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی اور اخبارات کے لئے مضامین لکھا کرتے تھے۔

تہمینہ نے اسے بتایا کہ اس کی بیوی صالحہ کے گھرانے سے تہمینہ کے گھرانے کے مراسم اس وقت بھی قائم رہے جب دونوں گھرانے مسلم لیگ کوارٹرز چھوڑ کر الگ الگ علاقوں میں جا بسے تھے۔ تہمینہ اور اس کے گھر والے عزیز آباد چلے گئے تھے اور اس کے کافی عرصے بعد صالحہ اور اس کے گھر والے چار نمبر ناظم آباد میں اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔

"ہم لوگوں کو آپ کی اور صالحہ کی شادی کے بارے میں معلوم تھا۔" تہمینہ نے مسکرا کر کہا۔ "اور میری امی تو آپ کی شادی میں دلہن والوں کی طرف سے شریک بھی ہوئی تھیں۔ بلاوا تو ہم سب لوگوں کا بھی تھا لیکن صرف امی گئی تھیں۔ واقعی بڑی دھوم دھام سے آپ کی شادی ہوئی تھی.........."

کرمو کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔ آج دو عشروں سے زیادہ کی مدت کے بعد تمام کے تمام زخم جو اصل میں تو کبھی بھرے ہی نہیں تھے ایک بار پھر سے ہرے اور تازہ ہو گئے تھے۔

"اچھا میں تو بہت بول چکی۔" تہمینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کچھ اپنے بارے میں بھی تو بتایئے۔ آپ کی شادی کے بعد سے صالحہ سے میری کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ کیسی ہیں وہ؟ اور آپ کے بچے کتنے ہیں؟ اب تو کافی بڑے ہو گئے ہوں گے؟"

"جی ہاں۔" کرمو نے کہا۔ "عامر کوئی چودہ سال کا ہے اور ارجمند کوئی بارہ سال کی۔

بس دو ہی بچے ہیں اور سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مزے میں ہیں۔ صالحہ بھی ٹھیک ہیں۔ میں تو زیادہ تر باہر ہی رہتا ہوں۔ کوئی بیس برس کا عرصہ ہو گیا پاکستان سے گئے ہوئے۔ بس سال دو سال کے بعد ایک آدھ چکر ہو جاتا ہے کراچی کا۔"

"تو آپ نے بیوی بچوں کو بھی وہیں کیوں نہیں بلایا؟" سرفراز حسین نے اس سے پوچھا۔ "بیس برس تو بہت لمبی مدت ہوتی ہے۔ خاندان والوں کے بغیر تنہا اتنا لمبا عرصہ گزارنا تو واقعی کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"میں نے کئی بار صالحہ سے کہا۔" کرمو نے کہا۔ "لیکن وہ راضی نہیں ہوئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کی تعلیم کا مسئلہ ہے اور پھر وہاں بچے بھی اپنے ماحول سے بالکل کٹ کر رہ جائیں گے۔"

"ہاں۔" اچانک تہمینہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "صالحہ کے لئے بھی بہت سی مشکلات تھیں۔"

کافی رات گئے رخصت ہونے سے پہلے صرف چند منٹ کا وقفہ ایسا آیا جب تہمینہ اور کرمو دونوں بالکل اکیلے تھے۔

"آپ سے تنہائی میں بیٹھ کر کچھ باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا ہے۔" کرمو نے ہمت کر کے بہت آہستہ سے کہا۔

"واقعی؟" تہمینہ نے آہستہ سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا اب بھی اس کی کوئی ضرورت ہے؟"

"جی۔" کرمو سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ سوال ہی ایسا تھا۔

"اچھا تو پھر کل صبح دس بجے آ جانا۔" تہمینہ نے کہا۔ "میں گھر پر اکیلی ہوں گی۔"

گفتگو کے دوران کرمو ان لوگوں کو یہ بتا چکا تھا کہ پرسوں کی فلائیٹ سے وہ واپس سعودی عرب جا رہا ہے۔

کرمو سر جھکائے ہوئے کمرے سے باہر نکل آیا اور تہمینہ اور سرفراز سے رخصت ہوا۔ بچے تو پہلے ہی وہاں سے چلے گئے تھے۔ انہیں بھلا کرمو سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

سرفراز نے کافی اصرار کیا کہ وہ کرمو کو اس کے گھر تک اپنی گاڑی میں چھوڑ آئے گا لیکن کرمو نے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔

"کوئی دو قدم پر تو میرا گھر نہیں ہے سرفراز صاحب!" اس نے کہا۔ "فیڈرل بی ایریا میں رہتا ہوں۔ گھنٹہ بھر سے زیادہ لگ جائے گا' آپ کو جانے اور واپس آنے میں۔ اس کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں اطمینان سے بس سے چلا جاؤں گا۔"

اس رات کرمو بہت کم دیر کے لئے سو سکا۔ تہمینہ سے اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات نے دل کی دنیا کو جیسے تہہ و بالا کر ڈالا تھا۔ ملاقات اور باتیں۔ اتنی بہت سی باتیں۔ تہمینہ سے باتیں۔ کہیں اس نے خواب تو نہیں دیکھا تھا؟ اسے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ تہمینہ سے ملا ہے۔

اگلے دن ٹھیک دس بجے وہ تہمینہ کے گھر پر دوبارہ موجود تھا۔ اس کی دستک کے جواب میں تہمینہ نے دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گئی۔ اس نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"سرفراز کالج گئے ہوئے ہیں اور بچے کالج اور اسکول۔" تہمینہ نے بڑے پُروقار انداز میں اس سے کہا۔ "لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ میں اس ملاقات سے خوفزدہ ہوں یا اسے چھپانا چاہتی ہوں۔ نہیں' مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہاں' کہو کرمو! تم تنہائی میں مجھ سے کس لئے ملنا چاہتے تھے؟ اب تمہیں کیا کہنا ہے؟"

کرمو کو تو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔ واقعی اسے کیا کہنا تھا؟ شاید اتنا کچھ کہنا تھا کہ اس کے لئے ساری دنیا کے الفاظ ناکافی ہوں اور شاید کچھ بھی نہیں۔

"تہمینہ!" اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اس دن کے بعد سے تم مجھے کبھی ملیں ہی نہیں .... میں نے کتنا چاہا کہ تم سے ملاقات ہو جاتی .... مگر تم نہیں ملیں .... اور پھر تم لوگوں نے وہ محلّہ ہی چھوڑ دیا............" کرمو رک رک کر بے ربط سے جملے بول رہا تھا۔

"میں نہیں ملی؟" تہمینہ نے ایک زہرخند کے ساتھ کہا۔ "اور اس بات کا شکوہ اب تم بائیس تیئیس برس کے بعد کر رہے ہو؟ واہ رے کرمو واہ۔ ارے بھلے مانس' تم نے مجھ سے ملنے کی کوئی کوشش بھی کی؟ مجھ تک پہنچنے کی کوئی راہ نکالی؟ کسی ہمت کا مظاہرہ کیا؟ کیا تم نے؟ بس ٹک ٹک حالات کا تماشہ دیکھتے رہے اور پھر چپکے سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مدل ایسٹ بھاگ گئے' پیسے کمانے کے لئے؟"

کرمو کی آنکھیں حیرت کے مارے پھیل گئیں۔ تہمینہ کی زبان سے وہ جو کچھ سن رہا تھا وہ نہایت غیر متوقع تھا۔

"میں .... میں کیا کرتا تہمینہ؟" اس نے کمزور آواز میں کہا۔ "تمہارے ابا نے تو چاچا کو ذلیل کر کے اپنے گھر سے نکال دیا تھا............ پھر کیا گنجائش رہ گئی تھی؟"

"مجھے معلوم ہے۔" تہمینہ نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ ابا اور سلطان چاچا کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی میں نے اس کا ایک ایک لفظ سنا تھا اور پھر ابا نے گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔ مگر کرمو! اس میں کون سی نئی اور انوکھی بات تھی؟ میرے ابا اس معاشرے کے وہ پہلے باپ تو نہیں تھے جنہوں نے اپنی بیٹی کے من پسند رشتے کو ٹھکرایا تھا اور رشتہ لے کر آنے والوں کو ذلیل کیا تھا۔ یہ کہانی تو صدیوں پرانی ہے کرمو! مگر تمہیں کیا ہو گیا تھا؟ میں تو اس انتظار میں رہی کہ تم کچھ ہمت دکھاؤ' بہادری کا مظاہرہ کرو' خود ابا کے پاس جاؤ اور ان سے کہہ دو کہ تم ان کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ کیا کرتے وہ؟ گالیاں دے کر' دھکے دے کر' تمہیں بھگا دیتے لیکن میں جو تھی' تم نے مجھے تو آزمایا ہی نہیں۔ کرمو! تم نے نہ خود جرأت کا مظاہرہ کیا اور نہ مجھے اس کا موقع دیا۔ سچ تو یہ ہے کرمو کہ تمہارے اندر حوصلے کی کمی تھی۔"

کرمو کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ آج ایک طویل عرصے کے بعد اسے گزرے ہوئے وقت کے آئینے میں اپنی وہ شکل نظر آ رہی تھی جو اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ وہ ماضی کے آئینہ خانے میں ایک نقشِ حیرت بنا ہوا کھڑا تھا۔

"لیکن تم نے تو گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا' تہمینہ!" اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔ "میں تم سے ملتا تو کیونکر؟"

"ارے بھائی' میں نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ دنیا تو نہیں چھوڑ دی تھی۔" تہمینہ نے ہنس کر کہا۔ "تم نے کوئی کوشش کی مجھ سے ملنے کی؟ سینکڑوں راستے تھے کرمو! تم رابعہ چچی کو درمیان میں لا سکتے تھے۔ وہ تو ایک بہت نیک دل عورت تھیں۔ میں جانتی ہوں وہ ضرور تمہاری مدد کرتیں اور اگر یہ بھی مناسب نہ تھا تو تم ساجد بھائی سے بات کر سکتے تھے۔ وہ تمہیں مار تو نہیں ڈالتے اور ان سے بھی بات نہیں کر سکتے تھے تو تمہیں یہ تو معلوم ہی تھا کہ میں میٹرک کا امتحان دے رہی ہوں اور پرچے دینے کے لئے ضرور گھر سے نکلوں گی اور سینٹر تک جاؤں گی اور واپس بھی آؤں گی۔ کچھ عقل استعمال کی ہوتی تو مجھ سے ملاقات کون سی مشکل بات تھی؟"

کرمو کا دل خون ہوا جا رہا تھا۔ کاش .... کاش .... کاش تہمینہ نے اب یہ سب کچھ اس سے نہ کہا ہوتا۔ یہ سب کس قدر اذیت ناک اور ناقابلِ برداشت تھا۔

"اور جانتے ہو کرمو! اگر تم نے ہمت کی ہوتی' اگر تم نے واقعی مرد بن کر مجھ سے محبت کی ہوتی تو میں ساری دنیا کی مخالفت کے باوجود تم سے شادی کر لیتی۔ ابا اور امی چاہے

پھر زندگی بھر میری صورت نہ دیکھتے لیکن تم .... تم تو کسی پردہ نشین خاتون کی طرح روپوش ہو گئے۔ اس دن کے بعد سے تم نے پلٹ کر کبھی خبر بھی نہ لی۔ اگر محبت کی تھی کرمو تو محبت کا تحفظ کرنے کا حوصلہ بھی کیا ہوتا۔ تم نے تو مجھے بالکل ہی تنہا چھوڑ دیا۔"

تمینہ ذرا رکی' اس کی آواز میں گہری اداسی گھلنے لگی تھی۔ کرمو کا سر جھکا ہوا تھا۔

"اور پھر جب ہم لوگ عزیز آباد چلے گئے' میں نے کالج میں داخلہ لے لیا۔ چار سال تک میں اکیلی کالج آتی جاتی تھی۔ مجھے تو کہیں راستے گلی میں تمہاری پرچھائیں تک نہیں دکھائی دی کرمو! میں تو لڑکی ہو کر بڑے سے بڑا قدم اٹھانے کو تیار تھی مگر تم تو نہ چھوٹا نہ بڑا کوئی قدم بھی نہیں اٹھا سکے۔ تم نے سامان باندھا اور چل دیئے مڈل ایسٹ اور اب اتنے عرصے کے بعد تم مجھ سے یہ کہہ رہے ہو کہ میری تم سے ملاقات بھی نہیں ہوئی۔"

کرمو کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا رہا تھا۔ تمینہ کے ہونٹوں سے ٹپکنے والا سچائی کا زہر اس کی سماعت کے راستے اس کی نس نس میں اتر رہا تھا اور سارے وجود میں گھلتا جا رہا تھا۔

اس کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ اسے تو آج معلوم ہوا تھا کہ وہ یہ بازی اپنے ہاتھوں ہاری ہے۔ اسے کسی اور نے نہیں اس کی اپنی فطری کمزوری نے شکست دی ہے۔ جو شاید اسے اپنی مرحوم ماں سے ورثے میں ملی تھی جس نے حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے نہر میں کود کر جان دے دی تھی۔

اور تب .... تب کرمو کی آنکھوں سے بے ساختہ آنسو بہہ نکلے۔ اس نے بہت چاہا کہ تمینہ کے سامنے اپنے آپ کو اور زیادہ چھوٹا ثابت نہ کرے لیکن دل درد کی شدت سے پھٹا جا رہا تھا۔ کلیجہ تھا کہ شق ہوا جا رہا تھا۔

"آئی ایم سوری کرمو!" اچانک تمینہ نے رک کر اس کے دھواں دھواں چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز کسی غمناک سرگوشی کی طرح سرسرا رہی تھی۔ "شاید میں بہت تلخ ہو گئی تھی۔ مجھے معاف کر دینا۔ شاید اس میں میری کچھ غلطی بھی شامل تھی۔ میں بھی تو عملی طور پر کچھ نہیں کر سکی۔ بس تمہارے انتظار میں بیٹھی رہی۔"

"میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں تمینہ! صرف ایک بات۔" کرمو نے گلوگیر اور رقت آمیز آواز میں کہا۔ "شاید .... شاید مجھ میں یہ سب کچھ کرنے کی ہمت پیدا ہو جاتی جو تم کہہ رہی ہو' اگر تم کسی مزدور کی' کسی پلمبر کی' کسی بڑھئی کی' کسی لوہار کی بیٹی ہوتیں۔ مگر تم ایک سفید پوش خاندان کی بیٹی تھیں۔ مجھ جیسا نچلے درجے کا آدمی اس

حد تک آگے نہیں جا سکتا تھا۔ تمہارے ابا کے مکمل انکار کے بعد میں خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور ایک آخری بات اور تمینہ! اور وہ یہ کہ اس دن کے بعد سے آج تک میں تمہیں کبھی بھول نہیں سکا۔ تم شاید اس کا یقین نہ کرو لیکن سچ یہی ہے تمینہ! میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکا۔"

تمینہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں کے گوشے نم ہو رہے تھے اور اس کے چہرے پر نمودار ہونے والی باریک باریک جھریاں ایک دم سے جیسے بہت گہری ہو گئی تھیں۔

کچھ دیر تک کمرے کی فضا پر بڑی بوجھل خاموشی طاری رہی اور پھر آہستہ آہستہ دونوں کی آنکھیں خشک ہوتی گئیں۔

"بھول جاؤ ان سب باتوں کو کرمو!" ایک گہرے سکوت کے وقفے کے بعد تمینہ نے کہا۔ "جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اب تو ہم لوگ ان بھولی بسری باتوں کو صرف کتابی قصے کہانیوں کی طرح ہی یاد کر سکتے ہیں۔ ماضی کے مزاروں کا مجاور بننے میں کیا رکھا ہے؟ بس زندگی جیسی بھی ہے ٹھیک ہے۔ ہمیں خوش رہنا چاہئے اور بہتری کی توقع رکھنی چاہئے۔ مجھے' تمہیں' ساجد بھائی کو' صالحہ کو' سب کو اپنی اپنی مرضی کے خلاف زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا گیا لیکن جب ہم نے ایک بار اس زندگی کو قبول کر لیا تو بس پھر سارے گلے شکوے ختم۔ اب یہ ہماری زندگی ہے اور ہمیں اسی زندگی کے ساتھ جینا ہے۔"

"ساجد بھائی؟ صالحہ؟ کون صالحہ؟" اس نے چونک کر کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"شاید تمہیں یہ بات کسی نے کبھی نہیں بتائی کہ صالحہ اور ساجد بھائی ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔" تمینہ نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں۔" کرمو نے آہستہ سے کہا۔ یاخدا ابھی کتنے اور نشتر اس کے سینے میں پیوست ہونا تھے!

"ہاں کرمو!" تمینہ نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔ "لیکن ان کا انجام بھی ہم جیسا ہی ہوا۔"

"مگر کیوں؟" کرمو نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ اس عجیب و غریب اور انتہائی المناک انکشاف نے اس پر ایک اضطرابی کیفیت طاری کر دی تھی۔ "میرا مطلب ہے ساجد بھائی تو پڑھے لکھے تھے۔ لائق فائق تھے۔ ان میں کون سی کمی تھی؟ کیا تمہارے گھر والے تیار نہیں تھے یا صالحہ کے گھر والے..........."

"صالحہ کے گھر والے..........." تہمینہ نے آنکھیں جھکا کر جواب دیا۔ "اس نے بہت کوشش کی لیکن وہ لوگ راضی نہیں ہوئے۔ تم تو جانتے ہو' وہ کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ صالحہ کے باپ دکاندار تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ساجد بھائی اس وقت کالج میں تھے۔ جب ہماری امی نے صالحہ کے لئے ساجد بھائی کا پیغام دیا تو صالحہ کے گھر والوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ ایک غریب اسکول ماسٹر کے بیٹے سے اپنی بیٹی کی شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں کوئی مالدار گھرانا چاہئے تھا۔"

"لیکن ساجد بھائی تو پڑھ رہے تھے۔" کرمو نے کہا۔ "ان کا مستقبل تو روشن تھا۔ وہ تو انجینئر بن جانے کے بعد..........."

"امی نے یہ ساری باتیں ان لوگوں کو سمجھائی تھیں۔" تہمینہ نے کہا۔ "اور جواباً صالحہ کے گھر والوں نے یہ کہا تھا کہ ساجد کو انجینئرنگ کی پڑھائی مکمل کرنے میں اور اس کے بعد نوکری تلاش کرنے میں لمبا عرصہ لگ جائے گا۔ وہ لوگ اتنا انتظار نہیں کریں گے۔ یہ بات چیت اس وقت چل رہی تھی جب تمہیں مڈل ایسٹ گئے ہوئے دو ڈھائی سال ہو چکے تھے اور تم وہاں خوب کما رہے تھے۔ جب تم کراچی میں تھے تب بھی تمہاری اور سلطان چچا کی مالی حالت ہم لوگوں کے مقابلے میں بہت بہتر تھی اور تمہارے مڈل ایسٹ جانے کے بعد تو پھر حالات بالکل ہی بدل گئے۔ تمہارے گھر میں پیسے کی ریل پیل شروع ہو گئی۔ میری شادی سرفراز سے ہو گئی اور رابعہ خالہ نے تمہارے لئے صالحہ کو پسند کر لیا۔ صالحہ کے گھر والے تو ادھار کھائے بیٹھے تھے انہوں نے فوراً رشتہ منظور کر لیا۔"

"ایک انجینئر کے رشتے کو چھوڑ کر..........؟" کرمو نے دبی زبان سے کہا۔

"جب تمہاری اور صالحہ کی شادی ہوئی ہے تو اس وقت ساجد بھائی کو انجینئرنگ کا امتحان پاس کئے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا اور انہیں کوئی ڈھنگ کی نوکری نہیں مل سکی تھی۔" تہمینہ نے بتایا۔ "دو ایک پارٹ ٹائم جاب ملے تھے۔ بہت کم پیسوں کے اور اس وقت تک سلطان چچا سوسائٹی میں کوٹھی بنوا چکے تھے۔ رابعہ خالہ نئی کوٹھی میں منتقل ہو چکی تھیں۔ تم لوگوں کی دولت اور کمائی کے افسانے سارے جاننے والوں میں مشہور تھے۔ چنانچہ صالحہ کے والدین نے ایک غریب اسکول ماسٹر کے بے روزگار انجینئر بیٹے کے مقابلے میں ایک مالدار پلمبر کے رشتے کو منظور کر لیا جو مڈل ایسٹ میں بیٹھا ہوا خوب کمائی کر رہا تھا اور اس طرح صالحہ کی مرضی کے خلاف اس کی شادی تم سے کر دی گئی۔"

"لیکن .... وہ شادی سے انکار کر سکتی تھی۔" کرمو نے کہا۔ "وہ ایک پڑھی

لکھی لڑکی تھی اور ساجد بھائی بھی۔ وہ بھی خاموش رہے؟ انہوں نے بھی کچھ نہیں کیا۔"

"انہوں نے صالحہ کے سامنے تجویز رکھی تھی کہ وہ دونوں خاموشی سے نکاح کر لیں اور بعد میں والدین کو بتا دیں۔" تہمینہ نے کہا۔ "ساجد بھائی تو ہر طرح سے صالحہ کو اپنانے کے لئے تیار تھے لیکن صالحہ اپنے اندر اتنی جرأت پیدا نہیں کر سکی۔ وہ اپنے خاندان سے' ماحول سے' سماج سے خوفزدہ تھی۔ وہ اتنا بڑا قدم اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوئی۔ وہ اپنے دکھوں کے سمندر کو اپنے سینے میں سمیٹے ہوئے خاموشی سے اپنے گھر سے رخصت ہو کر تمہارے گھر آ گئی۔ صالحہ کے گھر والوں نے ہم سب لوگوں کو شادی میں بلایا تھا لیکن صرف امی شریک ہوئی تھیں اور وہ بھی اس لئے کہ میری شادی پر صالحہ کی امی نے تحفے میں جو رقم دی تھی اسے واپس لوٹا سکیں۔ اگر یہ مسئلہ نہ ہوتا تو وہ بھی نہ جاتیں۔"

"مجھے اس بارے میں کبھی کسی نے کچھ نہیں بتایا۔" کرمو نے جیسے کسی گہرے کنویں کے اندر سے بولتے ہوئے کہا۔

"اچھا ہی کیا۔" تہمینہ نے کہا۔ "ان باتوں میں اب رکھا ہی کیا ہے؟ ہم لوگوں کی جوانیاں گزر گئیں کرمو! ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ اب گئی گزری باتوں کے بارے میں' اپنے بارے میں کیا سوچنا ہے؟ اب تو ہمیں اپنے بچوں کے بارے میں سوچنا ہے۔ ان کے مستقبل کے بارے میں سوچنا ہے اور اپنے والدین سے زیادہ بہتر والدین بن کر دکھانا ہے۔ جو غلطیاں ہمارے والدین نے کیں انہیں ہم نہ دہرائیں۔ بس اب ختم کرو اس قصے کو۔ ارے ہاں' دیکھو میں باتوں باتوں میں چائے لانا تو بھول ہی گئی۔ میں نے تمہارے آتے ہی پانی رکھ دیا تھا ابلنے کو۔ اب تک تو سارا پانی پک کر اڑ گیا ہو گا..........." اور وہ جلدی سے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ جب کچھ دیر بعد وہ دوبارہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کی پیالیاں تھیں۔

"سرفراز حسین صاحب کیسے آدمی ہیں؟" کرمو نے دبی زبان سے پوچھا۔ "کیا انہیں ہمارے بارے میں..........؟"

"نہیں کرمو!" تہمینہ نے کہا۔ "کسی کو بھی کچھ نہیں معلوم۔ وہ ساری بات تمہارے گھر سے شروع ہو کر ہمارے گھر پر ختم ہو گئی اور پھر معاملہ ہی کون سا لمبا چوڑا تھا۔ چند ماہ میں سب کچھ شروع ہو کر ختم بھی ہو گیا تھا اور جہاں تک میرے شوہر سرفراز کا تعلق ہے تو وہ بہت اچھے انسان ہیں۔ مجھے بلاشبہ ان کی رفاقت پر فخر ہے۔ ہم دونوں بہت اچھی اور

پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمارے مالی حالات بھی بس ٹھیک ٹھاک ہیں۔"
"اور .... اور ساجد بھائی؟" کرمو نے پوچھا۔ "وہ اور ان کی بیوی؟"
"مزے میں ہیں۔" تہمینہ نے مسکرا کر کہا۔ "اپنے بچوں کے ساتھ مگن ہیں۔ ساجد بھائی کی بیوی بہت اچھی ہے اور وہ اپنی بیوی کو چاہتے بھی بہت ہیں۔ خوشحال ہیں۔ اچھی ملازمت ملی ہوئی ہے اور وہ سارے پرانے قصوں کو بھول چکے ہیں۔ صالحہ بھی یقیناً سب کچھ بھول چکی ہو گی۔ میری تو اس سے ایک زمانے سے ملاقات نہیں ہوئی۔"
"نہیں تہمینہ!" کرمو یہ الفاظ زبان سے ادا نہ کر سکا۔ یہ الفاظ صرف اس کے دل میں ابھرے اور دب گئے۔ "صالحہ کچھ بھی نہیں بھولی۔ اسے سب کچھ یاد ہے۔"
"اچھا، اب میں چلتا ہوں۔" کرمو نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "کل میری فلائٹ ہے۔ واپس سعودی عرب جا رہا ہوں، پھر آؤں گا تو ملاقات ہو گی۔ تم کبھی سرفراز حسین اور بچوں کو لے کر ہمارے گھر آؤ۔"
"ضرور آؤں گی۔" تہمینہ نے کہا۔ "صالحہ سے بھی ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔ پھر تم بھی اسے اور بچوں کو لے کر ہمارے گھر آنا۔"
کرمو جب تہمینہ کے گھر سے باہر نکلا تو اپنے آپ کو ایک مکمل طور پر تباہ شدہ انسان پا رہا تھا۔ آج کا دن اس کے لئے بڑے دردناک، مرگ آفریں اور ہلاکت خیز انکشافات کا دن تھا۔
کاش .... کاش اس وقت اس نے ہمت سے کام لیا ہوتا! وہ اتنا زیادہ احساس کمتری کا شکار ہو کر ہتھیار نہ ڈال دیتا۔ تہمینہ تو اس کے ساتھ بہت دور تک جانے کے لئے تیار تھی لیکن اس نے تو اسے ایک قدم بھی ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی۔ بس جو کچھ ہوا اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کر، ناگزیر جان کر قبول کر لیا۔ اس نے تو لڑے بغیر ہی ہار مان لی اور پھر ساری زندگی ہجر کی غمناک کیفیت میں سرشار رہا۔ تہمینہ کی تصویر کے ہر نقش کو فروزاں رکھنے کے لئے اس نے اپنے دل کے سارے رنگ اس میں صرف کر دیئے۔ وہ تو اس کی مادی رفاقت، حقیقی رفاقت حاصل کر سکتا تھا لیکن یہ موقع اس کی کم فہمی کی نذر ہو گیا۔
اور صالحہ .... اف وہ ظالم اور سنگ دل عورت .... محبت میں ناکامی نے اسے کس قدر سفاک، خود غرض اور بے رحم بنا دیا تھا۔
شادی کے تقریباً سولہ برس کے بعد آج پہلی بار کرمو کی نگاہوں کے سامنے سے پردہ اٹھا تھا اور اسے صالحہ کی اصل شکل بالکل واضح طور پر نظر آئی تھی۔ شادی کے دن سے

لے کر آج تک کے اس کے تمام رویوں کی حقیقی وجہ اسے آج معلوم ہوئی تھی۔
وہ ساجد کو تو نہیں اپنا سکی تھی لیکن اس نے کرمو کو بھی نہیں اپنایا۔ محرومی اور مایوسی کا شکار ہونے کے بعد وہ خود پرستی اور خودغرضی اور اذیت پسندی کا پیکر بن گئی تھی۔ اس نے اس شخص کو ساری زندگی دردناک اذیت میں مبتلا رکھا جسے اس کے والدین نے زبردستی اس کا شوہر بنا دیا تھا۔ وہ اپنے اندر اتنی ہمت تو پیدا نہیں کر سکی تھی کہ ساجد کی تجویز کو قبول کر کے اس کے ساتھ خفیہ طور پر شادی کر لے۔ اس میں پورے سماج کے ساتھ لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا لیکن وہ اس شخص سے ضرور لڑ سکتی تھی جو ساجد کے بجائے اس کا شوہر بن بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ساری ناکامیوں، محرومیوں اور حسرتوں کا انتقام اس شخص سے لے لیا اور وہ اسے مسلسل ایذا پہنچاتی رہی۔
"تو یہ ہے میری بیوی صالحہ۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر دل ہی دل میں کہا۔ "واہ ری عورت واہ۔"
محبت میں ناکام تو کرمو بھی ہوا تھا لیکن جب صالحہ سے اس کی شادی ہو گئی تو اس نے اسے ایک سماجی اور قانونی ذمہ داری سمجھ کر قبول کر لیا تھا اور اس نے صالحہ سے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی نفرت نہیں کی تھی بلکہ وہ تو اس کی ایذا پسندانہ خواہشوں کی قربان گاہ پر اپنے آپ کو مسلسل بھینٹ چڑھاتا رہا تھا۔ وہ اس کی بیوی جو تھی، اس کی ذمہ داری جو تھی۔
لیکن صالحہ کبھی بھی اس کی بیوی نہیں بن سکی تھی۔ وہ صرف جسمانی طور پر اس کی بیوی تھی، اس کے بچوں کی ماں تھی اور اس کا حق تھا کہ اس مرد کو جس کے پلے اسے باندھ دیا گیا تھا، ساری دنیا کی نعمتوں کے مطالبوں سے کچلتی رہے۔
"وہ مجھے قتل کرتی رہی۔" کرمو کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ "وہ مجھے لمحہ لمحہ قتل کرتی رہی اور مجھے اس کا علم بھی نہ ہو سکا۔ اس نے ساری زندگی مجھے قتل کیا اور میں قتل ہوتا رہا۔ میں اس کی روح کے اس رِستے ہوئے ناسور کو کبھی نہ دیکھ سکا۔ جس کا علاج اس کے نزدیک مجھے قتل کرتے رہنے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ تہمینہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش ہے۔ ساجد اپنی بیوی کے ساتھ خوش ہے اور میں .... میں اور صالحہ .... میں اور صالحہ............" اس کے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا دماغ پھٹ جائے گا۔
اس نے تہمینہ کو صالحہ کے رویے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ تہمینہ تو یہی سمجھ

رہی تھی کہ جس طرح اس نے، ساجد نے، حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا، اسی طرح
نے بھی حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو گا اور اپنے مالدار شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشی
محبت کی زندگی بسر کر رہی ہو گی لیکن وہ تہمینہ کو بتاتا بھی کیا؟ صالحہ کے تمام رویوں کو
نے آج ہی پوری طرح سمجھا تھا۔

اگلے دن وہ واپس سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ اپنی زخمی روح اور نئے صدموں
بوجھ سے نڈھال دل کے ساتھ وہ ایک بار پھر مسموم فضاؤں میں کڑی مشقت جھیلنے
لئے جا رہا تھا۔

☆======☆======☆

1987ء کے وسط میں ایک روز کام کرتے کرتے اچانک سائیٹ پر کرمو کی طبیعت
خراب ہو گئی۔ اس پر بے ہوشی کا سا دورہ پڑا اور گر پڑا۔ اسے فوراً ایمبولنس کے ذریعہ
وہاں سے اٹھا کر سائیٹ کے چھوٹے سے ہسپتال میں لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے اس
معائنہ کیا اور تھکن اور گرمی کو اس کی اس حالت کا سبب قرار دے کر اسے تین دن
آرام کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی اسے کچھ دوائیں بھی دے دیں۔

کرمو نے تین دن اپنے اس کمرے میں گزارے جہاں وہ دو دوسرے آدمیوں
ساتھ رہتا تھا۔ وہ اب اپنے آپ کو بالکل ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا تھا اور اسے
تکلیف نہیں تھی۔

"اب اتنا زیادہ کام مت کیا کرو کرم دین!" اس کے ایک روم میٹ حیدر علی نے
اس سائیٹ پر گزشتہ دو سال سے اس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ حیدر علی پاکستانی تھا اور گلگت کا
والا تھا۔ "تم بہت زیادہ اوور ٹائم کرتے ہو۔ اب وہ عمر نہیں رہی تمہاری بھائی۔ یہ تو ڈھلتی
عمر ہے۔ اس کو بچا بچا کر اور سنبھال سنبھال کر خرچ کرو۔ بے دردی سے لٹاؤ گے تو خزانہ
جلد خالی ہو جائے گا۔"

کرمو نے حیدر علی کی باتیں سنیں اور آہستہ سے مسکرا دیا۔ کاش کبھی اس کی بیوی
بھی اس سے یہ بات کہی ہوتی۔

کوئی چھ ماہ تک تو سب ٹھیک ٹھاک چلتا رہا لیکن اس کے بعد ایک روز پھر اچانک کام کے
دوران کرمو نیم بے ہوشی کے عالم میں گر پڑا۔ یہ اسے دوسرا دورہ تھا اور اس بار اس کی
کچھ زیادہ ہی خراب ہو گئی۔ اسے فوری طور پر سائیٹ کی ڈسپنسری میں پہنچا دیا گیا۔ ڈاکٹر
کا تفصیلی معائنہ کر کے آرام کا مشورہ دیا اور دوا دے دی لیکن ساتھ ہی اس نے انتظامیہ

کر دیا کہ مریض کو تفصیلی چیک اپ کے لئے کسی بڑے ہسپتال بھیجنا ضروری ہے۔
چنانچہ اگلے ہی دن کرمو کو قریب ترین شہر دمام بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کر دیا گیا۔ جہاں
اسے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا اور پھر ٹسٹوں کا ایک طویل اور تھکا دینے والا سلسلہ شروع ہو
گیا۔ کمپنی کے ڈاکٹر نے بھی اپنی رپورٹ مریض کے ساتھ ہی بھیج دی تھی۔

1988ء کا آغاز تھا جب کرمو کو ڈاکٹروں نے یہ بتایا کہ اس کو بلڈ کینسر، یعنی خون کے
سرطان کا عارضہ ہے۔

کمپنی کے قواعد کے مطابق اسے علاج معالجے کی سہولت فراہم کی گئی اور جدہ کے ایک
بڑے ہسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں اس کا چھ ماہ تک علاج ہوتا رہا لیکن ڈاکٹروں نے اسے بتا
دیا تھا کہ اسے مستقل علاج کرواتے رہنے کی ضرورت ہے جسم کے خون کی تبدیلی کے بار بار
عمل کو اب زندگی بھر جاری رہنا تھا لیکن صورت حال کچھ زیادہ امید افزا نہیں تھی۔

کرمو نے اپنی بیماری کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں لکھا۔ وہ خاموشی سے اپنا دکھ تنہا ہی
جھیلتا رہا۔ کمپنی نے میڈیکل گراؤنڈز پر اس کی ملازمت ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ اب کام کرنے
کے قابل نہیں رہا تھا۔ کمپنی کی جانب سے اسے ایک بہت بڑی رقم کا ڈرافٹ دیا گیا جو اس کے
جملہ واجبات نیز علاج معالجے کے لئے دی جانے والی رقم پر مشتمل تھا اور اسے ملازمت سے
فارغ کر دیا گیا۔

دسمبر 1988ء میں کرمو واپس کراچی آ گیا۔ وہ بالکل اچانک آ گیا تھا۔ اس نے گھر والوں کو
اپنی آمد کی کوئی اطلاع نہیں دی تھی۔ صالحہ اسے اتنے بہت سارے ساز و سامان کے ساتھ ٹیکسی
سے اترتے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"ارے .... تم نے اپنے آنے کی اطلاع بھی نہیں دی؟" اس نے حیرت سے کہا۔
"میں ڈرائیور کو گاڑی دے کر ایئرپورٹ بھیج دیتی۔"

"کیا فرق پڑتا ہے؟" اس نے ایک مردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں ٹیکسی سے ہی آ
گیا۔"

صالحہ کو جب یہ پتہ چلا کہ وہ اب مستقل طور پر واپس آ گیا ہے تو وہ سخت جز بز ہوئی۔ "یہ
تم نے کیا کر ڈالا؟ کیسی سخت حماقت کی ہے تم نے؟ کمال کر دیا۔ اتنے اچھے لگے لگائے جاب کو
چھوڑ کر چلے آئے۔ اب آخر تم یہاں کرو گے کیا؟"

"میں خود نہیں آیا ہوں۔" اس نے قدرے ناگواری کے ساتھ کہا۔ "کمپنی والوں نے
میری ملازمت ختم کر دی ہے؟"

"تو کسی دوسری کمپنی میں ملازمت ڈھونڈ لیتے۔" صالحہ نے فوراً کہا۔ "آخر اتنے عرصے سے وہاں کام کر رہے ہو۔ کیا دوسری جگہ کام کا بندوبست نہیں کر سکتے تھے؟ اور کمپنی نے تمہاری ملازمت کیوں ختم کر دی؟"

"طبی وجوہات کی بنا پر۔" اس نے جواب دیا۔ "میں اب بیمار رہنے لگا ہوں۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اب میں زیادہ محنت کا کام نہیں کر سکتا۔ اس لئے کوئی اور کمپنی بھی مجھے ملازمت نہیں دیتی؟"

"لیکن تمہیں کیا ہوا ہے؟" صالحہ نے اس کے سراپا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "اچھے خاصے تو نظر آ رہے ہو؟"

"کام کرتے کرتے بے ہوشی کے دورے پڑتے ہیں۔" اس نے صرف آدھی سچائی بیان کی۔ "ڈاکٹروں نے کافی علاج کیا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا اور تب کمپنی والوں نے میری چھٹی کر دی۔"

"خیر اب ہم اس بارے میں بعد میں تفصیل سے بات کریں گے۔" صالحہ نے کہا۔ "فی الحال تو مسئلہ تمہارے رہنے کا ہے۔ اوپر والی منزل میں تو بچوں کے کمرے ہیں اور دردانہ اعجاز رہ رہے ہیں۔ نیچے لے دے کر صرف ایک گیسٹ روم خالی ہے لیکن وہ تو مہمانوں کے لئے ہے۔ عنقریب اعجاز کے بہن بہنوئی لاہور سے آنے والے ہیں۔ کوئی مہینہ بھر ٹھہرنے کا ارادہ ہے ان کا یہ بالکل بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ گھر کا کوئی آدمی گیسٹ روم میں رہے۔ گیسٹ روم تو مہمانوں کے لئے رہنا چاہئے۔ خیر اب کچھ نہ کچھ انتظام تو کرنا ہی ہو گا۔"

اور انتظام یہ کیا گیا کہ نو فٹ لمبے اور نو فٹ چوڑے اسٹور کے زیادہ تر سامان کو اوپر کی منزل پر پہنچا دیا گیا اور وہاں کرمو کے لئے ایک بستر لگا دیا گیا اور کچھ فرنیچر ڈال دیا گیا۔ ہزار گز کی دو منزلہ کوٹھی میں یہی کچھ اس کے حصے میں آیا۔

کرمو نے اپنی اصل بیماری کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ کیا ہمدردی ہو سکتی ہے مجھ سے؟ اسے تو بس یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ اب مزید پیسے کہاں سے آئیں گے؟ نکلا دروازہ تو بند ہو گیا ہے! تو کیا میں تہمینہ سے مل کر اسے بتا دوں؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ بتا دوں اسے؟ کون لگتی ہے وہ میری؟ بیوی ہے؟ کون ہے؟ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ میں اپنے ذاتی مصائب میں اس کو گھسیٹنے کی کوشش کروں؟ نہیں کسی سے کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کسی کا مسئلہ نہیں ہے۔ یہ صرف میرا مسئلہ ہے۔

کراچی آنے کے ایک ہفتے کے بعد اس نے ایک معروف فزیشن سے رجوع کیا اور

اپنی تمام رپورٹیں وغیرہ بھی دکھائیں۔ ڈاکٹر نے اس کے متعدد ٹیسٹ کئے اور چند روز کے بعد دوبارہ بلایا۔ کرمو جب دوبارہ اس کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر نے اس سے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ اور کون آیا ہے مسٹر کرم دین؟ میرا مطلب ہے آپ کی وائف یا کوئی اور رشتے دار؟"

"میں تنہا ہوں ڈاکٹر صاحب۔" کرمو نے جواب دیا۔ "میرے ساتھ کوئی نہیں ہے اور آپ کو جو کچھ کہنا ہے بے دھڑک کہئے۔ جب آدمی کو معلوم ہو جائے کہ اسے کینسر ہے تو پھر چھپانے کے لئے کچھ نہیں رہ جاتا۔"

"تو پوزیشن یہ ہے مسٹر کرم دین کہ آپ کے جسم کو جلدی دوبارہ تبدیلی خون کی ضرورت ہے۔ آپ نے وہاں سے واپس آنے میں جلدی کی۔ آپ کو چاہئے تھا کہ آپ کراچی آنے کے بجائے کچھ عرصے کے لئے یورپ یا امریکہ چلے جاتے۔ وہاں' یہاں کے مقابلے میں زیادہ بہتر سہولتیں موجود ہیں۔ علاج تو ہم بھی کر لیں گے لیکن بات صرف جدید ترین ٹیکنالوجی اور سہولتوں کی ہے۔ خیر تو اب خون کا بندوبست کرنا ہو گا اور میرا خیال ہے کہ جنوری کے اواخر میں آپ کا خون تبدیل کر دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" کرمو نے کہا۔ "جیسا آپ مناسب سمجھیں' میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

"تو پھر ایک ہفتے کے بعد مجھ سے رابطہ قائم کیجئے گا۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو پے منٹ کے بارے میں بھی بتا دوں گا۔"

ایک ہفتے کے بعد اس نے ڈاکٹر کو فون کیا اور ڈاکٹر نے اسے اگلے دن بلا لیا۔ ساتھ ہی اسے اخراجات وغیرہ کا تخمینہ بھی بتا دیا۔ اگلے روز کرمو رقم لے کر ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا۔

"آج اٹھارہ تاریخ ہے کرم دین صاحب!" ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ بائیس تاریخ کی صبح کو آ جائیے۔ آپ کو داخل کر لیا جائے گا اور پھر آپ کا خون تبدیل کیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" کرمو نے کہا۔ "میں آ جاؤں گا۔"

"لیکن آج بھی آپ اکیلے ہی آئے ہیں؟" ڈاکٹر نے کہا۔ "کوئی اور آپ کے ساتھ نہیں ہے؟"

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" کرمو نے کہا۔ "میں اس دن بھی اکیلا ہی آؤں گا۔ میں کسی کو اپنے ساتھ لانا نہیں چاہتا۔"

"لیکن کرم دین صاحب! آپ کو سمجھنا چاہئے۔"

"میں سمجھ رہا ہوں ڈاکٹر صاحب!" کرمو نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں

آپ کو اپنے گھر کا پتہ اور فون نمبر وغیرہ سب دے دیتا ہوں۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو آپ میرے لواحقین کو مطلع کر دیجئے گا۔"

"آپ کی مرضی۔" ڈاکٹر نے شانے اچکا کر کہا۔ "جب آپ چاہیں' یہ آپ کا پرابلم ہے۔"

کرمو ڈاکٹر کے پاس سے چلا آیا۔ واقعی یہ اس کا پرابلم ہے اس کا ہر پرابلم اس کا اپنا پرابلم تھا۔ وہ کسی کو اس میں شریک نہیں کر سکتا تھا۔

کلینک میں کئی دن رہنے کی ضرورت تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ گھر والوں کو اپنی اس عدم موجودگی کے بارے میں کیا بتائے گا لیکن کرمو نے اس سوال کا جواب بھی سوچ لیا۔

ہسپتال جانے سے پہلے وہ صالحہ کو بتا دے گا کہ وہ چند روز کے لئے حیدر آباد جا رہا ہے۔ اپنے کسی دوست کے پاس۔ صالحہ کو اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ گھر میں کوئی بھی اس سے جرح نہیں کرے گا۔

تو اس مسئلے کا حل بھی نکل آیا۔ اب اسے بائیس تاریخ کا انتظار تھا۔ جس کی صبح کو اسے کلینک میں داخل ہونا تھا۔ داخلے کے تمام انتظامات اس نے پہلے ہی مکمل کروا دیئے تھے۔ رقم وغیرہ بھی اس نے سب جمع کرا دی تھی۔

اکیس جنوری کو اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک بار تہمینہ کے گھر جائے اس سے' اس کے شوہر سے اور اس کے بچوں سے ملاقات کرے۔ کون جانے پھر کب دوبارہ ملاقات نصیب ہو اور نصیب بھی ہو یا نہیں۔

دوپہر کے بعد سب لوگ گھر پر ہی ہوتے تھے چنانچہ سہ پہر کو وہ گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ بس اسٹاپ پر آ کر اس نے صدر جانے والی بس لی اور صدر پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ [illegible] جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا اور بس میں کافی رش تھا اور اب تو رش بڑھتا ہی جاتا چنانچہ اس نے دوسری بس کا انتظار نہیں کیا اور پہلے سے بھری ہوئی بس میں جگہ بنا کر داخل ہو گیا۔

کئی لوگ فٹ بورڈ پر کھڑے ہوئے تھے۔ کرمو کچھ زیادہ اندر کی طرف آ گیا اور فٹ بورڈ کے قریب بس کی چھت کا ڈنڈا پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ ہی دیر کے بعد بس صدر اور لائنز [illegible] سے نکل کر شارع فیصل پر آ گئی۔

اور اب صاف سیدھی اور ہموار سڑک پر بس بڑی تیزی کے ساتھ بھاگی چلی جا رہی تھی۔ کرمو بالکل فٹ بورڈ کے پاس کھڑا ہوا تھا اور بے دلی کے ساتھ بھاگتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہا

تھا۔

اچانک اس پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور بس کے ڈنڈے پر اپنی گرفت قائم رکھی لیکن ہاتھ پیر بے جان ہوئے جا رہے تھے۔ اس کے لئے اپنے آپ کو کھڑا رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا رہا تھا اور پھر اس کو نہیں معلوم کہ کب بس کا ڈنڈا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ نیم غنودگی کے عالم میں تیز رفتاری کے ساتھ بھاگتی ہوئی بس سے نیچے گر پڑا۔ اس کا جسم فٹ بورڈ سے لڑھکتا ہوا' دروازے سے باہر نکل کر سڑک پر گرا اور اس کے دماغ میں دنادن گولے سے چھوٹنے لگے۔ دل کی دھڑکن ڈوب رہی تھی۔ چند لمحوں میں سب کچھ ختم ہونے والا تھا۔

جب مشعلِ ہستی کے بجھنے کی گھڑی آئے
یادوں کے دریچے پر تم جا کے صدا دینا
چپکے سے بلا لینا اس ماہِ فروزاں کو
پھر مشعلِ ہستی کو ہولے سے بجھا دینا

کرمو نے چند ثانیوں کے لئے آخری سنبھالا لیا۔ اس نے اپنے ڈوبتے ہوئے دماغ کی ساری مخفی قوتوں کو موت کے خلاف ان چند لمحوں کے آخری معرکے کے لئے مجتمع کر لیا اور یادوں کے دریچے پر آخری بار صدا دی' اس ماہِ فروزاں کو چپکے سے بلا لیا اور تہمینہ کا دمکتا ہوا مانوس 'کتابی' محبت بھرا چہرہ اس کی بجھتی ہوئی نگاہوں کے سامنے نمودار ہوا۔ چشم تمنا اس آخری بارِ الم کو تادیر نہ سہہ سکی اور یہ دید کا جھلمل منظر پل دو پل میں نظروں سے نہاں ہو گیا۔ مشعلِ ہستی ہولے سے بجھ گئی اور اب سب کچھ خاک تھا۔ ہر منظر خاک تھا۔

جس وقت کرمو بس سے گرا تو اس کی جیب میں رکھا ہوا پرس جس میں کچھ رقم کے علاوہ اس کا شناختی کارڈ بھی رکھا ہوا تھا جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اچھل کر اس کی جیب سے باہر نکلا اور دور جا کر ایک جھاڑی کے پاس گر گیا۔ بس میں ایک شور مچ گیا تھا۔ بس رک گئی تھی اور مسافر جلدی جلدی اتر کر اس شخص کی طرف بھاگ رہے تھے جو شاید بیمار تھا اور اچانک چلتی بس سے گر پڑا تھا۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر بھی اتر آئے تھے۔ سامنے ہی پولیس چوکی تھی۔ پولیس کے دو کانسٹیبل فوراً ہی موقعہ واردات پر آ گئے۔

بس سے اترنے والے لوگوں میں سے ایک نے فوراً ہی اس پرس کو دیکھ لیا تھا جو کرمو کی جیب میں سے نکل کر دور جھاڑی میں جا پڑا تھا۔ افراتفری سے فائدہ اٹھاتے

ہوئے اس نے چپکے سے اس پرس کو پہلے تو اپنے جوتے کے نیچے دبا لیا پھر چند منٹ بعد موقع پاکر اسے اٹھایا اور وہاں سے نکل گیا۔

سڑک کے کنارے کرمو کی خون آلود لاش پڑی تھی اور پولیس والے اپنی کارروائی کر رہے تھے۔

متوفی کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جس سے اس کی شناخت میں مدد مل سکتی۔ ضروری ابتدائی کارروائی کے بعد لاش کو سول ہسپتال کے مردہ خانے میں پہنچا دیا گیا۔

اگلے دن یعنی 22 جنوری 1989ء کے اخبارات میں ایک نامعلوم شخص کے شارع فیصل پر چلتی ہوئی بس سے گر کر ہلاک ہونے کی مختصر سی دو سطری خبر شائع ہوئی۔

اس طرح کرم دین عرف کرمو کی یہ المناک کہانی جس کا آغاز 1962ء میں ملتان کے ایک نواحی گاؤں سے ہوا تھا۔ 21 جنوری 1989ء کو کراچی میں شارع فیصل پر اپنے انجام کو پہنچی۔ وہ زندگی بھر قتل ہوتا رہا لیکن کبھی اپنے قاتلوں سے نفرت نہ کر سکا۔ کرم دین کی لاش تین دن تک سول ہسپتال کے مردہ خانے میں رکھی رہی اور پھر اس کے لواحقین نے اسے تلاش کر لیا اور ضروری کارروائی کے بعد لے گئے۔

کرمو کی تجہیز و تکفین کے کئی دن بعد جب صالحہ نے اس کے کاغذات وغیرہ کی تلاشی لی تب اس کی میڈیکل رپورٹوں اور دوسرے کاغذات کے ذریعے اس پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ اسے تبدیلی خون کے لئے ہسپتال میں داخل ہونا تھا لیکن کرمو کی زندگی میں 22 جنوری 1989ء کی تاریخ کبھی نہ آسکی۔

کرمو نے صالحہ کو اپنی بیماری کے بارے میں ہسپتال میں داخل ہونے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

اور اچانک صالحہ کی ساری عمر کی محرومیاں، ناکامیاں، تلخیاں، زیادتیاں، ایذا رسانیاں ایک بھیانک احساسِ جرم کی شکل اختیار کر کے اس کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ اس دن زندگی میں پہلی بار صالحہ نے اپنے آپ سے نفرت کی اور اسے اپنے وجود سے کراہت محسوس ہوئی۔

اس نے اپنے مرحوم شوہر کے پلنگ کی پٹی پر اپنا بوجھل سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆======☆======☆

پانی

اس نامعلوم شخص کی کہانی جو اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق حیدر آباد میں زنانہ ہسپتال کے سامنے بس کے انتظار میں کھڑا تھا اور دل کا دورہ پڑنے سے ہلاک ہو گیا۔

(20 جنوری 1989ء)

آج بھی سارا دن انتظار کرتے کرتے گزر گیا تھا اور نور احمد کو مایوسی اور ناکامی کے علاوہ کچھ اور نہیں حاصل ہوا تھا۔

اس کے کان برابر ایک خاص آواز کے منتظر تھے اور یہ وہ آواز تھی جو تمام ہی قیدیوں کے لئے ایک نوید مسرت' ایک مژدہ جاں فزا کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس آواز کو سنتے ہی آنکھوں کی روشنی جیسے تیز سی ہو جاتی تھی' دل کی دھڑکنوں میں ایک نغمگی گھل جاتی تھی اور سانسوں کو خود بخود جیسے ایک نیا آہنگ مل جاتا تھا۔ جس قیدی کے لئے بھی یہ آواز لگائی جاتی تھی وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فوراً اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور اپنے چہرے پر ایک ایسی مسکراہٹ لئے ہوئے' جو اس کی روح کی گہرائیوں میں سے پھوٹ رہی ہوتی تھی' آواز دینے والے کے ساتھ چل پڑتا تھا۔

"چلو' تمہاری ملاقات آئی ہے۔" قیدی کے نام سمیت چھ الفاظ پر مشتمل یہ جملہ اپنے اندر ایک مسحور کن طلسمی دنیا سمیٹے ہوئے تھا جس کے اسرار و رموز تھوڑی دیر کے لئے منکشف ہوتے تھے اور پھر غائب ہو جاتے تھے۔ ایک خاص عرصے کے لئے وہ پھر چھپ جاتے تھے۔

ملاقات کا دن قیدیوں کے لئے اور خاص طور سے لمبی سزا والے قیدیوں کے لئے کسی تہوار کے دن سے کم نہیں ہوتا تھا۔ اس دن وہ صبح ہی سے اس آواز کے انتظار میں رہتے کہ ان کا نام لے کر پکارا جائے گا۔ "چلو تمہاری ملاقات آئی ہے۔" اور پھر ان چند مختصر سے الفاظ کا سحر ان کی رگ رگ میں نشہ بن کر اترنے لگے گا اور ساری دنیا ایک دم سے بہت خوبصورت اور رنگا رنگ ہو جائے گی۔ جیل کی اونچی اونچی سربفلک قاتل دیواریں اور مہر بہ لب سنگین فصیلیں اس قدر نامہربان اور درشت نہیں رہیں گی۔ فضا اس قدر بوجھل اور زہر آلود نہیں معلوم ہو گی اور سپاہیوں' پہرے داروں اور وارڈروں کے چہرے اس قدر کرخت اور خشمگیں نہیں لگیں گے۔

ملاقات کا یہ وقت باہر کی دنیا سے رابطے کا وقت ہوتا تھا۔ یہ وہ وقت ہوتا تھا جب

گویا جیل کے سیاہ شب و روز میں باہر کی دنیا کی روشنی نقب لگا کر ذرا دیر کے لئے اندر داخل ہو جاتی تھی اور اپنے ساتھ باہر کی دنیا کی وہ ساری خوشبوئیں لے کر آتی تھی۔ جن سے بچھڑے ہوئے ایک عرصہ گزر چکا ہوتا تھا۔ یہ بچھڑی ہوئی خوشبوئیں ہوا کے ایک نرم جھونکے میں شامل ہو کر ذرا دیر کے لئے چپکے سے جیل کے بے مہر اور سنگلاخ آنگن میں اتر آتیں۔ فضا کچھ دیر کے لئے ان کے وجود سے معطر رہتی اور پھر خوشبوئیں واپس چلی جاتیں۔ تاہم ان کے جانے کے بعد دیر تک بلکہ بعض اوقات تو کئی کئی دن تک مہکتی رہتی اور یہ مہک زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی کو ایک نئی معنویت عطا کرتی رہتی۔

لیکن نور احمد کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی زندگی عرصہ ہوا کسی بھی قسم کی نئی معنویت سے محروم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی زندگی صرف اسیری اور مشقت کی زندگی تھی۔ جیل کے بے مہر اور سنگلاخ آنگن میں گزرنے والی بوجھل اور مضمحل' غم آلود زندگی جس میں ایک عرصے سے ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت تھی۔ ایک جان لیوا یکسانیت اس زندگی کا جزو بن گئی تھی اور اکثر تو نور احمد اس ٹھہراؤ کی بوجھل کیفیت سے اس بُری طرح گھبرا اٹھتا کہ اس کا دل چاہتا کہ وہ جیل کی دیواریں پھلانگ کر اس کے مضبوط پھاٹکوں کو توڑ کر باہر نکل جائے' اس دنیا میں چلا جائے جو اس کی اپنی دنیا ہے جسے اس سے زبردستی چھین لیا گیا ہے' جہاں اس کے اپنے لوگ ہیں جن سے اسے زبردستی علیحدہ کر دیا گیا ہے اور یہ دنیا جو اپنی تمامتر حماقتوں' ایذا رسانیوں اور ستم رانیوں کے باوجود بہت خوبصورت تھی۔ یہ اسے چپکے چپکے اشارے کر کے اپنی طرف بلاتی تھی۔

سارا دن گزر گیا' جیل کی فیکٹری کے بند ہونے کا وقت آ گیا اور قیدیوں نے اپنا اپنا کام سمیٹنا شروع کر دیا۔

"آج بھی کوئی ملاقات نہیں آئی نور احمد!" کرم حسین نے آہستہ سے اس سے پوچھا۔

"نہیں یار۔" نور احمد نے افسردگی کے ساتھ جواب دیا۔ "آج بھی ملاقات کا دن خالی گیا۔ کوئی بات نہیں' پھر سہی۔" اور وہ ایک ایسی پھیکی ہنسی ہنسا جو بظاہر تو ایک ہنسی تھی لیکن دراصل اس میں اس کی روح کا سارا کرب شامل تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنے انتہائی گہرے اور شدید دکھ کے اظہار کے لئے رونے کے بجائے ہنسنے کا سہارا لیتا ہے اور یہ ہنسی عام ہنسی سے کس قدر مختلف ہوتی ہے۔ اس ہنسی میں تو وہ زہر بھرا ہوا ہوتا ہے جو انسان کی روح کی گہرائیوں سے کھنچ کر آتا ہے۔

"بہت زمانہ ہو گیا یار نور احمد!" کرم حسین نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔
"تم نے پوسٹ کارڈ تو ڈالا ہو گا۔"

"ڈالے تھے۔" نور احمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا۔ "ایک نہیں کئی کئی پوسٹ کارڈ ڈالے ہیں لیکن کوئی جواب ہی نہیں آیا۔ پتہ نہیں ان لوگوں کو میرے خط ملے بھی یا نہیں!"

"یہ بھی کہنا مشکل ہے۔" کرم حسین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "جیل والوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہے میرے بھائی' ویسے اب تمہاری رہائی میں بہت زیادہ دن تو باقی نہیں ہیں۔"

"ابھی بھی اچھے خاصے دن ہیں بھائی۔" نور احمد نے ایک لمبا سانس کھینچ کر کہا۔ "اور میں تو اس سے بھی زیادہ لمبی قید خوشی خوشی گزار لیتا۔ بس جیل میں انسان اسی طرح اور اسی امید کے ساتھ زندہ رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اسے رہائی حاصل ہو گی اور باہر کی دنیا میں واپس آنے کا موقع ملے گا۔ جہاں وہ اپنے عزیز' پیاروں کے درمیان اٹھ بیٹھ سکے گا لیکن قید کے دکھ سے زیادہ دکھ تو اس بات کا ہوتا ہے کرم حسین' کہ جب اپنے ہی پرواہ کرنا چھوڑ دیں اور بھول جائیں لیکن میں جانتا ہوں کہ میرے گھر والے مجھے بھلا نہیں سکتے وہ بھلا مجھے کس طرح بھلا سکتے ہیں! خدا جانے وہ اپنی کن مشکلوں میں گرفتار ہوں گے۔ میں نے ان کے لئے مصیبتوں اور پریشانیوں کے علاوہ اور چھوڑا ہی کیا ہے؟"

کرم حسین کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن نہیں کہہ سکا۔ کرم حسین نے اپنی زبان بند رکھی۔ نور احمد کے چہرے پر اڑتی ہوئی خاک' اس کی آنکھوں میں لرزتی ہوئی ویرانی اور اس کے لب و لہجے کی شکستگی نے کرم حسین کو آگے کچھ کہنے سے روک دیا۔

"ایسی بات نہیں ہے میرے بھائی۔" کرم حسین اس سے کہنا چاہتا تھا مگر نہ کہہ سکا۔ "یوں بھی ہوتا ہے کہ دوریاں رشتوں ناتوں اور محبتوں کو کمزور کر دیتی ہیں۔ اگر انسانوں کے درمیان طویل فاصلے حائل ہو جائیں تو جذبوں کی شدت بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔ بہت سی دوسری باتیں' بہت سے دوسرے معاملات ایسے ہوتے ہیں جو انسان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔ کیونکہ وہ فوری اہمیت کے حامل اور فوری توجہ کے ہوتے ہیں۔ دنیا بھر میں ہر کارروائی ترجیحی مفادات کے تحت ہوتی ہے میرے بھائی! اور جیسے جیسے ترجیحات بدلتی جاتی ہیں ویسے ویسے کارروائیوں کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔"

"مجھے دیکھو۔" کرم حسین نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ ان الفاظ کو اپنی زبان سے باآواز بلند ادا نہیں کر سکا۔ "مجھے دیکھو بھائی نور احمد! میری قید کے پہلے سال کے دوران کوئی ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا جب میرے گھر والے مجھ سے ملاقات کے لئے نہ آتے ہوں۔ پورا ایک سال اسی طرح گزرا۔ پھر اس سے اگلے سال یوں ہوا کہ آنے والوں کی تعداد میں کمی ہونے لگی اور لوگ اکٹھا آنے کے بجائے وقفے وقفے سے ایک ایک کر کے آنے لگے۔ ایک سال تک لشتم پشتم کچھ ایسا ہی سلسلہ چلتا رہا' پھر اس سے اگلے سال آنے والوں کی تعداد میں کمی ہونے کے ساتھ ساتھ ملاقات کے دنوں میں کمی ہونے لگی اور پورے مہینے میں صرف ایک بار کوئی آ کر مل لیتا تھا۔ سب کی طرف سے حال احوال پوچھ لیتا تھا اور دعا سلام پہنچا دیتا تھا۔ سب کی اپنی اپنی مصروفیتیں تھیں۔ جن میں اضافہ ہو رہا تھا۔ زندگی دوڑ رہی تھی۔ بھاگ رہی تھی۔ نئے نئے مسائل کو سامنے لا رہی تھی۔ وقت کم تھا۔ کام بہت تھا۔ کس کے پاس فرصت تھی کہ جیل جا کر قیدیوں سے ملاقات کرتا پھرے؟ بس خیر خیریت مل جائے اتنا کافی ہے اور اب تو چھ چھ مہینے کوئی میری خبر لینے نہیں آتا۔ البتہ یہ ہے کہ دو ایک ماہ میں ایک پوسٹ کارڈ گھر سے موصول ہو جاتا ہے جس میں سب لوگوں کی خیریت اور بعض اہم خاندانی واقعات کا حال' احوال درج ہوتا ہے اور میں خود بھی اسی طرزِ زندگی کا عادی ہو گیا ہوں۔"

کرم حسین نے نور احمد سے یہ سب کچھ نہیں کہا۔ صورت حال جیسی تھی ویسی تو تھی ہی' جو دکھ اپنی جگہ پر موجود تھا' وہ تو تھا ہی۔ اب زخموں کو کریدنے اور ان پر نمک چھڑکنے اور انہیں بار بار تازہ کرنے سے کیا حاصل تھا؟ بس جو کچھ بھی ہے' جیسا بھی ہے' جیسا چل رہا ہے ویسا ہی چلتے رہنا چاہئے۔ اس کے علاوہ جو بھی صورت ہو گی وہ پریشان کن اور اذیت ناک ہو گی۔

"بس اب اکٹھا ہی گھر جا کر لوگوں سے ایک بار اور ایک ساتھ ملاقات کرنا۔" کرم حسین نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا لیکن کرم حسین کی اپنی مسکراہٹ بھی اس کی زخمی روح کی عکاس تھی جس میں آنے والے دنوں کی بے یقینی اور نامعلوم رویوں کا دھڑکا شامل تھا۔ کون جانے رہائی کے بعد کون کس طرح ملتا ہے' کس طرح پیش آتا ہے۔ ہر لمحہ بدلتی ہوئی دنیا میں جذبات و احساسات کے پیمانے بھی تو بڑی تیزی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

"ہاں یار!" نور احمد نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے ایسا ہی ہو گا۔"

"چلو اب اپنی اپنی بیرک میں چلو۔" ایک وارڈر کی تیز اور کرخت آواز گونجی اور نور احمد اور کرم حسین کی گفتگو کا اور دونوں کی الگ الگ سوچ کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ دونوں دوسرے قیدیوں میں شامل ہو کر اپنی بیرک کی طرف روانہ ہو گئے۔

قیدیوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں فیکٹری سے نکل کر جیل کے وسیع و عریض احاطے میں دور تک پھیلتے ہوئے سلسلہ عمارات سے نکل نکل کر اپنی اپنی بیرکوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ شام ہو رہی تھی۔ بیرکوں میں بند ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

نور احمد بھی فیکٹری سے نکلنے والی ایک ٹولی میں شامل تھا جس کا رخ اپنی بیرک کی طرف تھا۔ اس بیرک میں سبھی لمبی سزا والے قیدی تھے اور نور احمد بھی انہی میں سے ایک تھا۔ لمبی سزا والے قیدیوں کو چھوٹی سزا والے قیدیوں کے مقابلے میں ہمیشہ جیل میں کچھ زیادہ مراعات حاصل رہتی تھیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ لمبی سزا والوں کو تو ایک لمبی مدت جیل میں گزارنی ہوتی تھی۔ گھر والوں سے، دنیا سے، گھریلو آسودگی سے دور، اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے جہاں تنہائی اور محرومی کا بڑھتا ہوا احساس زندگی کے ہر لمحے کو بوجھل بنائے رکھتا ہے اور جہاں تک چھوٹی سزا والوں کا تعلق ہے تو ان کو چونکہ جیل کے اندر زیادہ لمبی مدت نہیں گزارنی پڑتی اس لئے انہیں زیادہ سہولتوں کا اور مراعات کا مستحق نہیں سمجھا جاتا ہے۔

نور احمد اور اس کے ساتھ دوسرے قیدی اپنی بیرک میں پہنچ گئے اور یہاں پہنچتے ہی مصروفیات اور کارروائیوں کے ایک دوسرے مرحلے کا آغاز ہو گیا۔ سب لوگ ان کارروائیوں میں شامل تھے۔

سکھر جیل کی اس بیرک میں دونوں جانب اس سرے سے اُس سرے تک فرش پر بستروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ جنہیں "تھڑے" کہا جاتا تھا۔ صبح کو بیرک سے روانگی کے وقت ہر قیدی کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ وہ اپنے بستر کو لپیٹ کر، تہہ کر کے جائے تاکہ فرش کی صفائی میں آسانی ہو اور شام کو واپس آنے کے بعد بستروں کو دوبارہ پھیلانا پڑتا تھا۔ بیرک کے اندر جھاڑو پوچے کی مشقت کرنے والے قیدی بیرک کے فرش کو صاف کر کے چمکا دیتے اور کوڑے کرکٹ کا نام و نشان باقی نہ رہتا اگر صفائی میں ذرا سی بھی کسر رہ جاتی تو پھر وارڈر ان کی اچھی طرح خبر لیتا۔

تھوڑی ہی دیر کے اندر اندر سارے بستر پھیلا دیئے گئے اور دن بھر کے تھکے ماندے قیدی ان پر بیٹھ گئے، کچھ لیٹ گئے اور آرام کرنے لگے، لیکن آرام کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا تھا، ابھی تو اور بھی بہت سے کام کرنے تھے۔

ذرا دیر میں لنگری سپاہیوں کی نگرانی میں کھانا لے کر آیا اور بیرک کے تمام قیدیوں کے درمیان رات کا کھانا تقسیم ہونے لگا۔ ابھی تو ہر طرف سورج کا اجالا پھیلا ہوا تھا اور دیواروں کی بلندیوں پر دھوپ خوب چمک رہی تھی لیکن جیل میں رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ کیونکہ غروب آفتاب سے پہلے پہلے سارے قیدیوں کو پوری طرح مقفل کر کے ان کی گنتی کر کے ساری بیرکوں وغیرہ کی چابیاں آفس میں جمع کرا دینی ہوتی تھیں جہاں وہ سپرنٹنڈنٹ کی تحویل میں چلی جاتی تھیں۔

لنگری کھانا تقسیم کر کے نکل گئے۔ قیدیوں نے اپنے اپنے برتنوں میں جو انہیں جیل کی طرف سے ملتے تھے کھانا لے کر رکھ لیا لیکن کسی نے بھی اسی وقت کھانا شروع نہیں کیا۔ کھانا تو روز کی طرح آج بھی جلدی تقسیم ہو گیا تھا لیکن روز کی طرح آج بھی دیر سے ہی کھایا جانا تھا۔

پھر جگہ جگہ چولہے روشن ہو گئے اور پانی جیسی پتلی کالی دال کو جو قیدیوں کے المونیم کے برتنوں میں بھری رکھی تھی گھی یا تیل کے بگھار دیئے جانے لگے۔ جیل کی دال ایسی نہیں ہوتی تھی کہ اسے بغیر تازہ بگھار کے کھایا جا سکے لیکن بہت سے قیدی ایسے تھے جو بغیر بگھار کے ہی جیل کی دال یا ترکاری کھانے پر مجبور تھے کیونکہ ان کے پاس نہ گھی تھا نہ تیل، نہ پیسے کہ سپاہیوں سے چپکے سے یہ چیزیں بازار سے منگوا سکیں اور نہ ہی کوئی ان سے ملاقات کے لئے آتا تھا جو ان کے لئے کچھ سامان لا سکے۔ اس لئے ایسے بدنصیب قیدیوں کو قطعی طور پر صرف جیل کے وسائل پر ہی گزارہ کرنا پڑتا تھا جبکہ باقی قیدیوں کے ساتھ صورت حال خاصی مختلف ہوتی تھی۔ ان کے پاس ایسی چیزیں موجود رہتی تھیں جن سے وہ اپنے کٹھن شب و روز کو آسان بنانے کا کام لے سکتے تھے لیکن نور احمد اور کرم حسین دونوں ہی اب ان خوش نصیب قیدیوں کی فہرست میں سے خارج ہو چکے تھے۔ ایک طویل عرصے سے ان سے کوئی ملاقات کے لئے نہیں آیا تھا۔ ان دونوں کے پاس تھوڑے بہت پیسے موجود تھے جو مختلف ملاقاتوں کے وقت ان کے گھر والوں نے انہیں دیئے تھے اور جنہیں انہوں نے بہت سنبھال سنبھال کر اور چھپا کر رکھا تھا۔ وہ کب کے ختم ہو چکے تھے اور یہ پیسے ان کی اپنی ضروریات پر اتنے زیادہ خرچ نہیں ہوئے تھے جتنے کہ وارڈروں

اور سپاہیوں کو رشوت دینے پر۔

اور اب وہ دونوں بالکل ہی خالی ہاتھ تھے' بہت سے دوسرے قیدیوں کی طرح ا
کی گزر اوقات اب مکمل طور پر جیل کے کھانے اور ناشتے پر ہی ہو رہی تھی۔ در
الحقیقت اس قابل نہیں ہوتا تھا کہ کوئی اسے منہ پر بھی رکھ سکے لیکن یہاں رہ کر تو ا
وہی کچھ کھانا تھا۔

شروع کے کچھ دنوں میں تو بعض دوسرے قیدیوں نے نور احمد اور کرم حسین کو گ
یا تیل اس امید پر ادھار دے دیا کہ جب ان لوگوں کی ملاقاتیں آئیں گی تو یہ قرضہ وا
مل جائے گا لیکن پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہو گیا۔ باہر سے چیزیں آنی بند ہو گئ
اور پھر اندر سے بھی چیزیں ملنی بند ہو گئیں۔ اب تو اس سارے قصے کو اتنا زیادہ عرصہ گز
گیا تھا کہ وہ دونوں یہ بھول ہی گئے تھے کہ بگھاری ہوئی دال اور بگھاری ہوئی ترکاری
ذائقہ کیسا ہوتا ہے اور گھی کی چپڑی روٹی کیسی ہوتی ہے۔ ایک عرصہ دراز سے وہ دونو
ان قیدیوں کی صف میں شامل ہو گئے تھے جن کے لئے باہر سے کچھ بھی نہیں آتا تھا اور
صرف جیل سے ملنے والی اشیاء پر ہی اپنا گزارہ کرتے تھے۔

اور نور احمد کو شروع شروع میں تو اس اذیت کا بہت احساس رہا تھا لیکن رفتہ رفتہ
اس کا عادی بن گیا تھا۔ وہ یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دے لیتا تھا کہ وہ تنہا تو اس عذاب
سے دوچار نہیں ہے' اس کے علاوہ اور بھی کتنے بہت سے لوگ ہیں .... وہ بھی تو اس
طرح جیل میں پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے' کوئی ان سے ملاقات
کے لئے نہیں آتا۔ کوئی ان کے لئے کچھ نہیں لاتا.........."

عرصہ ہو گیا تھا کہ کوئی نہیں آیا تھا' لیکن پھر بھی نور احمد ملاقات والے دن صبح
ہی انتظار کرتا' اسے معلوم تھا کہ کوئی نہیں آئے گا۔ انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئی
تھیں اور دکھ سہتے سہتے دل میں گھاؤ پڑ گئے تھے لیکن کوئی بھی نہیں آیا تھا' کوئی نہیں آیا
اور اب کسی کے آنے کی امید بھی نہیں تھی۔ وہ سب لوگ اسے بھول چکے تھے۔ ا
اپنے کاموں میں' اپنی اپنی مصروفیات میں پھنس کر' اسے فراموش کر چکے تھے اور اب
کا بھی دل اس سے ملاقات کے لئے بے چین نہیں ہوتا تھا۔

آج بھی ملاقات کا دن ایسے ہی گزر گیا تھا۔ یوں ہی بالکل سپاٹ' ہر دن کی طرح
واقعات سے خالی۔ ایک مردہ اور بے کیف دن کی طرح جس طرح سب دن ہوا کر
تھے۔ صبح سے لے کر شام کو سورج ڈوبنے تک کا جو وقت تھا وہ دن تھا اور وقت کے اس

عرصے کے دوران نور احمد کے لئے ہر لمحہ ایک ہی جیسا تھا۔ لمحوں اور ساعتوں کی اس
بھاگ دوڑ کے دوران کوئی بھی بات یاد رکھنے کے قابل نہیں تھی۔ سوائے ایک بات کے
اور یہ ہر گزرنے والا دن اس بات کا احساس دلاتا تھا کہ رہائی کے وقت میں اب ایک اور
دن کم ہو گیا ہے۔

نور احمد کو اپنا بستر پھیلانے کے بعد اور کوئی خاص کام نہیں تھا۔ اسے نہ تو چولہا جلانا
تھا' نہ کھانے میں ملنے والی دال کو بگھار دینا تھا' اسے تو کچھ دیر کے بعد دال کو تھوڑا سا گرم
کر لینا تھا اور یہ کام وہ کسی بھی جلتے ہوئے چولہے پر کر سکتا تھا۔

قاعدے کی رو سے تو جیل میں قیدیوں کو ماچس تک اپنے پاس رکھنے کی اجازت نہیں
تھی لیکن ہمیشہ یوں ہی ہوتا ہے کہ قانون کچھ اور ہوتے ہیں اور عملی صورت حال کچھ
اور۔

نور احمد کے دل پر بہت بوجھ تھا۔ بیرک قیدیوں کی آوازوں اور شور و غل سے گونج
رہی تھی' کوئی بڑے زور سے گا رہا تھا۔ کوئی زور زور سے باتیں کر رہا تھا' کوئی لڑ رہا تھا' کوئی
گالیاں بک رہا تھا لیکن نور احمد کے لئے تو جیسے ان ساری آوازوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔
اسے تو ہر طرف سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ وہ گہرا سناٹا تھا جو اس کی روح کی ویرانیوں
میں اتر کر گھل گیا تھا' سرایت کر گیا تھا اور وہ اس سناٹے کو اپنے وجود کے اندر جذب کئے
ہوئے جی رہا تھا۔

آٹھ سال' پورے آٹھ سال سے وہ اس سناٹے کے زہر کو چاٹتا چلا آ رہا تھا اور اب
تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جب سے پیدا ہوا ہے تب سے وہ اسی ماحول کا' اسی فضا
کا ایک حصہ ہے' یہی جیل اور اس کی چہار دیواری اس کا گھر ہے۔ یہاں کے سارے لوگ
اس کے افرادِ خاندان ہیں' قابلِ عزت' قابلِ ذلت' قابلِ محبت' قابلِ نفرت' افرادِ
خاندان۔ نور احمد کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ باہر کی دنیا میں کبھی تھا ہی نہیں' اس نے وہ دنیا کبھی
دیکھی ہی نہیں اور جب وہ یہاں سے رہا ہو کر نکلے گا تو پہلی بار اس دنیا کو دیکھے گا۔

مغرب کی اذان اور نماز کے بعد اس نے ایک چولہے پر جا کر دال گرم کی اور ٹھنڈی
روٹیوں کو بھی کچھ سینک لیا۔ پھر وہ اپنے تھڑے پر واپس آ گیا اور خاموشی کے ساتھ بیٹھ کر
بدمزہ اور پھیکی پانی جیسی سیاہ رنگ والی دال میں روٹی کے خشک ٹکڑوں کو بھگو بھگو کر کھانے
لگا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے بچی ہوئی روٹی کے ٹکڑوں کو ایک طرف کونے میں
اچھال دیا اور اپنے تھڑے پر لیٹ گیا اور اب سے لے کر صبح تک کا وقت اس کا اپنا تھا۔

اس میں کوئی شریک نہیں تھا۔

اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جس کے کچھ حصے میں وہ اپنے آپ کو ایک بالکل مختلف انسان پاتا تھا۔ یہ تھڑے پر لیٹ کر نیند آنے سے پہلے کا وقت ہوتا تھا۔

اس وقت، نور احمد جیل کی چہار دیواری میں اپنی بیرک میں مقید نہیں ہوتا تھا۔ وہ زمینوں اور آسمانوں کی سیر کرتا تھا جہاں ہر طرف ایک گہرا سکون تھا اور بے اندازہ طمانیت تھی۔ یہاں کوئی چلتا بھی تھا تو اس قدر آہستہ کہ اس کے قدموں سے کوئی آہٹ پیدا ہو کر دوسروں کے، سکون میں خلل نہ ڈالے۔ کوئی بولتا تھا تو اس قدر دھیمے لہجے میں کہ اس کی آواز کی گرانباری سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ یہ کیسی عجیب دنیا تھی جس کی نور احمد سیر کرتا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ نیند کی آغوش میں پہنچ جاتا تھا اور پھر اگلے دن جب علی الصبح اس کی آنکھ کھلتی تو وہ اپنے آپ کو اسی عذاب ناک بیرک میں پاتا اور پھر سب کچھ اسی عذاب ناک انداز میں شروع ہو جاتا۔ وہی دن، وہی لمحات کی بھاگ دوڑ، وہی وقت کی نپی تلی اور بے جان گردش لاتعلق، ہر ایک سے بے نیاز، ہر ایک سے بے خبر۔

نور احمد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ بیرک میں شور اپنے عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ سارے قیدی کھانا کھا چکے تھے اور اب دو دو چار چار کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے آپس میں اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف تھے۔ کرم حسین بھی دور ایک ٹولی میں بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سگریٹ تھا جو ظاہر ہے کہ کسی نے ازراہ نوازش اسے دیا ہو گا کیونکہ کرم حسین کے اپنے پاس نہ تو سگریٹ کے لئے پیسے تھے اور نہ سگریٹ تھے، اور خود نور احمد نے تو عرصہ ہوا سگریٹ نوشی ہی ترک کر دی تھی۔

نور احمد قتل کا مجرم تھا۔ اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ اس میں سے تقریباً آٹھ سال کا عرصہ وہ کاٹ چکا تھا اور اب معافیاں وغیرہ شامل کر کے اس کی کوئی سال کی مزید سزا باقی تھی۔ اس کے بعد وہ آزاد تھا۔

نور احمد کوئی عادی مجرم نہیں تھا۔ اس نے تو اپنی زندگی میں کبھی کسی سے مار پیٹ نہیں کی تھی۔ وہ طبعاً بہت نرم مزاج، شگفتہ اور مہربان قسم کا آدمی تھا۔

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت تھی کہ اس نے قتل کیا تھا، ایک آدمی کا قتل دیہاڑے اور درجنوں لوگوں نے اسے اس جرم کا ارتکاب کرتے دیکھا تھا۔ عینی گواہوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ نور احمد کا بچنا تقریباً ناممکن تھا، علاوہ ازیں واقعاتی شہادتیں بھی سب اس کے خلاف تھیں۔

لیکن جہاں تک نور احمد کا تعلق تھا، اسے آج تک اس بات کا یقین نہیں تھا کہ اس نے قتل کیا ہے۔ وہ تو کسی انسان کو ہلاک کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ تو کسی کے ساتھ معمولی قسم کا جھگڑا بھی نہیں کرتا تھا۔ تو پھر اس نے قتل کیسے کر دیا؟ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس نے قتل کر دیا تھا اور اب وہ اس جرم کی پاداش میں سزا بھگت رہا تھا۔

نور احمد نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس کا ذہن دور بہت دور ماضی کے بیابانوں میں بھٹکنے لگا۔

☆======☆======☆

نور احمد نے جب ہوش سنبھالا تھا تب سے اس نے اپنے گھر میں غریبی، بیماری، تند مزاجی اور لڑائی جھگڑے کی حکمرانی پائی۔ آنکھ کھولتے ہی اسے جس چیز کا سب سے پہلے احساس ہوا تھا وہ یہ کہ دنیا میں کسی بھی اچھی چیز کا وجود نہیں ہے۔

لیکن پھر رفتہ رفتہ اس احساس میں ترمیم و تبدیلی ہوتی رہی تھی اور وہ اس نتیجے پر پہنچا گیا تھا کہ دنیا میں بہت سی اچھی چیزیں ہیں لیکن بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر وہ چیزیں اس کی اور اس کے گھر والوں کی دسترس میں نہیں ہیں۔ وہ لوگ دوسرے ہیں جو ان تمام چیزوں سے بہرہ مند اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ نور احمد کے اپنے گھر میں تو ہر وقت ایک تشنج کی سی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اس کے ماں باپ آپس میں ہر وقت لڑتے رہتے تھے اور گھر کی فضا کشیدہ رہتی تھی۔ نور احمد کو اپنا گھر بالکل اچھا نہیں لگتا تھا جہاں کی ہر چیز بوجھل تھی، ناگوار تھی، بدصورت تھی۔

لیاری ندی کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ دور دور تک کچی بستیوں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا ہے اور تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پر ان گنت کچی بستیاں قائم ہیں جن میں سے اکثر میں تو بہت سے پکے مکانات بھی بنے ہوئے ہیں جن کی چھتیں ٹین کی یا سیمنٹ کی چادروں پر مشتمل ہیں لیکن زیادہ تر کچے اور جھونپڑی نما مکانات ہیں۔

یہ تمام بستیاں اس لحاظ سے مخدوش ہیں کہ برسات کے موسم میں بعض اوقات تیز بارش کے دوران جب لیاری ندی میں پانی بھر جاتا ہے اور کناروں سے آگے پھوٹ نکلتا ہے تو ان بستیوں کے اکثر مکانات پانی کی زد میں آ جاتے ہیں اور بہہ جاتے ہیں۔

وقتی طور پر وہ جگہ خالی ہو جاتی ہے، لوگ کہیں اور منتقل ہو جاتے ہیں لیکن بارش کا موسم ختم ہوتے ہی وہ دوبارہ وہاں نمودار ہو جاتے ہیں اور اس مخدوش علاقے میں رہائش

اختیار کر لیتے ہیں اور سال ہا سال سے یہ سلسلہ اسی طرح چلتا آیا ہے۔

نور احمد کا گھر بھی ایسی ہی ایک کچی بستی میں تھا جہاں تک پہنچنے کے لئے لسبیلہ کے پل کے نیچے سے راستہ جاتا تھا۔ لسبیلہ کے پل سے اتر کر گولی مار کا علاقہ شروع ہونے سے پہلے' ندی سے پہلے ہی' کافی آگے جا کر یہ بستی واقع تھی اور اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ ندی کے کنارے سے کافی دور اور کافی بلندی پر واقع تھی اسی لئے اسے ایک بہت محفوظ بستی سمجھا جاتا تھا۔

برسات میں جب لیاری ندی میں پانی بھر جاتا اور ندی کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ قریب واقع جھونپڑیاں' کچے مکانات اور نیم پختہ تعمیرات کو پانی سے نقصان پہنچتا یا وہ بہہ جاتیں تو اس وقت بھی یہ بستی محفوظ رہتی۔ کنارے سے دور اور بلندی پر ہونے کے باعث پانی عام طور پر اس تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔

نور احمد کا مکان اس بستی کے ان مکانوں میں شامل تھا جو ندی سے دور اور زیادہ بلندی پر تھے۔ بستی میں چاروں طرف سانپ کی طرح رینگتی' بل کھاتی' تپلی تپلی تنگ اور اونچی نیچی گلیاں تھیں۔ جن میں جابجا سیاہ پانی سے بھرے ہوئے گڑھے اور ٹیڑھی میڑھی نالیاں تھیں جن میں کوئی ترتیب اور کوئی نظم و ضبط نہیں تھا۔ ہر شخص نے اپنی مرضی سے اپنے مکان کے ساتھ کوئی نہ کوئی نالی بنالی تھی اور گڑھا کھود لیا تھا۔ بہت سی نالیاں تو ایسی تھیں جو گلی کے عین وسط میں ایک سرے سے دوسرے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ گلیوں میں ہر وقت شدید تعفن اٹھتا رہتا اور نالیوں اور گڑھوں میں گاڑھے سیاہ پانی اور موٹی کیچڑ سے بلبلے اٹھتے اور اس قدر سڑاند نکلتی کہ سانس لینا دشوار ہو جاتا لیکن ایسی بستی کے رہنے والوں کو اس بدبو کا' اس غلاظت کا' اس سڑاند کا کوئی احساس نہیں تھا۔ یہ سب کچھ تو اس وقت سے دیکھ رہے تھے جب سے وہ یہاں رہ رہے تھے اور یہ ان کی زندگیوں کا ایک حصہ تھا۔ یہی ان کی بستی تھی' یہی ان کا ماحول تھا' کائنات کی ہزار ہا رنگا رنگ نعمتوں اور قدرت کی بے کراں فیاضیوں اور سخاوتوں میں سے یہی کچھ ان کے حصے میں آیا تھا۔

نور احمد نے بھی ایسے ہی ایک تنگ و تاریک اور بدبودار مکان میں آنکھ کھولی جس کے در و دیوار پر مفلسی کی کائی جمی ہوئی تھی اور جس کے آنگن میں غریبی خیمہ زن تھی۔ یہ چھوٹا جھونپڑی نما مکان یا مکان نما جھونپڑا بہت مختصر تھا اور ایک آنگن اور دو چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا جنہیں کمرہ بمشکل ہی کہا جا سکتا تھا۔

مکان کی چہار دیواری تو کچی مٹی کی تھی لیکن کمروں کی دیواریں سیمنٹ کے بلاکوں کی

بنی ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک پر سیمنٹ کی چادریں اور بقیہ دو پر ٹین کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ ان تین کوٹھریوں میں سے ایک کوٹھری تو نور احمد کے والدین کے تصرف میں رہتی تھی' دوسری کوٹھری میں خالہ زیبن رہتی تھی جس کے بارے میں نور احمد کو کبھی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کس کی خالہ تھی' اس کی ماں کی یا اس کے باپ کی کیونکہ وہ دونوں ہی اسے خالہ زیبن کہتے تھے اور وہ دونوں یکساں طور پر اس کے وجود سے لاتعلق اور قدرے بیزار رہتے تھے۔ خالہ زیبن بوڑھی اور بہری تھی اور جب تک اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر چلا کر بات نہ کی جائے اس وقت تک تو وہ سن نہیں پاتی تھی۔ تیسری کوٹھری میں جو بہت چھوٹی تھی نہ جانے کہاں کہاں کا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔

نور احمد نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو انہی تین افراد کے مثلث میں گھرا ہوا پایا۔ اس کے باپ کا نام ظہور احمد تھا اور وہ سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ وہ رات کے آخری پہر ہی میں اٹھ کر گھر سے چلا جاتا تھا اور نور احمد کو ایک عرصے تک یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا باپ کس وقت گھر سے نکل کر جاتا ہے۔ وہ تو صبح کو بیدار ہوتا تو گھر میں صرف خالہ زیبن اور اپنی ماں کو پاتا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ باہر گلیوں میں کھیلنے کے لئے نکل جاتا۔

ان گلیوں میں پلنے والے بہت کم بچے ایسے تھے جنہوں نے اسکول یا کتاب کی صورت دیکھی ہو۔ زیادہ تر بچے تو سارا دن گلیوں میں ہی شور مچاتے رہتے تھے اور کھیل کود میں لگے رہتے تھے۔ ان کے والدین ان کو تعلیم دلوانے کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ تعلیم کے لئے پیسہ خرچ کرنے کی ضرورت تھی اور ان کے پاس خرچ کرنے کے لئے پیسہ نہیں تھا۔ ان کے لئے تو یہ بچے پیسہ کمانے کا ایک وسیلہ تھے۔ چنانچہ ذرا بڑا ہوتے ہی ہر لڑکے کو کسی نہ کسی کام پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ اس بستی کا ہر بڑی عمر کا لڑکا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح کے کام سے وابستہ تھا۔ کچھ بچے ایسے بھی تھے جو اسکول جاتے تھے لیکن ان کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر لڑکے کہیں نہ کہیں کام کرتے تھے' وہ مختلف قسم کے پیشوں سے وابستہ تھے۔

نور احمد نے آنکھ کھولتے ہی اپنی ماں شریفن اور باپ ظہور احمد کو لڑتے ہوئے پایا۔ ان دونوں میں زیاہ تر لڑائیاں ہی ہوتی رہتی تھیں اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ لڑائی کے لئے کسی معقول اور ٹھوس وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ بس ذرا سی دیر میں کسی نہ کسی بات پر' معمولی سے معمولی اور فضول سے فضول بات پر جھگڑا شروع ہو جاتا تھا۔ بہری خالہ زیبن اس جھگڑے میں اگرچہ غیر جانبدار رہتی تھی کیونکہ اسے سب کچھ

صاف طور پر سنائی نہیں دیتا تھا اور وہ جھگڑے کی اصل وجہ سے واقف نہیں ہوتی تھی تاہم وہ دونوں کو خاموش کرانے کی کوشش ضرور کرتی تھی لیکن اس بے چاری کی سنتا کون تھا۔ اس گھر میں اس کی حیثیت صرف ایک مدِ فاضل کی سی تھی۔ نور احمد کو یاد نہیں اس نے کبھی یہ دیکھا ہو کہ اس کے باپ یا ماں نے خالہ زیبن کے لئے کوئی چیز خریدی ہو، خالہ زیبن کے لئے کوئی کپڑا بنوایا ہو۔ اس بیچاری کے پاس جو پرانے دھرانے کپڑے تھے انہی سے وہ کام چلاتی تھی۔ جو کچھ گھر میں پکتا تھا اس میں اس کا بھی حصہ ہوتا تھا اور وہ شکر کر کے کھالیتی تھی۔ گھر کے زیادہ تر کام کاج میں وہ نور احمد کی ماں شریفن کا ہاتھ بٹاتی تھی۔

اس گھر میں خالہ زیبن ہی ایک ایسی شخصیت تھی جس کی کسی سے لڑائی نہیں ہوتی تھی۔ اس میں شاید کسی سے لڑنے کا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ باقی جہاں تک ظہور احمد اور شریفن کا تعلق تھا تو وہ دونوں تو ہر وقت جیسے خم ٹھونک کر ایک دوسرے سے لڑنے پر آمادہ رہتے تھے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی نور احمد کو ایک اور بات کا بھی عجیب و غریب احساس ہوتا تھا۔ اس کے اماں ابا ایک دوسرے سے خواہ کتنا ہی لڑیں، ایک دوسرے کو خواہ کتنا ہی بھلا کیوں نہ کہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے نفرت نہیں کرتے تھے۔ ان کی یہ لڑائی ایک ایسی لڑائی تھی جس میں نفرت کا عنصر شامل نہیں تھا، یہ غربت اور افلاس کی پیدا کردہ مایوسی، جھلاہٹ، ناامیدی اور بے زاری کے بطن سے جنم لینے والی لڑائی تھی جس میں ایک دوسرے کے لئے نفرت کا جذبہ شامل نہیں تھا بلکہ صرف جذبات کا وقتی ابال تھا۔ نور احمد کو اس بات کا اندازہ اس طرح ہوتا تھا کہ اگر کبھی اس کی ماں کی طبیعت خراب ہوتی تو اس کا باپ پریشان ہو جاتا اور گھر اور باورچی خانے کے وہ بہت سے چھوٹے موٹے کام خود کر ڈالتا جن کو وہ عام حالات میں ہاتھ بھی نہیں لگاتا تھا اور خالہ زیبن کی موجودگی کے باوجود وہ شریفن کے حصے کے زیادہ تر کام خود ہی کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اسی طرح ظہور احمد کو کسی دن واپسی میں دیر ہو جاتی تو شریفن پر اضطراب اور بدحواسی کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی۔ وہ بار بار دروازے تک جاتی اور گلی کے نکڑ کی طرف جھانک جھانک کر دیکھتی اور بعض اوقات جب کچھ زیادہ ہی دیر ہو جاتی تو وہ گھر سے نکل کر گلی کے نکڑ پر کھڑی ہوتی اور ظہور احمد کا انتظار کرتی۔ یہ الگ بات تھی کہ ظہور احمد کے گھر میں داخل ہونے کے تھوڑی ہی دیر کے بعد ان دونوں میں زبردست معرکہ آرائی شروع ہو

جس کی آواز سے ساری گلی گونجتی۔

نور احمد سارا دن بستی کی گلیوں میں اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا اور یہ سارے تماشے دیکھتا۔ اس بستی میں کہیں کوئی خوبصورتی نہیں تھی۔ کہیں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو دل کو احساس مسرت سے لبریز کر سکے۔ یہاں ہر طرف درشتی تھی، بیزاری تھی اور ساری فضا جیسے خشمگیں رہتی تھی۔

بستی میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی تھی جس میں ایک مولوی صاحب رہتے تھے۔ وہ مسجد میں ہی رہتے تھے اس کے ایک چھوٹے سے حجرے میں ان کے قیام کا بندوبست تھا اور وہ اپنا کھانا وغیرہ بھی خود ہی تیار کرتے تھے۔ دن کے وقت وہ بچوں کو مسجد میں اردو اور قرآن شریف پڑھایا کرتے تھے۔

شریفن چاہتی تھی کہ نور احمد کچھ لکھ پڑھ جائے۔ وہ اسے اسکول بھیجنا چاہتی تھی جو بستی سے باہر لسبیلہ کے قریب واقع تھا۔ مگر ظہور احمد اس کا سخت مخالفت تھا۔ اسے دو ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ نور احمد کی صورت میں اس کے پاس دو ہاتھ موجود تھے جو جلد ہی اس کا سہارا بن سکتے تھے اور زندگی کی اس بوجھل گاڑی کو گھسیٹنے میں اس کی مدد کر سکتے تھے۔ جس کو گھسیٹتے گھسیٹتے ظہور احمد کی کمر ٹیڑھی ہوتی جا رہی تھی۔ اسکول، تعلیم، پڑھائی یہ سب پیٹ بھروں کے چونچلے تھے۔ ننگے بھوکے لوگوں کا ان سے کیا واسطہ؟

چنانچہ نور احمد ابھی بہت چھوٹا ہی تھا کہ وہ اپنے والدین کے درمیان وجہ نزاع بن گیا۔ ماں اسے اسکول بھیجنا چاہتی تھی اور باپ اسے ابھی سے کام پر لے جانا چاہتا تھا۔ دونوں میں اس بات پر تکرار ہوا کرتی تھی۔

"تھوڑا اور بڑا ہو جانے دے۔" ظہور احمد اپنی بیوی سے کہتا۔ "ابھی اتنا زیادہ پیدل نہیں چل سکے گا جتنا کہ چلنا ہوتا ہے، تھک جائے گا۔ تھوڑا اور بڑا ہو جائے تو اپنے ساتھ لے جانا شروع کر دوں گا۔ منڈی کا سارا کام بھی دیکھ لے گا اور پھیری لگانا بھی سیکھ جائے گا۔ پھر زندگی بھر کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آرام سے اپنا دھندہ کرتا رہے اور روٹی کھاتا کماتا رہے۔"

"ہاں ہاں، تُو نے تو بڑا آرام اٹھایا ہے اس دھندے میں۔" شریفن جل کر کہتی۔ "بڑا پن برسنے لگا ہے تیرے اوپر، تُو نے تو سبزی کے اس ٹھیلے سے کما کما کر ڈھیر لگا دیئے۔ سارے دلدر دور کر دیئے تُو نے.........."

"اری خدا کا شکر کر نیک بخت کہ دو وقت کی روٹی چین سے گھر بیٹھے مل جاتی ہے

تھے۔" ظہور کہتا۔ "کتنے خدا کے بندے تو ایسے ہیں کہ جنہیں یہ نعمت بھی نصیب نہیں، ایک ایک نوالے کے لئے ترستے ہیں.........."

لیکن شریفن نے زندگی کے بارے میں اس نقطہ نظر کو کبھی بھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے سے زیادہ خراب حالت میں لوگوں کو دیکھ کر خدا کا شکر کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ وہ اپنے سے بہتر لوگوں کو دیکھ کر شکوہ کرنے والوں میں سے تھی اور اسی لئے وہ چاہتی تھی کہ نور احمد کچھ لکھ پڑھ لے تاکہ اسے کہیں اچھی سی نوکری مل جائے اور وہ لوگ ایک زیادہ بہتر زندگی گزار سکیں لیکن ظہور احمد کو دوسری فکریں کھائے جاتی تھیں۔ اس کا کوئی نہیں تھا۔ آج اگر اس کی آنکھ بند ہو جاتی تو اس کے کنبے کو کوئی دو وقت کی روٹی دینے والا نہیں تھا اور گھر میں بھلا ایسا کون سا خزانہ رکھا تھا جس کے سہارے وہ لوگ گزر بسر کر لیتے؟ جو کمایا کھا لیا اور اس کے باوجود بھی وہی ننگے بھوکے کے ننگے بھوکے، اس لئے ضروری تھا کہ نور احمد جلد از جلد کماؤ پوت بن جائے اور اپنے باپ کا بوجھ ہلکا کرے۔

چنانچہ نور احمد ابھی دس سال کا ہی تھا کہ اس کے باپ نے اسے اپنے ساتھ لے جانا شروع کر دیا۔

نور احمد کے لئے وہ رات بڑی ہیجان انگیز اور اضطراب خیز تھی جب اس کے باپ نے اسے اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس رات نور احمد سے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا گیا اور وہ خلاف معمول جلدی سو گیا۔ اس کی اماں نے اسے کہہ دیا تھا کہ اگر جلدی اٹھنا ہے تو پھر جلدی سونا ہو گا۔

پھر جب اس کی ماں نے اسے جگایا تو وہ صبح نہیں تھی، رات ہی تھی۔ چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور ساری بستی گہرے اور پُراسرار سناٹے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

شریفن نے دونوں باپ بیٹوں کو کھانا دیا اور پھر ظہور احمد نے اپنا ٹھیلا سنبھالا جو ان کے گھر کے آنگن میں ایک طرف کھڑا رہتا تھا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ شریفن دروازے میں کھڑی ہوئی ان دونوں کو اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک کہ وہ گلی کے نکڑ پر نظر آتے رہے اور پھر اس نے دروازہ بند کر لیا اور واپس اپنے بستر پر چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ یہ سب کچھ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کو سبزی فروش نہیں بنانا چاہتی تھی۔ غربت کے دکھ جھیلتے جھیلتے تو ساری زندگی گزر گئی تھی۔ نور احمد اس کا بہت بڑا سہارا تھا اور وہ سوچا کرتی تھی کہ وہ اسے پڑھا لکھا کر اس قابل بنائے گی کہ وہ

زیادہ پیسے کما کر لا سکے اور وہ لوگ ایک زیادہ خوشحال اور پُرمسرت زندگی گزار سکیں لیکن اس کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا اور اس کے شوہر ظہور احمد نے بیٹے کو بھی اپنے کام میں شامل کر لیا اور اب تو اس بات کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے تھے کہ نور احمد کچھ لکھ پڑھ لے۔

نور احمد جب اپنے باپ کے ساتھ گھر سے نکلا تو باہر ابھی واقعی رات ہی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا اور اسے ایک دم سے ڈر لگنے لگا۔ وہ کبھی ایسے وقت اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ باہر تو بڑا ہولناک سناٹا تھا اور ویرانی تھی۔ دور دور تک کسی انسان کی شکل نظر نہیں آتی تھی۔ سارے گھروں کے دروازے بند تھے، ساری دکانیں بند تھیں اور ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔

اس سناٹے میں اگر کوئی آواز گونج رہی تھی تو وہ صرف بستی کے کتوں کی آوازیں جن کے غول کے غول رات دن گلیوں میں اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھرتے تھے اور نالیوں، کیچڑ اور کوڑے کچرے میں کھانے کی چیزیں تلاش کرتے رہتے تھے۔

گلی کے نکڑ پر پہنچتے ہی کتوں کا ایک غول ان دونوں کی طرف لپکا اور نور احمد سہم کر اپنے باپ کی ٹانگوں سے لپٹنے لگا لیکن ظہور احمد نے اسی وقت ٹھیلے پر رکھا ہوا ایک موٹا سا ڈنڈا اٹھایا اور لپکتے ہوئے کتوں کی طرف گھمایا۔ آن کی آن میں سارے کتے کوں کوں اور ٹیں ٹیں کرتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

رات کا آخری پہر تھا اور وہ دونوں بستی میں سے گزرتے ہوئے لسبیلہ کے پل کے نیچے اس جگہ تک آ گئے جہاں سے انہیں چڑھائی پر چڑھ کر اوپر آنا تھا اور وہاں سے سبزی منڈی جانا تھا۔

لسبیلہ سے ناظم آباد کی طرف جانے والی سڑک بالکل خاموش اور ویران پڑی ہوئی تھی۔ نور احمد اسے بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس وقت یہ سڑک بہت عجیب اور نامانوس سی لگی۔ اس نے کبھی اسے اس قدر ویران اور خالی خالی نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ اتنی رات گئے کبھی اس سڑک پر آیا ہی نہیں تھا۔

لسبیلہ سے لے کر تین ہٹی تک بھی سڑک بالکل ویران پڑی تھی البتہ کسی کسی وقت کوئی ٹرک یا کوئی اور گاڑی گزر جاتی تھی۔ ظہور احمد ٹھیلے کو دھکیل رہا تھا اور نور احمد اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

تین ہٹی کے چوک پر پہنچنے کے بعد ظہور احمد نے اپنے بیٹے کو اپنے ٹھیلے پر بٹھا لیا۔

"اب تُو پیدل چلتے چلتے تھک گیا ہو گا۔" اس نے نور احمد سے کہا۔ "ٹھیلے پر جا۔ "منڈی تک تجھے اس طرح لے چلوں گا۔"

نور احمد تھکا وکا تو کوئی خاص نہیں تھا لیکن یہ کیا کم مزے کی بات تھی کہ اسے ٹھیلا سواری کے لئے مل رہا تھا۔ اسے اس ٹھیلے سے ہمیشہ بڑی گہری دلچسپی رہی تھی اور کتنی ہی بار اس کا جی چاہا تھا کہ وہ ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا باہر گلی میں لے جائے اور لڑکوں کے ساتھ مل کر اس سے خوب کھیلے، اس پر خود سواری کرے اور دوسرے لڑکے اسے دھکیلیں۔ پھر دوسرے لڑکے سواری کریں اور وہ خود اسے دھکیلے لیکن ابا اگر اسے بچوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھ لیتے تو اس کی شامت آ جاتی۔ ابا کا حکم تھا کہ وہ کسی حال میں بھی ٹھیلے کو ہاتھ نہ لگائے۔ ابا کو گھر بھر میں اگر کوئی چیز سب سے زیادہ پیاری تھی تو ان کا ٹھیلا تھا۔ ٹھیلے پر تو ان کی جیسے جان جاتی تھی اور وہ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اکثر وہ گھنٹوں اس کی مرمت میں مصروف رہتے اور اس کے ٹوٹے پھوٹے حصوں کو جوڑتے اور ان کی پیوند کاری کرتے رہتے۔ ابا ٹھیلے کو اپنا رزق کہتے تھے۔

اس رات پہلی بار اس پر اپنے ابا کے پیشے کے اسرار و رموز کا بڑی حد تک انکشاف ہوا۔ اگرچہ اس کا ذہن اس کاروبار کی تمام تر پیچیدگیوں کو سمجھنے کا اس وقت اہل نہیں تھا تاہم بہت سی صاف اور سادہ باتیں اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔

اس رات اس نے پہلی بار کراچی کی سبزی منڈی دیکھی اور اس عظیم الشان ہنگامہ پرور جگہ کو دیکھ کر جیسے اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ سارے شہر میں تو سناٹا، تاریکی تھی اور خاموشی تھی لیکن تاریکی اور خاموشی کے اس سمندر میں یہ جگہ روشنی رونق کے چھوٹے سے جزیرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہر طرف روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور لوگ اس قدر کہ خدا کی پناہ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت بڑا میلہ لگا ہو۔ چیخ پکار اور شور و غل سے کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ ظہور احمد نے نور احمد کو سختی کے ساتھ تاکید کر دی تھی کہ وہ کسی حالت میں بھی ٹھیلے سے نہ اترے اور وہیں رہے۔

نور احمد خود یہاں کے دھوم دھڑکے کو دیکھ کر کافی حیران اور کسی قدر وحشت زدہ ہو گیا تھا اور ہکا بکا ہو کر اس بھاگ دوڑ کو دیکھ رہا تھا جو اس کے چاروں طرف مچی ہوئی تھی۔ وہ تو ٹھیلے سے اترنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔

انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے ہجوم میں اسے طرح طرح کے لوگ نظر

رہے تھے اور طرح طرح کی زبانیں سنائی دے رہی تھیں جن سے وہ بالکل واقف نہیں تھا۔ انسانوں کے علاوہ ٹرکوں، سوزوکیوں کا بھی ایک انبوہِ کثیر تھا جن میں طرح طرح کی سبزیاں اور پھل لدے ہوئے تھے۔

نور احمد کی عقل چکرا کر رہ گئی۔ اس قدر سبزیاں اور اس قدر پھل تو اس نے کبھی آج تک ایک جگہ نہیں دیکھے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس قدر پھلوں اور سبزیوں کا بھلا کیا ہوتا ہو گا اور یہ کہاں جاتی ہوں گی۔ کیا واقعی یہ سب کی سب بِک جاتی ہیں؟

اور اس رات اس نے بہت کچھ دیکھا سنا اور سیکھا۔ اس کے باپ نے اسے ماشہ خوروں کے بارے میں بتایا۔ اسے نیلام ہوتے ہوئے دکھایا اور منڈی کی دوسری سرگرمیوں سے اسے واقف کروایا۔

اس کے باپ نے مختلف قسم کی سبزیاں خریدیں اور پھر انہیں ٹھیلے پر قاعدے سے سجایا۔ سبزیوں کو سجانے میں نور احمد نے اپنے باپ کی مدد کی اور اسے اس کام میں مزا آیا۔ اس کا باپ جب رات کے پچھلے پہر ٹھیلا لے کر گھر سے نکلتا تھا تو نور احمد اس وقت سویا ہوا ہوتا تھا اور پھر جب وہ سہ پہر کو یا شام کو واپس آتا تو اس کا ٹھیلا خالی ہوتا تھا۔ سوائے اس تھوڑی سی سبزی کے جو وہ گھر کے لئے بچا کر رکھتا تھا۔ نور احمد نے اپنے باپ کے ٹھیلے کو سبزیوں سے پوری طرح بھرے ہوئے آج پہلی بار دیکھا تھا اور وہ بڑی چاہت اور پیار سے ان سبزیوں کو ٹھیلے پر سجا رہا تھا۔

سبزیوں کو اچھی طرح ٹھیلے پر سجانے کے بعد ظہور احمد نے ان پر بالٹی سے پانی چھڑکا۔ نور احمد کو آج پہلی بار ان کئی چیزوں کے استعمال کا پتہ چلا جو اس ٹھیلے کے ساتھ رہتی تھیں۔ ان میں ایک تو موٹا سا ڈنڈا تھا جس سے اس کے باپ نے کتوں کو بھگایا تھا۔ ایک لالٹین تھی جو ٹھیلے کے نیچے لٹکی رہتی تھی اور جسے اس کے باپ نے گھر سے روانہ ہوتے وقت روشن کر لیا تھا۔ ایک خالی بالٹی تھی اور وہ بھی ٹھیلے کے نیچے لٹکی رہتی تھی۔ منڈی میں ٹھیلے کو سبزیوں سے بھرنے کے بعد ظہور احمد نے کئی بالٹی پانی سبزیوں پر انڈیل دیا اور پھر بالٹی میں پانی بھر کر اسے ٹھیلے کے نیچے لٹکا لیا۔

ان تمام کاموں میں صبح ہو گئی اور نور احمد جب اپنے باپ کے ساتھ ٹھیلے کو دھکیلتا ہوا منڈی سے باہر آیا تو سڑکوں پر اجالا پھیل چکا تھا اور منڈی کے اردگرد تو ویسے بھی قیامت کا سماں تھا۔

اور اس طرح نور احمد کی عملی زندگی کا آغاز ہو گیا۔

وہ سارا دن اس نے اپنے باپ کے ساتھ مختلف علاقوں میں گھومتے ہوئے اور سبزی فروخت کرتے ہوئے گزارا۔

اگلے چند ہفتوں کے اندر اندر وہ اپنے کام کے کاروباری اسرار و رموز کو بہت حد تک سمجھ چکا تھا۔ اس کے باپ نے اپنا ہنر اس کو منتقل کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا اور اسے وہ سب کچھ بتایا جو اس نے اپنے علم اور تجربے سے ایک عرصے میں حاصل کیا تھا۔

سبزیوں پر پانی ڈال کر ان کے وزن میں کس طرح اضافہ کیا جاتا ہے۔ گلی سڑی سبزیوں کے عیب کو کس طرح چھپایا جاتا ہے۔ سوکھی ہوئی اور نیم مردہ سبزیوں کو پانی کے ذریعے وقتی طور پر کس طرح ایسا بنا دیا جاتا ہے کہ وہ دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک نظر آئیں۔ سبزی کو تولتے وقت ڈنڈی کس طرح ماری جاتی ہے کہ سامنے والا پورے غور سے دیکھنے کے باوجود بھی ہرگز یہ نہ جان سکے کہ تول میں بے ایمانی کی جا رہی ہے۔ ایک ہی سبزی کو مختلف علاقوں میں کس طرح مختلف قیمتوں پر فروخت کیا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ظہور احمد کا صبح کا کاروباری سفر سبزی منڈی کے قریبی علاقے سے شروع ہوتا تھا اور وہ سہ پہر تک اپنا ٹھیلا خالی کر کے گھر واپس آ جاتا تھا لیکن کسی کسی دن یوں بھی ہوتا کہ اسے شام ہو جاتی تھی۔ کچھ سبزی فروخت ہونے سے رہ جاتی تھی جسے وہ کسی نہ کسی طرح اونے پونے بیچ کر ہی گھر واپس آتا تھا۔

نور احمد کی زندگی کا عملی سفر دس سال کی عمر میں اس رات شروع ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بیس سال کا عرصہ یوں گزر گیا جیسے کل کی بات ہو۔ اسے آج بھی یاد تھا کہ کس طرح اس رات وہ اپنے باپ کے ساتھ پہلی بار ٹھیلا لے کر منڈی گیا تھا۔

تب سے اب تک زبردست تبدیلیاں ہو چکی تھیں لیکن نور احمد کی زندگی کا عملی ڈھانچہ وہی تھا جو آج سے بیس سال پہلے تھا اور اس ڈھانچے کی تشکیل میں جو عناصر ترکیبی شامل تھے وہ آج بھی جوں کے توں باقی تھے۔ وہی غربت تھی وہی افلاس تھا، وہی محرومی تھی، وہی غیر انسانی حالات میں گزرنے والی زندگی تھی۔

نور احمد کی بستی بھی جوں کی توں تھی۔ اس کی گلیوں میں، اس کے مکانوں میں اور اس کے جھونپڑوں میں بہت کم تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ نالیاں اور گٹر آج بھی اسی طرح گندے رنگ کے پانی اور کیچڑ سے بھرے رہتے تھے اور ان میں کیڑے کلبلاتے رہتے تھے۔

آج بھی ان گلیوں میں اسی طرح رچا بسا تھا جیسے آج سے بیس سال پہلے تھا اور یہ سب کچھ تو اس بستی کے رہنے والوں کی زندگی کا جز بن گیا تھا۔ بستی کے کچھ پرانے مکان اور جھونپڑیاں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں لیکن ان کی جگہ نئے مکانوں اور نئے مکینوں نے لے لی تھی۔ بستی کے بہت سے پرانے مکین بھی اپنے ٹھکانوں کو بعض دوسرے لوگوں کے حوالے کر کے چلے گئے تھے لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بہ حیثیت مجموعی بستی کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اسی طرح اپنی جگہ پر قائم تھی اور اس کی آبادی میں پہلے کے مقابلے میں کچھ زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی حدود تو زیادہ نہیں پھیلی تھیں کیونکہ اس کے لئے گنجائش نہیں تھی لیکن مکینوں کی تعداد ضرور بڑھ گئی تھی۔

نور احمد بالکل اپنے باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ پہلے دن اس کے باپ نے اسے کاروبار کے جس ڈھب پر لگایا تھا اسی کو نور احمد نے آج تک اپنایا ہوا تھا اور نتیجتاً وہ آج بھی وہیں کھڑا ہوا تھا جہاں اس کے باپ نے اسے چھوڑا تھا۔ زندگی کے اسلوب میں کوئی رتی برابر تبدیلی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ایک نسل سبزی بیچتے ہوئے گزر گئی تھی اور اسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دنیا میں اس کے علاوہ اور کوئی کام کر ہی نہیں سکتا اور شاید یہ حقیقت بھی تھی کہ کیونکہ اس نے اس کے علاوہ اور کچھ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ بس جس ڈھرے سے زندگی گزر رہی تھی اسی طرح گزر رہی تھی۔ نور احمد اس میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کر سکا تھا۔

بیس سال کے اس عرصے کے دوران بہت سی قدرتی تبدیلیاں نمودار ہو چکی تھیں۔ زندگی اگرچہ بظاہر ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی تھی لیکن کبھی بھی وہ ٹھہری ہوئی نہیں تھی۔ وقت کا کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس کے دوران زندگی رک جائے اور اس کی نبضیں تھم جائیں۔ وہ تو ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ آگے بڑھتی جاتی ہے، مردہ لمحوں کے ہجوم کو اپنے پیچھے چھوڑتی ہوئی جو اپنے ساتھ وہ سب کچھ لے جاتے ہیں جو ان سے وابستہ تھا اور پھر وہ سب کچھ کبھی بھی واپس نہیں آتا۔

ظہور احمد کا انتقال اس وقت ہوا جب نور احمد کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ دونوں باپ بیٹے ہر روز معمول کے مطابق رات کے آخری پہر میں منڈی جاتے اور اب ٹھیلے کو سارے راستے نور احمد خود دھکیلتا تھا۔ اس کی نوعمری کا زمانہ تھا اور ظہور احمد کی ڈھلتی ہوئی عمر تھی۔ نور احمد نے اپنے باپ کے کاروبار میں بھرپور دلچسپی لی تھی اور اسے سارا دن اِدھر سے اُدھر گھومتے پھرتے رہنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ اس پیشے کا اپنا ایک حسن تھا۔ اس کی

اپنی ایک کشش تھی اور نور احمد کو اس سے جو گہری اور قلبی وابستگی تھی وہ اسے کسی بھی دوسرے کام سے نہیں ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات تو اس کو ایسا لگتا تھا جیسے وہ پیدا ہی سبزی کا ٹھیلا لگانے کے لئے ہوا ہے اور دنیا میں اس سے زیادہ دلچسپ کام اور کوئی نہیں ہے۔

لیکن پندرہ سال کی عمر میں جب باپ کا انتقال ہو گیا تو وہ کام جسے نور احمد نے شروع شروع میں ایک شغل کے طور پر اپنایا تھا اس کے لئے زندگی کا تقاضہ بن گیا اور اس کی جانب اس کا نقطۂ نظر بھی بدل گیا تھا۔ اب اسے پوری ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دینا تھا۔ باپ مر گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے لئے ذمہ داریوں کا ایک بوجھ بھی چھوڑ گیا تھا۔ شریفن اور خالہ زیبن نور احمد کی ذمہ داری تھیں اور نور احمد اب اس گھر کا بڑا اور خاندان کا "سرپرست" بن گیا تھا۔

بیوہ ہو جانے کے بعد شریفن صرف تین سال تک زندہ رہی اور پھر وہ بھی سدھار گئی اور وہ بیچاری اس وقت سدھاری جب نور احمد کی شادی کی تیاریاں اپنے عروج پر تھیں۔ اس کی شادی طے ہو چکی تھی اور اگلے ہی مہینے وہ اپنی زندگی کی اس نئی شاہراہ پر قدم رکھنے والا تھا لیکن قضا و قدر کے ہاتھوں نے اس کے اس قدم کو کچھ عرصے کے لئے روک دیا۔ ماں کے اچانک انتقال کے بعد نور احمد کی شادی کچھ عرصے کے لئے ٹل گئی۔

گھر میں اب بہری زیبن خالہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ تاہم نور احمد کے لئے ان کا وجود بہت غنیمت تھا کیونکہ ماں کے مرنے کے بعد خالہ زیبن سارے گھر کو سنبھالے ہوئے تھیں اور ان کے ساتھ ایک آسانی یہ تھی کہ بہت زیادہ بک بک جھک جھک نہیں کرنی پڑتی تھی۔ وہ تو ہمیشہ کی بہری تھیں۔ بس اپنی مرضی سے کام کرتی رہتی تھیں جو جی چاہا جیسے جی چاہا پکا لیا' سب ٹھیک تھا۔ نور احمد کے لئے تو ان کی ذات ہمیشہ آرام و سکون کا باعث رہی۔

زیبن خالہ نور احمد کی شادی کے دو سال بعد تک زندہ رہیں اور جب ان کا انتقال ہوا تو اس وقت نور احمد کی بڑی بیٹی افشاں چھ ماہ کی تھی۔ نور احمد کی بیوی شاکرہ ایک سیدھی سادی گھریلو عورت تھی اور اس نے خالہ زیبن کا ہمیشہ خیال رکھا۔ ویسے اسے خالہ زیبن سے آرام بھی بہت تھا۔ خالہ زیبن تو پورے گھر کا انتظام بڑے آرام سے چلا لیتی تھیں اور شاکرہ پر زیادہ بوجھ نہیں پڑتا تھا۔

شاکرہ سے شادی کے فوراً ہی بعد نور احمد نے نیم شعوری اور نیم لاشعوری طور پر اپنی ازدواجی زندگی کو اپنے والدین کی ازدواجی زندگی سے کافی مختلف پایا۔ اس کے والدین

نے اپنی ساری جوانی اور بڑھاپے کا زمانہ بھی آپس میں لڑتے ہوئے گزارا تھا اور نور احمد کو گھر کے ماحول میں کبھی بھی سکون اور مسرت کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اس نے چھوٹی سی عمر سے ہی گھر سے باہر رہنے کو ترجیح دی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ سبزی بیچنے کے لئے نکل جاتا تھا۔ جتنی دیر وہ گھر سے باہر رہتا اسے بڑا امن اور سکون محسوس ہوتا۔ جب وہ اپنے ابا کے ساتھ تنہا ہوتا تھا تو ظہور احمد اس سے بہت سی باتیں کرتا تھا۔ وہ اسے صرف سبزی بیچنے کے بارے میں ہی نہیں اور بہت سی چیزوں کے بارے میں بھی بتاتا رہتا تھا۔ اپنے سابقہ وطن کے بارے میں بتاتا تھا جہاں سے وہ ہجرت کر کے کراچی آیا تھا۔ وہاں کے بارے میں ظہور احمد بہت سی باتیں کرتا تھا لیکن فی الحقیقت نور احمد کو اس بھولے بسرے سابقہ وطن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں کی گلیوں' وہاں کے کوچہ بازار اور وہاں کے در و دیوار کے تذکرے سن کر اس کے دل میں کوئی تجسس' کوئی امنگ' کوئی خلش' کوئی ترنگ پیدا نہ ہوتی۔ اس نے تو آنکھ کھولتے ہی اپنے آپ کو جن بستیوں میں' جن آبادیوں میں پایا تھا وہی اس کا سب کچھ تھیں۔ اسے اپنے باپ کے آباؤ اجداد کی ان ہڈیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جن کا تذکرہ اس کا باپ اکثر بڑی حسرت کے ساتھ کیا کرتا تھا۔ نور احمد کی زندگی میں زندوں کے بارے میں ہی سوچنے کے لئے اتنا کچھ تھا کہ بھلا مُردوں کے بارے میں سوچنے کی کیا گنجائش رہ جاتی۔

نور احمد کی بیٹی افشاں کی عمر اس وقت بارہ سال کی تھی اور اس کے بیٹے عمران کی عمر آٹھ سال' جب وہ ہولناک اور بھیانک واقعہ پیش آیا جس نے نور احمد اور اس کے خاندان کی زندگی کو بالکل ہی بدل ڈالا۔

گزشتہ برسوں کے دوران بستی کا کوئی مسئلہ حل تو ہوا نہیں تھا البتہ مسائل میں برابر اضافہ ہی ہوتا رہا تھا۔ کچھ اور نئے مکانات اور جھونپڑیاں عالم وجود میں آ گئے تھے اور نشیب میں ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ آبادی میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔

بیس سال پہلے کی طرح آج بھی بستی کے لئے پانی کا ایک ہی نل تھا اور وہ بھی بستی کے ایک کنارے پر لگا ہوا تھا۔ اسی ایک نل سے اس ساری بستی کے لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ پہلے بھی ایسا ہی ہوتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوتا تھا۔ کتنی ہی حکومتیں آئیں اور گئیں لیکن اس آبادی کی اور اس جیسی آبادیوں میں رہنے والے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کی قسمتوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ تو وہیں کے وہیں کھڑے رہے۔ البتہ ان کے شانوں کو اپنے لئے سواری کے طور پر استعمال کرنے والے بہتیرے سیاستدان

کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

لوگ زیادہ ہو گئے تھے اور پانی کم ہو گیا تھا۔ بستی کے لوگوں نے اس سلسلے میں ساری کوششیں کر کے دیکھ لیا تھا لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ بستی میں ایک نل کے دوسرا نل نہیں لگ سکا تھا اور موجودہ نل میں بھی پانی کا پریشر کافی کم ہو گیا تھا۔ ایک زمانہ وہ تھا جب یہ نل تقریباً چوبیس گھنٹے چلتا رہتا تھا اور تب لوگوں کو اتنی زیادہ پریشانی نہیں تھی۔ جس کو جب سہولت ہوتی تھی وہ پانی بھر لیتا تھا لیکن پھر رفتہ رفتہ پانی میں کمی واقع ہونے لگی۔ اب نل میں ہر وقت پانی نہیں آتا تھا بلکہ رات اور دن کے کم حصے میں پانی آتا تھا۔

اور بعد میں تو بس وقت مقرر ہو کر رہ گیا تھا۔ چند گھنٹے صبح اور چند گھنٹے شام، اس کے بعد نل سے پانی کی ایک بوند بھی نہیں آتی تھی اور وہ سارا وقت لمبی لمبی سانسیں بھرا کرتا تھا۔ چنانچہ اس صورت حال کے ساتھ ہی بستی کی زندگی کے قواعد و ضوابط بھی بدل گئے۔ جب حالات بدلتے ہیں تو وہ اپنے ساتھ نئے ضوابط کو بھی لے کر آتے ہیں۔ ان ضوابط کو کوئی نہیں بناتا، کسی پارلیمنٹ یا اسمبلی میں ان کی تشکیل نہیں کی جاتی اور ان کی منظوری نہیں دی جاتی۔ کہیں ان پر بحث مباحثہ نہیں ہوتا۔ یہ تو زندگی کی معروضی تبدیلیوں کے نتیجے میں خود بخود جنم لیتے ہیں اور آناً فاناً زندگی کا جزو بن جاتے ہیں اور پھر ایسا معلوم ہونے لگتا ہے جیسے یہ تو ہمیشہ سے موجود تھے۔ کسی کو بھی ان کی موجودگی پر تعجب نہیں ہوتا اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔

چنانچہ پانی کی فراہمی میں کمی کے ساتھ ساتھ ایک یہ ضابطہ خود بخود وجود میں آیا کہ روز صبح شام نل کے سامنے برتنوں کی قطاریں نظر آنے لگیں۔ یہ ایک ترمیم شدہ ضابطہ تھا۔ اس سے پہلے کافی عرصے تک تو یوں ہوتا تھا کہ لوگ خود اپنے اپنے برتن لئے ہوئے نل کے سامنے ایک قطار میں کھڑے رہتے تھے اور اپنی اپنی باری آنے پر پانی بھر کر وہاں سے چلے جاتے تھے، لیکن اس طرح اکثر لوگوں کو بہت دیر تک انتظار کرنا پڑتا تھا اور اپنے اپنے برتن سنبھالے ہوئے وہاں کھڑے یا بیٹھے رہتے۔ چنانچہ اس ضابطے نے لوگوں کی سہولت کی خاطر خود بخود اپنے اندر ایک ترمیم کر لی۔ اب یہ ہوتا تھا کہ لوگ صبح شام نل کے سامنے اپنے اپنے برتن قطار میں رکھ دیتے تھے اور انہیں خود وہاں موجود رہنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

یہ طریقہ کار سہل تھا اور اس میں لوگوں کا وقت بھی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ نل کا

پانی تو اپنے مقررہ وقت پر ہی آتا تھا۔ اس سے پہلے پانی نہیں آتا تھا اور مقررہ وقت سے پہلے ہی نل کے سامنے برتنوں کی ایک لمبی قطار لگ جاتی تھی۔

نور احمد کو لڑائی جھگڑے سے ہمیشہ نفرت رہی تھی اور وہ ہمیشہ ایک پُرسکون اور پُرامن فضا کا حامی اور متلاشی رہا تھا۔ اس کی لاشعوری وجہ غالباً یہ تھی کہ اس نے اپنے بچپن میں اپنی گھریلو زندگی میں کبھی سکون اور امن نہیں دیکھا تھا، اور اس وقت گھر میں جو کچھ ہوتا رہتا تھا نور احمد نے اس سے ہمیشہ نفرت کی تھی اور اس کو کبھی پسند نہیں کیا تھا۔

نور احمد نے شادی کے بعد ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی اولادوں کو پڑھائے گا۔

اس کی بیوی شاکرہ اس معاملے میں اس کی بالکل ہم خیال تھی اور دونوں میاں بیوی نے اپنی اولاد کے بارے میں یہ متفقہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے پڑھائیں گے۔ چنانچہ ان کی پہلی اولاد افشاں پانچ برس ہی کی تھی کہ شاکرہ نے اسے گورنمنٹ پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا۔ اسکول بستی سے کافی دور لسبیلہ کے قریب واقع تھا اور شاکرہ خود اسے اسکول چھوڑنے اور لینے کے لئے جاتی تھی۔

افشاں کے اسکول جانے کے دو سال بعد عمران نے بھی اسکول جانا شروع کر دیا۔ دونوں بچے اب باقاعدگی کے ساتھ اسکول جاتے تھے اور نور احمد اور شاکرہ اس بات سے بہت خوش تھے۔ شاکرہ خود بھی ایک غریب اور ناخواندہ خاندان کی لڑکی تھی اور اس کے لئے یہ بڑے فخر اور مسرت کی بات تھی کہ اس کے بچے پڑھ رہے تھے۔ اس نے عمران سے تو خاص طور سے ابھی سے بہت سی امیدیں وابستہ کرنا شروع کر دی تھیں۔ عمران کو اپنے باپ کی طرح سبزی فروش نہیں بننا تھا۔ اسے تو پڑھ لکھ کر کوئی اچھی سی نوکری کرنی تھی اور پھر ایک چاند سی بہو بیاہ کر لانی تھی۔ شاکرہ نے ابھی سے نہ جانے کیسے کیسے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔

صبح کے وقت تو شاکرہ خود پانی بھر لاتی تھی کیونکہ دونوں بچے اسکول گئے ہوئے ہوتے تھے اور شام کو یہ دونوں بچوں کا کام تھا کہ وہ پانی بھر کر لائیں۔ اس میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ نور احمد نے انہیں پلاسٹک کی بالٹیاں لا کر دے دی تھیں جو کہ ہلکی تھیں اور انہیں آسانی سے اٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ دونوں انہی بالٹیوں میں پانی بھر لاتے تھے اور وہ رات بھر کے استعمال کے لئے کافی ہو جاتا تھا۔ صبح کو تو شاکرہ اور پانی لے ہی آتی تھی۔

اس شام بھی افشاں اور عمران نے اپنی اپنی بالٹیاں لے جا کر نل کے سامنے قطار میں لگا دی تھیں۔ نل میں ابھی پانی آنا شروع نہیں ہوا تھا۔ کچھ دیر اور انتظار کرنے کی

ضرورت تھی چنانچہ دونوں بچے بالٹیاں وہاں قطار میں لگا کر واپس گھر آ گئے تھے۔

"ابا کل میرا رزلٹ آنے والا ہے۔" افشاں نے اپنے باپ سے کہا۔ وہ اس وقت پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی اور اس نے اس سال پانچویں کا امتحان دیا تھا۔ افشاں پڑھنے میں بہت تیز رہی تھی اور اس نے اسکول میں ہمیشہ بہت اچھے نمبر حاصل کئے تھے۔ اس کی استانیاں اس سے بہت خوش تھیں اور ان کا خیال تھا کہ افشاں کو اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملے تو وہ کافی ترقی کر سکے گی۔ مگر سب کو معلوم تھا کہ وہ ایک سبزی فروش کی بیٹی ہے۔ افشاں نے یہ بات کسی سے چھپائی نہیں تھی۔

"ہاں، تم نے بتایا تھا۔" نور احمد نے اس کی بات سن کر کہا۔ "مگر تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟ تم تو ویسے بھی پاس ہو جاؤ گی۔"

"پاس تو میں ہو جاؤں گی ابا!" افشاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ کیسے نمبروں سے پاس ہوتی ہوں اور اس کے بعد مجھے آگے بھی پڑھنا ہے پرائمری اسکول کی پڑھائی تو اب ختم ہو جائے گی۔ اب مجھے ہائی اسکول میں داخلہ دلوا دینا۔"

"ضرور، کیوں نہیں۔" نور احمد کے بجائے شاکرہ نے جلدی سے کہا۔ "تم ہائی اسکول میں پڑھنا اور اس کے بعد انشاء اللہ کالج میں۔ میں تو چاہتی ہوں تم ڈاکٹر بنو، ہائے اللہ۔ ڈاکٹرنیاں کتنی اچھی لگتی ہیں مجھے۔ بہت ہی پیاری لگتی ہیں۔ ہاتھ میں آلہ لئے، سفید کوٹ پہنے، ٹھک ٹھک چلتی ہوئی گٹ پٹ انگریزی بولتی ہوئی۔ میں چاہتی ہوں تم بھی ایک دن انہی جیسی بن جاؤ۔"

"اگر خدا نے زندگی اور توفیق دی تو ضرور بنوں گی۔" افشاں نے مسکرا کر اپنی ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ "مجھے خود بھی ڈاکٹر بننا بہت اچھا لگتا ہے، اماں! مگر ڈاکٹری کی پڑھائی کے لئے پیسہ بہت چاہئے ہوتا ہے۔ اماں! ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں ہے؟"

"اس کی فکر کرنا تمہارا نہیں ہمارا کام ہے۔" نور احمد نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "جب وہ وقت آئے گا تب کچھ نہ کچھ اور کام کر لیں گے۔"

"ابا! تم نے سبزی بیچنے کے بجائے کوئی اور کام کیوں نہیں کیا؟" افشاں نے اس سے شکایتاً کہا۔ "تم کوئی ایسا ہنر سیکھ لیتے جس میں زیادہ آمدنی ہوتی۔ موٹر مکینک، لوہار، پلمبر میسن یا کوئی ہنرمند کاریگر بن جاتے۔ پھر تم مڈل ایسٹ چلے جاتے کتنے ہنرمند لوگ بھاگ بھاگ کر مڈل ایسٹ جا رہے ہیں اور وہاں سے جھولیاں بھر بھر کر روپے کما کر لا رہے ہیں۔ پھر ہمارے گھر میں بھی ٹی وی ہوتا، فریج ہوتا، ٹیپ ریکارڈر ہوتا اور دنیا بھر کی بہت سی

چیزیں ہوتیں۔"

"سب سے پہلی بات تو یہ ہوتی بیٹی کہ یہ ہمارا گھر ہی نہ ہوتا۔" نور احمد نے ایک زہرخند کے ساتھ کہا۔ "اگر ہمارے پاس بہت زیادہ پیسہ ہوتا تو بھلا ہم ایسی جگہ کیوں رہتے؟ ہم کہیں اور مکان لے کر کیوں نہ رہتے؟"

"خیر، کوئی بات نہیں۔" شاکرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمارا بیٹا عمران جب بڑا ہو جائے گا تو وہ بہت اچھی سی نوکری کرے گا، بڑا افسر بنے گا اور پھر ہم لوگ یہاں سے کسی دوسری جگہ چلے جائیں گے۔"

"چلو تب تک ہم سب لوگ یہیں رہتے ہیں۔" نور احمد نے ہنستے ہوئے مزاحیہ انداز میں کہا اور سب لوگ اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ اس معصوم ہنسی کی روشنی جس میں ایک صاف ستھری اور پُرمسرت زندگی کے حصول کی سیدھی سادی اور فطری خواہش چھپی ہوئی تھی، اس چھوٹے سے گھر میں پھیل گئی اور ذرا سی دیر کے لئے جیسے اس کے در و دیوار جگمگا اٹھے اور انہیں ایک نئی شکل و صورت مل گئی۔ خوشیاں اگر حاصل نہیں تھیں تو کیا ہوا۔ ان کے حصول کی تمنا تو تھی اور جدوجہد کا ایک جذبہ تو تھا۔ یہی کیا کم بڑی بات تھی! امید اور جدوجہد۔ ساری دنیا امید کے نور سے روشن ہے۔ جہاں امید ہے اور جدوجہد ہے وہاں زندگی کی حرارت ہے۔

اس وقت کسی بچے نے باہر سے آ کر یہ مژدہ سنایا کہ پانی آ گیا ہے۔ دونوں بچے یہ خبر سنتے ہی باہر چلے گئے۔ انہیں اپنی اپنی بالٹیاں بھر کر لانی تھیں۔ آج اگرچہ نور احمد جلدی گھر آ گیا تھا اور وہ خود بھی پانی بھر کر لا سکتا تھا لیکن یہ ایک قسم کا ضابطہ بن گیا تھا کہ شام کا پانی بچے خود بھر کر لاتے تھے اور یہ انہی کی ڈیوٹی تھی۔ جسے وہ خوشی خوشی پورا کرتے تھے۔

ان دونوں کو گئے ہوئے کچھ دیر ہوئی تھی کہ نور احمد کو شاکرہ نے کچھ سودا خریدنے کے لئے باہر بھیج دیا۔ نور احمد باہر نکل کر دکان تک گیا تھا اس نے سوچا کہ ذرا نل کے پاس جا کر وہاں کا بھی جائزہ لے لے اور یہ دیکھ لے کہ بچوں کی باری آنے میں کتنی دیر ہے۔

وہ جب نل کے قریب پہنچا تو اس نے افشاں کو حمیدہ کے ساتھ لڑتے ہوئے پایا۔ حمیدہ کی عمر افشاں سے ایک آدھ سال زیادہ ہو گی اور وہ بھی اس بستی کی رہنے والی ایک بچی تھی لیکن بے حد لڑاکا اور تیز و طرار قسم کی اور اس معاملے میں وہ بالکل اپنے باپ پر گئی تھی جو ایک بے حد بدمزاج اور تندخو آدمی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اس کا نام عبدالرحیم تھا اور وہ کسی نیم سرکاری ادارے میں چوکیدار تھا لیکن اس کا رہن سہن اور

ٹھاٹ باٹ اس بستی کے لوگوں سے کافی مختلف تھا۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ خوشحال تھا۔

لوگوں کا اس کے بارے میں یہ کہنا تھا کہ وہ اور اس کے دفتر کے دوسرے لوگ اس نیم سرکاری ادارے کے اسٹور سے جہاں عبدالرحیم چوکیدار تھا مال چراتے تھے اور اسے بازار میں فروخت کر کے رقم آپس میں بانٹ لیتے تھے لیکن کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ عبدالرحیم کے منہ پر یہ بات کہہ دیتا۔

عبدالرحیم طبعاً بہت خرانٹ قسم کا آدمی تھا اور اسے بستی میں آئے ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ جس نیم پختہ مکان میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا وہاں آج سے کوئی سال بھر پہلے منظور حسین اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ منظور حسین لالو کھیت میں غلے کی ایک دکان میں سامان ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ اس کی بیوی ایک عرصے سے تپ دق کا شکار تھی اور ٹھیک علاج نہ ہونے کے باعث روز بروز زیادہ بیمار اور کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ ایک روز وہ دونوں چھوٹے بچوں اور منظور حسین کو تنہا چھوڑ کر اس دنیا سے سدھار گئی۔ منظور حسین اس کے بعد زیادہ دن تک یہاں نہیں رہ سکا۔ اس کا بچوں کا ساتھ تھا چنانچہ اس نے اپنا مکان فروخت کر دیا اور بچوں کو اپنے ساتھ لے کر وقتی طور پر اپنی بہن کے گھر چلا گیا جو کورنگی میں رہتی تھی۔

منظور حسین کے مکان کو خریدنے والا عبدالرحیم تھا جو اپنے خاندان کے ساتھ آکر یہاں آباد ہو گیا تھا لیکن عبدالرحیم اور اس کے گھر والوں کے تعلقات بستی والوں سے بس واجبی واجبی ہی رہے اور ان میں کبھی بھی گرمجوشی اور بے تکلفی پیدا نہ ہو سکی کیونکہ عبدالرحیم خود کو بہت لئے دیئے رہتا تھا اور لوگوں سے زیادہ ملتا جلتا نہیں تھا۔ اسی طرح اس کے گھر والے بھی بستی کے لوگوں میں گھلے ملے نہیں تھے۔

عبدالرحیم کا گھر نور احمد کے گھر سے بالکل قریب تھا اور عبدالرحیم اور نور احمد ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے۔ ان کے گھر والے بھی ایک دوسرے سے بخوبی واقف تھے لیکن گھروں میں آنا جانا برائے نام تھا۔ اسی طرح نور احمد اور عبدالرحیم کے درمیان تعلقات بھی بس دعا سلام تک ہی محدود تھے۔

افشاں اور حمیدہ میں بڑے زور کی تکرار ہو رہی تھی۔ دونوں نل کے سامنے [illegible] کے قریب کھڑی ہوئی تھیں اور افشاں حمیدہ پر الزام لگا رہی تھی کہ حمیدہ نے اپنی بالٹی افشاں کی بالٹی کے آگے لگا دی' جبکہ اصل میں حمیدہ کی بالٹی کافی پیچھے تھی اور حمیدہ اس

الزام سے انکار کر رہی تھی۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔" حمیدہ آنکھیں نکال کر افشاں سے کہہ رہی تھی۔ "میں نے بالٹی آگے نہیں رکھی' وہ پہلے سے آگے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے آکر بالٹی قطار میں لگائی تھی' تم میرے بعد میں آئی تھیں۔"

"بالکل غلط کہہ رہی ہو تم۔" افشاں نے چمک کر کہا۔ "میں اور عمران تم سے بہت پہلے آئے تھے اور قطار میں اپنی اپنی بالٹیاں لگا کر چلے گئے تھے۔ اس وقت نہ تم یہاں موجود تھیں اور نہ تمہاری بالٹی۔ تم بعد میں آئی ہو۔"

"افشاں ٹھیک کہہ رہی ہے حمیدہ۔" ایک دس گیارہ سال کے لڑکے نے کہا۔ "میں نے خود افشاں اور عمران کو یہاں آتے ہوئے اور اس لائن میں اپنی اپنی بالٹیاں لگاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تم اس وقت یہاں موجود نہیں تھیں۔ تمہاری بالٹی بھی نہیں تھی۔ تم بعد میں آئی ہو۔"

"اچھا چلو یوں ہی سہی۔" حمیدہ اکڑ کر بولی۔ "میں بعد میں آئی تھی لیکن اگر کسی نے میری بالٹی کو ہاتھ لگایا تو میں اس کا ہاتھ توڑ دوں گی۔"

اسی وقت نور احمد آگے بڑھا اور اس نے حمیدہ کی بالٹی کو اٹھا کر چند برتنوں کے پیچھے رکھ دیا۔ "بڑی بات ہے بیٹی!" اس نے نرمی اور شفقت کے ساتھ حمیدہ سے کہا۔ "جب تم بعد میں آئی ہو تو پھر اپنے برتن کو بھی پیچھے رہنے دو۔ جو پہلے آئے گا اس کا حق پہلے ہو گا۔ جو بعد میں آئے گا اس کو بعد میں پانی ملے گا۔ یہ سیدھی سی بات ہے۔ بیٹی! اس میں جھگڑا نہیں کرنا چاہیئے۔"

حمیدہ نے خونی نظروں سے نور احمد کو گھورا' زبان سے کچھ نہ کہا اور پیر پٹختی ہوئی اپنے گھر کی طرف واپس چلی گئی۔ وہاں موجود لوگوں نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور ننھے خان نامی ایک شخص بولا۔ "ذرا تیور تو دیکھو اس کے' معلوم ہوتا ہے اس کا باپ اس علاقے کا تھانیدار لگا ہوا ہے۔"

"وہ اپنے باپ کو بلانے کے لئے ہی گئی ہے۔" پہلے والے لڑکے نے کہا۔ "ذرا سی کوئی بات ہوتی ہے تو وہ فوراً اپنے باپ کو بلا لاتی ہے اور وہ آکر جھگڑا شروع کر دیتا ہے۔ کل اس نے مسعود کو ایک تھپڑ بھی مارا تھا۔ مسعود نے حمیدہ کی گیند لے لی تھی۔"

اس لڑکے کی یہ بات سن کر نور احمد وہاں رک گیا۔ اس کے دونوں بچے وہاں موجود تھے جو اسے اپنی دونوں آنکھوں کی طرح عزیز تھے۔ وہ یہ کب برداشت کر سکتا تھا کہ کوئی

ان کی طرف ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھتے۔ ان بچوں کے لئے تو وہ ابھی نہ جانے کیا کیا
رہا تھا اور کس حد تک آگے جانے کے لئے تیار تھا۔ اسے کسی جھگڑے فساد کا شوق
تھا لیکن وہ اپنے بچوں کو پورا تحفظ اور اعتماد فراہم کرنا چاہتا تھا۔

لڑکے کا کہنا سچ ثابت ہوا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد عبدالرحیم وہاں آ موجود ہوا۔
اس کے ساتھ تھی اور عبدالرحیم سخت لال پیلا نظر آ رہا تھا۔

"کون ہے وہ لڑکی جس نے حمیدہ کی بالٹی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر پیچھے رکھ دیا
عبدالرحیم نے گرج کر کہا۔

"یہ ہے .... یہ .... افشاں نام ہے اس کا۔" حمیدہ نے افشاں کی طر
اشارہ کیا اور افشاں ایک دم سہم گئی اور پیچھے ہٹنے لگی۔ عبدالرحیم نے افشاں کو کڑ
تیوروں سے گھور کر دیکھا اور اس سے کچھ کہا تو نہیں لیکن اپنی بیٹی حمیدہ کی بالٹی اٹھا
افشاں کی بالٹی سے آگے رکھ دی۔ افشاں کچھ نہ بولی اور اس نے خوفزدہ نگاہوں سے اپ
باپ کی طرف دیکھا۔

"غلط بات مت کرو بھائی عبدالرحیم!" نور احمد نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے
نرمی سے کہا۔ "افشاں کی بالٹی پہلے سے وہاں موجود تھی اور حمیدہ بعد میں آئی ہے۔ ح
کی بالٹی پیچھے رہے گی۔ جو قاعدہ ہے وہ سب کے لئے ہے۔ بالٹی کو اٹھا کر وہیں رکھ دو جہاں
وہ پہلے رکھی ہوئی تھی۔"

"کیوں؟" عبدالرحیم نے ڈھٹائی سے آنکھیں نکالتے ہوئے کہا۔ "کیوں پیچھے
رکھوں حمیدہ کی بالٹی کو؟ وہ پہلے آئی ہے۔ میں نے تو گھنٹے بھر پہلے اسے بھیجا تھا۔ اس کی
بالٹی پیچھے کیسے ہو سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے تم نے اسے بہت پہلے بھیجا ہو لیکن اس کی بالٹی لائن میں افشاں کی
بالٹی سے آگے نہیں تھی، عبدالرحیم!" نور احمد نے ایک بار پھر اسے سمجھانا چاہا۔ "اس
جھگڑے کی کون سی بات ہے؟ حمیدہ کا نمبر بھی ابھی تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ اس
پہلے افشاں کو اپنی بالٹی بھرنے دو۔"

"نہیں۔" عبدالرحیم اڑیل بیل کی طرح اڑ گیا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ حمیدہ پہلے
تھی، لائن میں بالٹی پہلے اس نے لگائی تھی، پہلے وہ پانی بھرے گی اور اس کے بعد
دوسرے کا نمبر آئے گا۔"

"ہرگز نہیں۔" نور احمد کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ "یہ سراسر ناانصافی اور دھاندلی

جس کی باری پہلے تھی وہ پہلے پانی بھرے گا اور پہلے باری افشاں کی ہے۔ افشاں نے پہلے
بالٹی لائن میں لگائی تھی۔ کسی سے بھی پوچھ لو۔ سب لوگوں کو یہ بات معلوم ہے۔"

"مجھے کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" عبدالرحیم ایک دم وحشیوں کی
طرح گرجنے لگا۔ "حمیدہ نے مجھے جو بتا دیا ہے وہ ٹھیک ہے۔ میں اس بات پر یقین کرتا
ہوں کہ اس نے پہلے بالٹی لگائی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے عبدالرحیم تو اچھی طرح سن لو، میری بیٹی بھی جھوٹ نہیں
بولتی۔" نور احمد نے آگے بڑھ کر عبدالرحیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "وہ بھی
صرف سچ بولتی ہے اور سچ یہ ہے کہ اس نے بالٹی پہلے لائن میں لگائی تھی .... تم
مہربانی کر کے بالٹی ہٹا لو۔"

"کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ بالٹی کو ہاتھ لگائے۔" عبدالرحیم نے سینہ تان
کر کہا۔ "سالے کے ہاتھ پیر توڑ کر ڈال دوں گا۔"

"رہنے دو ابا۔" افشاں نے حالات کی بگڑتی ہوئی صورت کو محسوس کیا اور اپنے باپ
کا ہاتھ پکڑ کر خوفزدہ آواز میں بولی۔ "ان لوگوں کو پہلے پانی بھر لینے دو۔ ہم بعد میں بھر لیں
گے۔"

کوئی چھ سات برتنوں کا فرق تھا۔ زیادہ سے زیادہ پونے گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی۔ پانی
اس وقت کافی تیز دھار سے آ رہا تھا اور برتن جلدی جلدی بھرتے جا رہے تھے۔ اگر نور احمد
رک جاتا تو کوئی ایسی بڑی بات نہیں تھی۔ ایک بڑھتے ہوئے جھگڑے کو روکا جا سکتا تھا۔

اور یہ بات عبدالرحیم کے بارے میں بھی کہی جا سکتی تھی۔ اگر وہ رک جاتا تو ایک
بڑے المیے سے بچا جا سکتا تھا۔

لیکن نور احمد کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ سوال گھنٹے
آدھے گھنٹے کی تاخیر کا نہیں تھا، سوال دھاندلی دھونس اور بے ایمانی کا تھا۔ عبدالرحیم
سراسر زیادتی کر رہا تھا اور اس کے بچوں کے سامنے اور دوسرے تمام لوگوں کے سامنے
اسے ذلیل و خوار کر رہا تھا۔ نور احمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ افشاں اور عمران اس سے
کبھی جھوٹ نہیں بولیں گے۔ ان دونوں نے اس کو یہ بتایا تھا کہ ان کی بالٹی حمیدہ کی بالٹی
سے آگے تھی اور حمیدہ جھوٹ بول رہی تھی۔

"جھگڑا مت بڑھاؤ عبدالرحیم!" نور احمد نے افشاں کو ہاتھ سے پیچھے دھکیلتے ہوئے
کہا۔ "پانی پہلے افشاں بھرے گی اس کے بعد حمیدہ۔"

"پانی پہلے حمیدہ بھرے گی اس کے بعد افشاں۔" عبدالرحیم گرجا۔ "میں کسی کو نل کے پاس نہیں آنے دوں گا۔"

"ارے، مت جھگڑا کرو بھلے لوگو!" بوڑھے درزی دلشاد خان نے کہا جس کا مٹکا نل کے قرب پہنچنے والا تھا۔ "چلو میں اپنا مٹکا پیچھے کرلیتا ہوں۔ چل بیٹی افشاں تو بھر لے اپنی بالٹی۔ پھر تو بھرلینا حمیدہ۔ میں تم دونوں کے بعد بھرلوں گا۔ بلکہ سب سے بعد میں بھرلوں گا۔ میں اپنی باری چھوڑ دیتا ہوں۔"

"نہیں چاچا!" نور احمد نے کہا۔ "تم اپنی باری کیوں چھوڑو؟ تمہاری باری ہے۔ اپنی باری لو۔ افشاں اپنی باری پر پانی بھرلے گی اور حمیدہ اس کے بعد بھرے گی۔ اس سیدھے سے معاملے میں جھگڑے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی اس نے آگے بڑھ کر حمیدہ کی بالٹی کو قطار سے اٹھانے کی کوشش کی لیکن اسی وقت عبدالرحیم نے اسے للکارا۔

"بالٹی کو ہاتھ مت لگانا سالے سبزی فروش۔" عبدالرحیم غرایا۔ "ورنہ زندہ زمین میں گاڑ دوں گا۔"

"ابے مرگئے سالے زندہ زمین میں گاڑنے والے۔" نور احمد نے پھنپھناتے ہوئے کہا۔ "ایک تو چوری اور اوپر سے سینہ زوری۔ ہنہ۔" اور اس نے جلدی سے بالٹی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اسی وقت عبدالرحیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

نور احمد کے ہاتھ ایک محنت کش کے ہاتھ تھے۔ وہ تو اس وقت سے ان ہاتھوں سے بوجھ ڈھو رہا تھا، محنت کر رہا تھا۔ ٹھیلا دھکیل رہا تھا جب اس کی عمر صرف دس سال کی تھی اور یہ ہاتھ سارا سال مصروف رہتے تھے۔ جاڑا ہو، گرمی ہو، بارش ہو، نور احمد کا کام جاری رہتا تھا۔ ان ہاتھوں نے تو بڑا گرم و سرد برداشت کیا تھا اور برسوں کی محنت نے ان کو فولاد بنا دیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکا دیا اور اپنے ہاتھ کو عبدالرحیم کے ہاتھ سے چھڑا لیا لیکن اسی وقت عبدالرحیم نے غصے اور جوش کے عالم میں اپنے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر ایک مکا مارا اور اپنا گھٹنا اس کے پیٹ پر مارنے کی کوشش کی۔

بہت سے لوگ بیچ بچاؤ کرنے آ گئے۔ افشاں اور عمران سہم گئے اور جلدی سے پیچھے ہٹ گئے۔ حمیدہ وہاں سے اپنے گھر کی طرف بھاگی۔ لوگوں نے ان دونوں کو الگ الگ کر دیا لیکن دونوں کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور زبانوں سے مغلظات کا سیلاب امنڈ رہا تھا۔ لوگوں نے انہیں ایک دوسرے سے الگ تو کر دیا لیکن الگ ہوتے ہوئے بھی

عبدالرحیم نے نور احمد کے سینے پر اچھل کر ایک ٹھوکر ماری اور نور احمد اس اچانک اور بھرپور ٹھوکر کی تاب نہ لا کر پانی کے برتنوں کے اوپر گرا بہت سے برتن اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ کچھ مٹی کے برتن ٹوٹ گئے اور ساری قطار درہم برہم ہو کر رہ گئی۔

نور احمد برتنوں میں الجھ گیا اور اسے دوبارہ اٹھنے میں دو ایک منٹ لگ گئے لیکن جب وہ اٹھا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں تانبے کی ایک بھاری گگری تھی۔

اصل میں تو نور احمد نے اس گگری کو اس لئے پکڑا تھا کہ اٹھنے میں اس سے سہارا لے سکے۔ گگری کی پتلی گردن اس کے دونوں ہاتھوں میں تھی اور اس نے اٹھتے وقت اس کا سہارا لیا اور پھر وہ گگری کو ہاتھوں میں تھامے تھامے اٹھ کھڑا ہوا۔

عبدالرحیم اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کمر پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے خشمگیں اور فاتحانہ اور قہر بھری نظروں سے نور احمد کو گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تضحیک اور تحقیر کا انداز بھی نمایاں تھا۔

ایک آگ تھی کہ نور احمد کے تلووں سے شروع ہوئی اور اس کے سر کے بالوں کی جڑوں تک کو جھلساتی ہوئی اس کے وجود کے آر پار ہو گئی۔ اسے نہیں معلوم کہ اس نے کیا کیا، کیوں کیا، کیسے کیا۔ اس اچانک نہایت شدت کے ساتھ بھڑک اٹھنے والی آگ نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ اس آگ نے اس کے تمام ہوش حواس چھین لئے تھے اور اسے ایک بے لگام وحشی بنا دیا تھا۔

اس کے دونوں ہاتھ تیزی کے ساتھ حرکت میں آئے اور تانبے کی مضبوط اور بھاری گگری ایک زوردار دھماکے کے ساتھ عبدالرحیم کے سر سے ٹکرائی۔ عبدالرحیم کے حلق سے نکلنے والی کراہ بھیانک اور دلسوز تھی۔ وہ تیورا کر زمین پر گرا۔ گگری اچھل کر اس کے ساتھ ہی نیچے گری اور لڑھکتی ہوئی کچھ دور جا کر ایک مٹکے سے ٹکرا کر رک گئی۔

نور احمد کی آنکھوں کے سامنے جو منظر تھا، اس کا تو کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا اس نے۔

عبدالرحیم کا چہرہ جیسے اس کی نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکا تھا۔ اس چہرے کی جگہ کوئی کچلی ہوئی چیز تھی۔ ٹوٹی پھوٹی اور چپٹی اور سرخ رنگ کی۔ اس چیز کے ٹکڑے خون میں ڈوبے ہوئے تھے اور جگہ جگہ سے خون کی دھاریں بہہ رہی تھیں۔ جہاں آنکھیں ہونی چاہئیں تھیں، وہاں سے خون کے دو فوارے پھوٹ رہے تھے، جہاں ناک ہونی چاہئے تھی وہاں گوشت کا ایک لوتھڑا لٹک رہا تھا اور کھوپڑی کئی حصوں میں منقسم ہو

کر کسی پھٹے ہوئے تربوز کا منظر پیش کر رہی تھی۔

یہ منظر اس قدر بھیانک اور ناقابلِ یقین حد تک خوفناک اور درد انگیز تھا کہ خود نور احمد کے حلق سے ایک چیخ نکل گئی اور اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لئے۔ جو کچھ اس کے سامنے تھا اسے دیکھنے کی ہمت اس میں نہیں تھی۔

اس کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تانبے کی وہ گگری جو اس کے ہاتھ میں تھی، ایک مہلک آلۂ قتل بن جائے گی۔ اس کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا تھا کہ اس نے کس قدر شدت اور طاقت کے ساتھ تانبے کی اس بھاری بھرکم اور مضبوط گگری کو عبدالرحیم کے سر پر دے مارا تھا۔ اس نے اپنی ساری جسمانی طاقت کا استعمال کر ڈالا تھا جس کے نتیجے میں گگری کی ضرب نے عبدالرحیم کے سر اور چہرے کو کھیل کھیل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کو مرنے میں بالکل وقت نہیں لگا تھا۔

صرف چند لمحوں کے اندر اندر ایک ایسا المیہ ظہور پذیر ہو گیا تھا جس نے دو خاندانوں کی اور ان سے وابستہ بہت سے افراد کی زندگیوں کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔ اگر زمین پر گرتے وقت نور احمد کے ہاتھ میں وہ گگری نہ آ جاتی تو شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا۔

چاروں طرف ایک غل مچ گیا۔ "ارے مار دیا، مار دیا، مار دیا، ارے کسی ڈاکٹر کو بلاؤ۔ جلدی کرو۔ پانی لانا۔ جلدی سے کوئی چارپائی لے کر آؤ۔" ایک ہڑبونگ مچ گئی تھی ہر شخص اپنی اپنی بولی بول رہا تھا۔

اس وقت حمیدہ اپنے بڑے بھائی عبدالرحمٰن اور ماں اکبری کے ساتھ بھاگتی ہوئی وہاں آ گئی۔ وہ اپنی ماں اور بڑے بھائی کو بلانے گئی تھی۔ عبدالرحمٰن حمیدہ کا بڑا بھائی تھا۔ وہ عمر میں اس سے دو تین سال بڑا تھا اور اسکول میں پڑھتا تھا۔ عبدالرحمٰن کو لوگوں نے بستی میں اپنے گھر سے نکلتے، اِدھر اُدھر گھومتے یا کسی سے لڑائی جھگڑا کرتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد وہ زیادہ تر وقت اپنے گھر کے اندر ہی گزارتا تھا۔

اکبری نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ پچھاڑ کھا کر وہیں گر پڑی۔ اس کے بین زمین آسمان کو ہلائے ڈال رہے تھے۔ حمیدہ بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر رو رہی تھی اور اس کا بھائی عبدالرحمٰن حیرت اور درد کی تصویر بنا ہوا اس کے پاس کھڑا تھا۔

"یہ .... یہ کیسے ہو گیا؟ کیسے ہو گیا یہ؟" قدرے توقف کے بعد عبدالرحمٰن نے گلوگیر آواز میں لوگوں سے پوچھا۔

"آپا! یہاں سے بھاگ چلو۔" عمران نے سہم کر اپنی بہن سے سرگوشی میں کہا۔

"مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ ابا سے بھی کہو، وہ بھی یہاں سے بھاگ چلیں۔"

"تم گھر جاؤ۔" افشاں نے عمران سے آہستہ سے کہا۔ "میں یہیں موجود ہوں۔ تم امی سے کہنا کہ .... کہنا کہ..........." اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو کیا پیغام بھجوائے۔ اس کا اپنا دماغ ماؤف ہوا جا رہا تھا۔

لیکن عمران نے اس کی مشکل خود ہی آسان کر دی۔ اس نے اس کے جملے کے پورا ہونے کا انتظار نہیں کیا اور سیدھا وہاں سے اپنے گھر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ اس اثنا میں لوگ جلدی سے ایک چارپائی کہیں سے اٹھا لئے تھے اور عبدالرحیم کے زخمی جسم کو اس پر ڈال دیا گیا تھا۔

لیکن جس چیز کو انھوں نے چارپائی پر ڈالا تھا وہ عبدالرحیم کا زخمی جسم نہیں تھا۔ وہ اس کی لاش تھی۔ عبدالرحیم تو بھاری گگری کی چوٹ کھا کر اسی وقت مر چکا تھا۔ اب اس میں کیا رکھا تھا۔

نور احمد بت بنا اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا پارہ پارہ ہو جانے والا دماغ اس معاملے کی سنگینی کا اور اس کے نتائج و عواقب کا احاطہ کرنے کی کوشش میں مصروف تھا اور اسے اپنے چاروں طرف گھور اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ اندھیرا اور صرف اندھیرا۔ اندھیرے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اور وہ اس لامحدود اندھیرے میں بالکل اکیلا تھا۔

ان چند لمحوں کے اندر اندر نور احمد کے دماغ پر ایسی قیامتیں گزر گئیں جو ہفتوں، دنوں اور برسوں کے عذاب پر محیط تھیں۔ ان تیزی کے ساتھ دوڑتی بھاگتی مختصر سی ساعتوں کے دوران اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا جو اب اسے اپنا مقدر نظر آ رہا تھا۔

زندگی کا ایک دور ایک ہی جھٹکے میں، ہاتھ کی ایک معمولی سی جنبش کے ساتھ، ذہن کی ایک جنونی، لمحاتی خلش کے ساتھ ختم ہو چکا تھا اور اب جس دور کا آغاز ہونے والا تھا اس میں یا تو پھانسی کا پھندا مقدر تھا اور یا پھر ایک ایسا دردناک عذاب جس کو جھیلتے ہوئے زندگی کے زہر کو قطرہ قطرہ پینا تھا۔

نور احمد پڑھا لکھا تو نہیں تھا مگر وہ ایک پکی عمر کا آدمی تھا اور صبح سے لے کر شام تک شہر کے مختلف علاقوں میں چکر لگاتا رہتا تھا اور عملی زندگی کے تجربات کو اپنے دامن میں سمیٹے پھرتا تھا۔ وہ بہت سی باتوں کے بارے میں اتنا جانتا تھا جتنا کہ بعض اوقات پڑھے لکھے لوگ بھی نہیں جانتے تھے اور اپنی موجودہ صورت حال کا اس نے صرف چند سیکنڈ میں اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک ذہین اور سمجھدار آدمی تھا اور صبح سے شام تک کی

شہر نوردی کے دوران اس نے طرح طرح کے منفرد تجربات کا ایک ذخیرہ اپنے پاس جمع کر کے رکھا تھا جس سے وہ کافی فائدہ اٹھاتا تھا۔ سارا معاملہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔

اور یہ قتل اس نے کہیں تنہائی میں نہیں کیا تھا۔ بستی میں پانی کے نل کے پاس بہت سے بچوں اور بڑوں کی موجودگی میں کیا تھا۔ عینی گواہوں کی اتنی بڑی تعداد موجود تھی کہ بچ نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ کتنی بہت سی آنکھوں نے یہ منظر دیکھا تھا کہ اس نے تانبے کی گگری اٹھا کر عبدالرحیم کے سر پر دے ماری تھی اور اب عبدالرحیم اپنے شکستہ چہرے اور ٹوٹے پھوٹے سر کے ساتھ خون میں لتھڑا ہوا ایک بے جان لاشے کی شکل میں وہاں پڑا ہوا تھا۔

لمحوں میں نور احمد نے اپنے آئندہ کے اقدامات کے بارے میں فیصلہ کر لیا۔ ہاں وہ قاتل تو تھا اور اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ایک مفرور قاتل نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس کا گھر تھا' جوان بیوی تھی' بیٹی تھی جو اب دس سال کی تھی' بیٹا تھا جو آٹھ سال کا تھا۔ اگر وہ موقعہ واردات سے فرار ہو جاتا تو کیا کرتا؟ وہ خود کیا کرتا اور اس کے گھر والے کیا کرتے؟

اسے خود پولیس اور گرفتاری کے خوف سے عمر بھر اِدھر اُدھر چھپتے رہنا پڑتا۔ وہ کبھی آزادی کے ساتھ تازہ ہوا میں سانس نہیں لے سکتا تھا اور سورج کی روشنی اور چمکیلی دھوپ میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا' اور اس کے گھر والے۔ وہ ایک طویل عرصے تک تو پولیس والوں کے ہاتھوں ذلت و خواری اور اذیت و اسیری کا نشانہ بنتے رہتے اور پھر ساری دنیا کے لوگوں کی نگاہوں میں ان کے لئے نفرت' تحقیر' اور تذلیل کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ ایک مفرور قاتل کی بیوی' ایک مفرور قاتل کی بیٹی' ایک مفرور قاتل کا بیٹا۔ اس طرح اس کے گھر والوں کو مخاطب کیا جاتا۔ وہ کہاں جا سکتے تھے؟ کیا کر سکتے تھے؟ انہیں تحفظ فراہم کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

نور احمد نے اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کیا اور اسی لئے وہ واردات کے بعد اپنی جگہ پر خاموشی اور مضبوطی کے ساتھ کھڑا رہا اور اس نے وہاں سے بھاگنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔

دو تین آدمیوں نے فوراً ہی آگے بڑھ کر نور احمد کو بازوؤں سے پکڑنے کی کوشش کی۔ انہیں خدشہ تھا کہ وہ موقعہ واردات سے بھاگ نہ جائے لیکن نور احمد نے

مزاحمت نہیں کی۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے بھائی!" اس نے ان لوگوں سے نرمی سے کہا۔ "میں کہاں جا رہا ہوں؟ کیا اپنے گھر کو اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر کہیں جا سکتا ہوں؟ تم خود ہی سوچو۔ میں تو خود اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر رہا ہوں۔"

"تم نے زیادتی کر ڈالی نورے!" اس کے دوست مبین نے جو تالے چابی کا کام کرتا تھا' اس کے پاس آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "تمہیں گگری اتنے زور سے اس کے سر پر نہیں مارنی چاہئے تھی۔"

نور احمد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اس کرب انگیز اور خوفناک منظر کو دیکھنے لگا جس کی تخلیق اس نے خود کی تھی۔ مقتول کی بیوہ اکبری پر بے ہوشی طاری تھی اور آس پاس جمع ہو جانے والی عورتیں اسے سہارا دے کر کسی قریبی گھر میں لے جا رہی تھیں۔ مقتول کا بیٹا عبدالرحمٰن اپنی چھوٹی بہن حمیدہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے ساکت و صامت کھڑا ہوا تھا۔ حمیدہ زار و قطار رو رہی تھی اور عبدالرحمٰن کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔

اور ان سب لوگوں سے الگ ایک طرف افشاں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جسم میں سے خون کی ایک ایک بوند نکال لی گئی ہو۔ وہ بالکل سفید پڑ گئی تھی۔

نور احمد نے افشاں کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ اپنی بیٹی کی آنکھوں کے سامنے اس نے کون سا منظر پیش کیا تھا اور اب مزید وہ اسے کیا دکھانے جا رہا تھا؟

بھلا اس بات کو کتنی دیر ہوئی تھی جب وہ لوگ اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے تھے اور شاکرہ اپنی بیٹی کو ڈاکٹرنی اور بیٹے کو اعلیٰ افسر بنانے کی بات کر رہی تھی۔ تب وہ سب کس قدر خوش تھے اور ان کی آنکھوں میں کیسے کیسے رنگا رنگ اور سہانے خواب اتر آئے تھے۔ ان میں سے ہر کوئی اپنے ڈھنگ سے کوئی خواب دیکھ رہا تھا اور پھر ذرا دیر بھی نہیں گزری تھی کہ سارے خواب یوں چکنا چور ہو گئے تھے۔ بعض اوقات تبدیلی کا عمل بھی کس قدر برق رفتار ہوتا ہے۔ ایک پلک جھپکتے میں انسان کی دنیا کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور اکثر اوقات تو اس میں انسان کے اپنے عزم اور ارادے کو بالکل دخل نہیں ہوتا۔

کیسے کیسے خوابوں کا سب روپ سنگھار
اک ساعت میں درہم برہم ہوتا ہے۔

پولیس آئی اور نور احمد کو موقعہ واردات سے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ اس نے مزاحمت کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی تھی اور سارا وقت وہیں پانی کے نل کے پاس جائے وقوعہ پر موجود رہا تھا۔ لوگ نل سے پانی بھرتے رہے تھے اور کسی نے افشاں اور حمیدہ کی بالٹیاں میں بھی پانی بھر بھر کر ان کے گھروں کو پہنچا دیا تھا۔

جب نور احمد کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی گئیں تو اس وقت اس کی بیوی شاکرہ، بیٹی افشاں اور بیٹا عمران وہاں موجود تھے۔ ان لوگوں نے بستی کے دوسرے سینکڑوں لوگوں کے ساتھ نور احمد کی گرفتاری کا منظر دیکھا۔ پولیس نے ضابطے کی کارروائی کی، گواہوں کے بیانات قلمبند کئے اور اس کے بعد عبدالرحیم کی لاش کو گاڑی میں ڈلوا کر پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال بھجوا دیا اور پھر اس کے بعد نور احمد کو تھانے پہنچا دیا گیا۔

تھانے میں معاملات بڑے پُرسکون رہے۔ نور احمد کے ساتھ پولیس کو کوئی سختی کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور نہ بہت زیادہ تفتیشی کام میں سر کھپانا پڑا۔ سیدھا سادا ایک عام نوعیت کا کیس تھا۔ دو آدمیوں کے درمیان نل سے پانی بھرنے پر جھگڑا ہوا، ایک آدمی نے تانبے کی گگری اٹھا کر دوسرے کے سر پر مار دی اور وہ مر گیا۔ قصہ ختم۔

نور احمد نے اپنے جرم کا اعتراف کرنے کے ساتھ ساتھ پولیس کو اس واقعے کا پورا پس منظر بھی بتا دیا تھا۔ اس نے اپنے تفصیلی بیان میں بتایا کہ اشتعال انگیزی مقتول کی طرف سے کی گئی اور مقتول نے اس کو زدوکوب کیا اور بار بار اس پر حملے کئے۔

"میرا ارادہ ہرگز اسے قتل کرنے کا نہیں تھا۔" نور احمد نے اپنی صفائی میں کہا۔ "خدا گواہ ہے میں اس کو قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری اس کی نہ کوئی دشمنی تھی، نہ پہلے کبھی کوئی جھگڑا ہوا تھا۔ وہ تو بس اس روز بچوں کے بالٹی رکھنے پر تکرار ہو گئی تھی جس نے ایسی صورت اختیار کر لی۔" اس نے واقعات کی تفصیل کو من و عن بیان کر دیا۔

یہ بات خود نور احمد کو بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر عدالت میں یہ ثابت ہو جائے کہ قتل کا ارتکاب جان بوجھ کر اور ایک باقاعدہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت نہیں کیا گیا ہے بلکہ ملزم سے یہ جرم کسی خاص اضطراری اور جذباتی کیفیت کے تحت سرزد ہوا ہے جس میں کسی وقتی اشتعال کو دخل ہے تو اس صورت میں عدالت سزا میں رعایت کر دیتی ہے۔ اسی چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے شروع ہی سے ایک سوچا سمجھا موقف اختیار کیا۔

اگلے روز نور احمد کی بیوی شاکرہ دونوں بچوں کو لے کر اس سے ملاقات کرنے حوالات آئی اور ان دونوں نے اس ملاقات میں بہت سی باتیں طے کر لیں۔ سب سے پہلے تو نور احمد نے اپنی بیوی کو یہ ہدایت کر دی کہ وہ بچوں کو لے کر کبھی بھی حوالات یا کورٹ نہ آئے۔ "تمہارے پاس جو بھی تھوڑے بہت زیورات ہیں ان کو فروخت کر دو۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "اور گھر کا خرچ چلاؤ۔ کچھ بھی ہو جائے بچوں کی پڑھائی کا نقصان نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بچے ہی تو ہمارا سہارا ہیں۔ ہم خود تو برباد ہیں لیکن ہم انہیں نہیں برباد ہونے دیں گے۔"

"لیکن تمہارے مقدمے کے لئے بھی تو رقم چاہئے ہے۔" شاکرہ نے روتے ہوئے کہا۔ "وکیل کرنا ہے ضمانت کروانی ہے۔"

"اس چکر میں زیادہ روپیہ بہانے کی ضرورت نہیں ہے شاکرہ!" اس نے اپنی بیوی سے گہری افسردگی کے ساتھ کہا۔ "مجھے کسی جھوٹے مقدمے میں نہیں پھانسا گیا ہے۔ جو کچھ بھی ہے سچ ہی تو ہے اور میں نے پولیس کو دیئے گئے اپنے بیان میں اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے۔ بس یہی تو بات ہے کہ میں نے قتل جان بوجھ کر نہیں کیا جو کچھ بھی ہوا وہ میری مرضی کے بغیر ہو گیا۔"

"مگر یہ بھی تو عدالت میں کوئی وکیل ہی ثابت کرے گا۔" شاکرہ نے کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو۔" نور احمد نے اسے سمجھایا۔ "ایک بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ اب میری زندگی کی اہمیت نہیں ہے۔ اہمیت بچوں کی زندگی کی ہے۔ انہیں زندہ رہنا ہے، پڑھنا لکھنا ہے، ترقی کرنا ہے۔ ان پر دھیان دو، کچھ بھی کرو شاکرہ میرے بچوں کا خیال رکھنا۔ ان کو دربدر مت ہونے دینا۔ میں تو اب کچھ نہیں کما سکوں گا۔ میرے ہاتھ پیر تو کٹ گئے ہیں۔ خدا تمہاری زندگی کو سلامت رکھے کچھ نہ کچھ کرتی رہنا۔ بچوں کو تکلیف نہ ہو۔ بس ان کو سب کچھ میسر آتا رہے۔"

"تم بچوں کی فکر مت کرو۔" شاکرہ نے گلوگیر آواز میں اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں زندہ ہوں تو سب کچھ سنبھال لوں گی۔ میرے ہاتھ پیروں میں ابھی بہت جان ہے۔ کہیں نوکری کر لوں گی۔ کسی کارخانے میں کام ڈھونڈ لوں گی۔ خیرن اور اس کی بہن شمشاد کسی فیکٹری میں کام کرتی ہیں، ان سے بات کروں گی، مجھے بھی کہیں نہ کہیں کام مل جائے گا۔"

"آج تو افشاں کا رزلٹ آیا ہو گا؟" نور احمد نے کہا۔ "افشاں کو تو اسکول جانا چاہئے تھا اور تم دونوں بچوں کو لے کر یہاں آ گئیں۔ اچھا اب انہیں لے جاؤ۔ یہ جگہ بچوں کے

لئے نہیں ہے۔"

شاکرہ دونوں بچوں کو لے کر وہاں سے چلی آئی۔ اس کے جانے کے بعد اس حوالاتی نے جسے گزشتہ رات کسی وقت لا کر حوالات میں بند کیا گیا تھا اور جس سے نور احمد کی ابھی تک کوئی خاص بات چیت نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ شخص ساری رات سوتا رہا تھا اور جب شاکرہ بچوں کو لے کر آئی تھی تو اس وقت بھی سو رہا تھا۔ نور احمد کی طرف دلچسپی اور تجسس بھری نظروں سے دیکھا۔

"کب سے بند ہو یہاں؟" اس نے نور احمد سے پوچھا۔

"کل شام سے۔" نور احمد نے مختصر سا جواب دیا۔ وہ اس شخص سے زیادہ بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا اور نہ ہی زیادہ بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس ابھی سوچنے کے لئے بہت کچھ تھا۔

"کیوں آئے ہو؟" اس نے پوچھا۔ "معلوم ہوتا ہے کوئی لمبا چکر ہے۔ اس عورت سے تم کچھ قتل وغیرہ کی بات کر رہے تھے شاید۔"

"ہاں۔" نور احمد نے بیزاری سے کہا۔ "مجھ سے ایک آدمی کا خون ہو گیا ہے۔"

اچانک اس شخص کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک سی ابھر آئی اور اس نے بڑی گہری اور بھرپور نظروں سے نور احمد کی طرف دیکھا۔ "قتل؟ تم نے قتل کر دیا؟ کیا کسی کو مار دیا؟ اور یہ آنے والی عورت کیا تمہاری بیوی تھی؟"

"ہاں وہ میری بیوی تھی۔" نور احمد نے کہا۔ "اور وہ میرے دونوں بچوں کے ساتھ آئی تھی۔ کل ایک آدمی سے میرا معمولی سی بات پر جھگڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے سر پر گگری دے ماری اور وہ مر گیا۔"

"گگری!" اس شخص نے حیرت سے کہا۔ "گگری .... کیا تمہارا مطلب ہے پانی بھرنے کا برتن؟"

"ہاں، وہی۔" اور نور احمد نے اسے مختصراً اس واردات کے بارے میں بتایا۔ اس نے اسے یہ سب کچھ بتانا اس لئے ضروری سمجھا تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ حوالاتی اس قتل کو کسی اور رنگ میں دیکھنے کی کوشش کرے۔ اس کی بیوی ابھی ابھی اس سے ملاقات کر کے گئی تھی اور شاکرہ ایک خوبصورت اور نوجوان عورت تھی۔

"پانی بھرنے پر جھگڑا کیا اور بندے کو مار دیا؟" اس شخص نے نور احمد کی بات سن کر نہایت زہریلے اور تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ "تھو تھو ہے تمہاری اوقات پر۔ تم لوگ

کے حقیر کیڑے آخ تھو۔" اور اس نے بڑے زور سے حوالات کے فرش کے ایک کونے میں تھوک دیا اور نفرت بھری نظروں سے نور احمد کو گھورنے لگا۔

نور احمد کے لئے اس کا رویہ انتہائی تعجب انگیز تھا۔ اسے قطعی توقع نہیں تھی کہ وہ ایسا انداز اختیار کرے گا اور پھر اس کے اس رویہ کی وجہ بھی اس کی سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی تھی۔ یہ تو بڑی عجیب و غریب قسم کی نفرت تھی جس کا اس شخص نے اظہار کیا تھا۔

"یہ کیا بات ہوئی؟" نور احمد نے قدرے سراسیمگی کے ساتھ کہا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"تم لوگ گلیوں کے آوارہ کتوں کی طرح صرف آپس میں لڑ سکتے ہو۔" شخص نے دانت پیس کر کہا۔ اس کے لب و لہجے میں جیسے ساری دنیا کا زہر سمٹ کر آ گیا تھا۔ "تمہارے ہاتھ صرف آپس میں ہی ایک دوسرے کی گردن کو دبا سکتے ہیں اور تم اپنے دانتوں سے صرف ایک دوسرے کا گوشت بھنبھوڑ سکتے ہو۔ یہ توانائی یہ طاقت، یہ غم و غصہ، یہ جوش و خروش جس کا اظہار تم آپس میں ایک دوسرے کے خلاف کرتے ہو اگر اس کا اظہار تم کبھی اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف کرو تو تمہاری تقدیریں بدل جائیں۔"

"مشترکہ دشمن!" نور احمد نے چونک کر کہا۔ "کون مشترکہ دشمن، تم کس کی بات کر رہے ہو؟"

"کس قدر بڑے گدھے ہوتے ہو تم لوگ، بالکل عقل سے پیدل جانور۔" وہ شخص جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ "اپنے مشترکہ دشمن کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتے۔ آپس میں ایک دوسرے کو کھائے جاتے ہو۔ مشترکہ دشمن تو وہ ہے جس نے تمہارا پانی چھینا ہے، تمہاری روٹی چھینی ہے، تمہارا روزگار چھینا ہے، تمہارا گھر چھینا ہے۔ وہ تو وہ ہے جو تم سے سب کچھ چھین کر اپنے پیٹ کے دوزخ میں بھرتا ہے۔ مگر.......... تم اسے کیسے پہچانو گے۔ اس کی شناخت اتنی آسان بھی تو نہیں۔" اس کی آواز اور بھی ہلکی ہو گئی اور وہ جیسے سرگوشیوں میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگا۔ "تمہیں کون بتاتا ہے تمہارے مشترکہ دشمن کے بارے میں؟ کوئی نہیں، کوئی نہیں بتاتا۔ سب جھوٹ بولتے ہیں، رات دن جھوٹ بولتے ہیں۔ اخبارات جھوٹ بولتے ہیں، سیاسی لیڈر جھوٹ بولتا ہے، مذہبی لیڈر جھوٹ بولتا ہے، کتابیں جھوٹ بولتی ہیں، جھوٹ جھوٹ، جھوٹ۔ ہر طرف جھوٹ کی ہی گرم بازاری ہے۔ جھوٹ کی اس سیاہی میں سچ کی روشنی تم تک کیسے پہنچے، کیسے پہنچے، کیسے پہنچے؟" اور وہ جنون کے عالم میں اپنے سر کے بالوں کو نوچنے لگا۔

اس شخص کی الجھی ہوئی' بے تکی باتیں کچھ نور احمد کی سمجھ میں آئیں کچھ کچھ نہیں آئیں لیکن نور احمد کو وہ آدمی ضرور بڑا دلچسپ معلوم ہوا۔

"تم کو کس الزام میں یہاں لایا گیا ہے؟" نور احمد نے اس کی باتوں کا برا مانے بغیر پوچھا۔ "کیا تم کوئی سیاسی لیڈر ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے چمک کر جواب دیا۔ "میں سیاسی لیڈر نہیں ہوں اور نہ مجھے سیاسی لیڈر بننے کا شوق ہے۔ میں تو ایک صحافی ہوں۔ صحافی' سمجھتے ہو؟ اخبار نویس۔ اخبار میں کام کرتا ہوں۔"

"اچھا تو تم اخبار میں کام کرتے ہو؟" نور احمد نے قدرے مایوسی کے ساتھ کہا کیونکہ اخبار سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ بالکل ناخواندہ تھا اور لکھ پڑھ نہیں سکتا تھا۔

اور پھر وہ اخبار نویس جس کا نام یونس تھا' نور احمد سے بڑی دیر تک عجیب طرح کی باتیں کرتا رہا۔ نور احمد نے ایسی باتیں آج تک کسی کی زبان سے نہیں سنی تھیں۔ شروع شروع میں تو اس نے یونس کو پاگل سمجھا تھا لیکن جب یونس نے ذرا سنبھل کر بولنا شروع کیا اور پھر وہ بولتا ہی چلا گیا تو نور احمد کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ آج تک ایک ایسی اندھی دنیا میں رہ رہا تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا اور آج پہلی بار کسی نے اس دنیا کی اصل شکل دکھائی تھی اور نور احمد صرف اپنے حوالے سے ان سارے معاملات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اگر سبزی فروش تھا اور ایک کچی آبادی میں غیر انسانی حالت میں زندگی گزار رہا تھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کی اور اس جیسے دوسرے بہت سے لوگوں کی قسمت میں یہ لکھا تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کے اور اس جیسے دوسرے کروڑوں غریبوں کے حصے کا مال کچھ دوسرے لوگ کھا جاتے تھے اور اپنی اس لوٹ کھسوٹ کو انہوں نے بہت سے خوبصورت نام دے رکھے تھے۔

نور احمد کچھ دیر کے لئے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو جیسے بھول گیا۔ یونس نے اس پر ایک ایسی نئی اور حیرت انگیز دنیا کا انکشاف کیا تھا کہ وہ اس کے تانے بانے میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

"ذرا غور کرو۔ اگر تمہاری بستی کے ہر گھر میں نل لگا ہوتا' ہر گھر میں پانی آتا ہوتا تو عبدالرحیم نہ مارا جاتا اور تم یہاں اس کے قتل کے جرم میں حوالات میں بند نہ ہوتے۔ اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی نا کہ پانی کی مناسب فراہمی ایک آدمی کو قاتل اور ایک کو مقتول بننے سے اور دو گھرانوں کو تباہ ہونے سے بچا سکتی تھی اور کیا پانی بھرنے پر

جھگڑا ہے' پہلا قتل ہے؟"

نور احمد کا جی چاہتا تھا کہ یونس بولتا رہے اور وہ سنتا رہے۔ وہ یونس کی باتوں سے بالکل مسحور ہوا جا رہا تھا لیکن اس وقت ایک حوالدار حوالات کے دروازے پر آیا اور یونس کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اسے ایس ایچ او نے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور اس کے بعد یونس واپس حوالات میں نہیں آیا۔ نور احمد کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ اس نے سنتری سے پوچھا تو وہ بھی اسے واضح طور پر کچھ نہیں بتا سکا اور پھر اس کے بعد سے اس نے یونس کو کبھی نہیں دیکھا۔

نور احمد پر مقدمہ چلا اور اس میں کوئی بہت زیادہ پیچیدگی نہیں تھی۔ وہ خود بھی ایک اقبالی مجرم تھا اور اس نے عدالت کے روبرو تمام حقائق کا اپنی زبان سے اعتراف کر لیا تھا۔

اس مقدمے میں نور احمد خود بھی اقبالی مجرم تھا اور پھر موقعہ کے گواہ بھی موجود تھے جن کے بیانات میں آپس میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ گواہوں کے بیانات سے یہ ظاہر تھا کہ ملزم اور مقتول کی کوئی دشمنی نہیں تھی اور نہ اس سے پہلے کبھی ان کے درمیان کوئی جھگڑا ہوا تھا اور اس شام کو جو کچھ ہوا وہ ایک وقتی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا اور اسے قتل عمد قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ تاہم یہ ایک بھیانک اور وحشیانہ قتل تھا۔ عدالت نے نور احمد کو موت کی سزا تو نہیں دی البتہ اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا سنا دی۔ مقدمہ کوئی دو سال تک چلا۔

اگرچہ یہ سزا نور احمد کی توقع کے تقریباً مطابق تھی اور اس میں اس کے لئے کوئی چونکا دینے والی یا اچانک صدمہ پیدا کرنے والی بات نہیں تھی' تاہم سزا سن کر وہ بے اختیار رونے لگا۔

اس روز اس کی بیوی شاکرہ دونوں بچوں کو بھی اپنے ساتھ عدالت میں لے کر آئی تھی۔ آج مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا اور اس بات میں تو کوئی شبہ تھا ہی نہیں کہ نور احمد کو سزا ہونے والی تھی۔ پھانسی بھی ہو سکتی تھی۔ شاکرہ نے یہ مناسب سمجھا کہ دونوں بچوں کو ساتھ لے جائے۔

سزا کا اعلان ہونے کے بعد نور احمد کو جیل کے پکے قیدیوں والے حصے میں پہنچا دیا گیا اور اگلے ہی دن سے اس کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔ اب وہ ایک سزا یافتہ قیدی تھا۔ اسے جیل کی چار دیواری کے اندر جبری مشقت کرتے ہوئے چودہ سال کا طویل عرصہ گزارنا تھا۔

بہت لمبی مدت تھی۔ اپنے آپ کو نئے حالات کا' نئے طرز زندگی کا عادی بنانا ہو گا۔ اپنی عمر کے ایک بڑے حصے کو اسی چہاردیواری کے اندر محبوس رہ کر گزارنا تھا۔ نہیں یہ سب کچھ کیسے ہو سکے گا؟

لیکن پھر سب کچھ خود بخود ہونے لگا۔ جیل میں نور احمد کی مشقت سبزیوں کی کیاریوں پر لگا دی گئی اور اسے اپنا یہ کام پسند آیا۔ اس نے تو اپنی ساری زندگی ہی سبزیوں کے بیچ گزاری تھی اور بچپن سے لے کر اب تک وہ سبزیوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

نور احمد چودہ سال کے لئے مفلوج اور مجہول ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کے دونوں بچوں کی پرورش کی ذمہ داری شاکرہ پر آ پڑی تھی جو خود بھی اپنے شوہر کی طرح ایک مطلق ان پڑھ عورت تھی۔

لیکن شاکرہ نے بڑی ہمت کا مظاہرہ کیا۔ حالات نے ہی اسے حالات کا مقابلہ سکھایا۔ وقت کا جبر خود بخود اس کے لئے زندگی کے نئے راستے متعین کرتا گیا اور وہ ان پر چل پڑی۔ خود زندہ رہنا تھا اور بچوں کو زندہ رکھنا تھا۔ انہیں پڑھانا تھا۔ ان کی تعلیم کا نقصان نہیں ہونا چاہئے تھا۔ نور احمد کو جب سزا سنائی گئی تو اس وقت اس کی عمر تیس برس کی تھی اور اب وہ چودہ سال کے لئے اندر جا چکا تھا۔ کل کس نے دیکھا تھا۔ کون جانے کس کی تقدیر میں کل کیا تھا؟ اب تو بچوں کے لئے شاکرہ کو خود ہی کچھ کرنا تھا۔

شاکرہ نے ایک فیکٹری کے پیکنگ ڈیپارٹمنٹ میں نوکری کر لی۔ یہ کوئی باقاعدہ ملازمت نہیں تھی اور نہ اس میں کوئی مراعات شامل تھیں۔ یہ ایک قسم کا کنٹریکٹ تھا جس میں مقررہ کام کے مقررہ پیسے ملتے تھے جو محنت اور وقت کے لحاظ سے بنتے تھے۔ چھٹیوں کے کوئی پیسے نہیں ملتے تھے اور نہ ہی بیماری وغیرہ کی صورت میں معالجے کی کوئی سہولت حاصل ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ملازمت کا کوئی بھی تحفظ نہ تھا۔ مالکان جب اور جس وقت چاہتے تو نوکری ختم کر سکتے تھے' گو کہ فیکٹری روزانہ جانا ہوتا اور بالکل اسی طرح سے کام کرنا ہوتا تھا جس طرح کہ باقاعدہ ملازم مزدور کام کرتے۔ لیکن اس کے باوجود تنخواہ بہت کم تھی اور کوئی بھی دوسری مراعات حاصل نہیں تھیں۔

لیکن شاکرہ کے لئے یہ بھی بہت غنیمت تھا۔ خیرن اور اس کی بہن شمشاد نے کوشش کر کے شاکرہ کو کام دلوا دیا تھا اور اس کے لئے انہیں فیکٹری کے سپروائزر کو رشوت بھی دینا پڑی تھی۔ وہ رقم اس وقت تو انہوں نے دے دی اور بعد میں [illegible] نیصدی اضافے کے ساتھ شاکرہ سے وصول کر لی۔ شاکرہ نے بڑی خوشی سے انہیں دے دی۔

فیکٹری میں نوکری مل جانے سے شاکرہ کو بڑا سہارا ہو گیا' ورنہ وہ تو یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوئی جا رہی تھی کہ اگر اسے گھروں گھروں جھاڑو برتن کا کام کرنا پڑا تو کیسی خواری ہو گی۔ ایک بے پڑھی لکھی عورت اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتی تھی؟ اور وہ اپنے بچوں کو اس غم انگیز اور مایوس کن احساس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی کہ ان کی ماں دوسروں کے جوٹھے برتن دھوتی ہے اور گھروں میں جھاڑو لگاتی ہے۔ باپ سبزی فروش سہی لیکن اپنا کام تو کرتا تھا۔

راتوں کے گہرے سناٹے میں جب نور احمد جیل میں اپنے تھڑے پر پڑا ہوا ہوتا تو اس کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات کا ہجوم ہوتا۔ وہ اپنی اس نئی زندگی کے بارے میں گھنٹوں سوچتا رہتا جو اس پر مسلط کر دی گئی تھی اور جسے اب وہ ایک طویل عرصے تک برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

اسے اب تک اس بات کا یقین نہیں آتا تھا کہ وہ قاتل ہے' اس نے ایک آدمی کو ہلاک کر دیا ہے اور اس کے بدلے میں اسے چودہ سال قید بامشقت کی سزا ہو چکی ہے۔ اس نے تو اپنی زندگی میں کبھی کسی کے ایک تھپڑ بھی نہیں مارا تھا۔ وہ بھلا ایک انسان کو قتل کیسے کر سکتا تھا؟

"کاش' کاش وہ ایک لمحہ بھی اسی طرح گزر جاتا جس طرح اور بہت سے لمحات گزر گئے تھے تو آج میرے ساتھ یہ سب کچھ نہ ہوتا جو اب ہو رہا ہے۔" وہ بڑی غم انگیز اور دردناک حسرت کے ساتھ سوچتا۔ "کاش میں صرف اس ایک لمحے کے لئے اپنے آپ کو قابو میں کر لیتا جب گگری میرے ہاتھ میں تھی .... میں گگری کو زمین پر ایک طرف ڈال دیتا .... تو عبدالرحیم قتل نہ ہوتا اور مجھ سے میری زندگی کے چودہ برس چھین نہ لئے جاتے.........."

کتنے لوگ اسے روک رہے تھے۔ اسے بھی اور عبدالرحیم کو بھی۔ بوڑھے درزی دلشاد نے تو اسے اپنی باری کی پیشکش کر دی تھی اور کہا تھا کہ وہ سب سے آخر میں پانی بھر لے گا۔ کاش اس نے دلشاد خان کی بات مان لی ہوتی .... کاش اس نے دوسرے لوگوں کی بات مان لی ہوتی .... اس کمبخت پانی کے بھرنے میں اگر گھنٹہ بھر کی دیر ہو جاتی تو کون سی قیامت ٹوٹ پڑتی؟ کچھ بھی فرق نہیں پڑتا۔ بلا سے حمیدہ ہی پہلے اپنی بالٹی بھر لیتی .... اور افشاں بے چاری تو خود ہی کہہ رہی تھی کہ بعد میں بھر لیں گے' پہلے

حمیدہ بھرلے۔

اب جبکہ نور احمد اس ساری صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کرتا تھا' تو اسے صاف نظر آتا تھا کہ اس خطرناک ترین اقدام سے بآسانی بچا جا سکتا تھا۔ ہرگز کوئی ایسی موجود نہیں تھی کہ اس کے ہاتھوں عبدالرحیم کا خون ہو جاتا لیکن پھر بھی یہ خون ہو گیا تھا۔

انسانی زندگی میں بعض لمحات بڑے جان لیوا' خطرناک' فیصلہ کن اور نہایت دوررس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جو اگر خالی اور سکون کے ساتھ گزر جائیں تو بہت کچھ برباد ہونے سے بچ جاتا ہے اور اگر ان کے اندر چھپی ہوئی آگ کو بھڑک اٹھنے کا موقع مل جائے تو پھر صرف تباہی ہی تباہی ہوتی ہے' ایک ایسی تباہی جس پر آدمی زندگی بھر پچھتاتا ہے' افسوس کرتا ہے' اپنے آپ کو ملامت کرتا ہے لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس بھڑکی ہوئی آگ کو دوبارہ ان لمحوں کے پیکر میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ لمحے گزر جاتے ہیں' آگ بھڑک اٹھتی ہے اور پھر تباہی و بربادی تو لازمی ہوتی ہے۔

نور احمد رہ رہ کر اپنے اوپر ماتم کرتا تھا' اپنی سمجھ بوجھ پر' اپنی عقل و فہم پر ماتم کرتا تھا' وہ ان لمحوں کی آگ کو بھڑکنے سے نہ روک سکا۔ اس نے یہ سمجھنے سے انکار کر دیا کہ آگ جب بھڑکے گی تو پھر اس کی لپٹیں کہاں کہاں تک پہنچیں گی اور اب وہ سب کچھ کر کے بیٹھا ہوا اپنے اوپر نوحہ خواں تھا۔ چند لمحوں کی ایک اضطراری کیفیت نے اس سے اس کی زندگی کے چودہ سال چھین لئے تھے اور اب دنیا کی کوئی طاقت اسے یہ گمشدہ سال واپس نہیں دلا سکتی تھی۔ وہ لمحے .... وہ وحشی لمحے نور احمد کی گرفت سے نکل گئے تھے اور انہوں نے اس کے لئے عذاب ناک جہنم کا دروازہ کھول دیا تھا۔

"کاش .... کاش .... میں اس وقت وہاں موجود نہ ہوتا۔ کاش عبدالرحیم اس وقت وہاں نہ آ جاتا۔ کاش وہ تانبے کی بھاری گگری میرے ہاتھ میں نہ آ جاتی .... کاش کسی نے حملہ کرنے سے پہلے ہی مجھے روک لیا ہوتا.........." اس کی ناکام اور بے مصرف آرزو مندی ایک گہرے کرب کی شکل اختیار کر گئی۔ کتنے بہت سے "کاش" اس کے دماغ میں تھے لیکن اس وقت ایک بھی کاش کام نہ آیا اور پھر جج کے قلم کی نوک کی ایک جنبش نے اس سے اس کی زندگی کے چودہ سال لے لئے اور اب وہ ان گمشدہ برسوں کو کہاں سے لائے گا۔ انہیں وہ اپنی زندگی کا حصہ کیسے بنائے گا؟ یہ برس تو نہ جانے کیسے بسر ہوں گے۔

شاکرہ نے گھر کو سنبھال لیا تھا۔ بچوں کو سنبھال لیا تھا۔ دونوں بچوں کو اور خاص طور سے افشاں کو اس بات کا واضح احساس تھا کہ ان کے باپ نے فی الحقیقت جان بوجھ کر کوئی جرم نہیں کیا ہے اور وہ کوئی قاتل یا مجرم نہیں ہے۔ وہ تو عبدالرحیم خود ہی زبردستی اس سے بھڑ گیا تھا اور اسے برابر پریشان کئے جا رہا تھا۔ بچوں کو اپنے باپ سے نفرت نہیں تھی۔ تاہم نور احمد نے شاکرہ کو سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ بچوں کو لے کر ملاقات کے لئے کبھی بھی جیل نہ آئے۔ جیل ایسی جگہ نہیں تھی جہاں بچوں کو لایا جائے اور خود شاکرہ نے بھی اس کی اس بات سے اتفاق کیا تھا۔ چنانچہ وہ ہر ماہ میں ایک بار پابندی سے نور احمد سے ملاقات کے لئے جاتی تھی۔ ویسے تو وہ اس سے ہر ہفتے مل سکتی تھی لیکن اس صورت میں اسے ہر ہفتہ اپنے کام سے چھٹی کرنی پڑتی اور اس کے پیسے کٹ جاتے اور ان حالات میں سب سے زیادہ اہمیت تو پیسوں کی تھی۔ چنانچہ ان دونوں کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ شاکرہ مہینے کے صرف پہلے ہفتے میں اس سے ملاقات کے لئے جیل آیا کرے گی۔

"بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ اس کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" نور احمد نے اپنی بیوی سے کہا۔ "دو تین مہینے میں بھی ایک پھیرا لگا لیا کرو تو کافی ہے۔ مجھے یہاں سب کچھ تو مل جاتا ہے۔ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ کھانے کو مل جاتا ہے۔ مشقت بھی بہت زیادہ کڑی نہیں ہے بس وقت گزارنا ہے تو وہ گزر جائے گا' کسی نہ کسی طرح۔"

لیکن شاکرہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئی اور اس نے ہر ماہ آنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ نور احمد کا بہت جی چاہتا تھا کہ وہ بچوں کو دیکھے' ان سے باتیں کرے' ان کو پیار کرے لیکن وہ اپنی اس خواہش کو دل ہی دل میں کچل دیتا تھا۔ بچوں کی بہتری اس کی ان احمقانہ خواہشوں سے زیادہ اہم تھی۔ افشاں ہائی اسکول میں پڑھ رہی تھی اور اپنے اسکول کی بہت ذہین لڑکیوں میں گنی جاتی تھی۔

لیکن پھر اچانک حالات میں ایک بڑی ناخوشگوار تبدیلی رونما ہو گئی۔

نور احمد جیل کی جس بیرک میں تھا اس بیرک کے قیدیوں کے دو گروپوں میں ایک رات آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ سپاہیوں اور وارڈروں نے باہر سے ڈانٹ ڈپٹ کر کے اس وقت جھگڑے کو تو ختم کروا دیا لیکن اگلے دن اس واقعے کی باقاعدہ رپورٹ جیل حکام سے کی گئی۔ اس واقعہ کی باقاعدہ چھان بین کی گئی اور بعض اقدامات بھی کئے گئے۔ کچھ قیدیوں کو کراچی جیل سے دوسری جیلوں میں ٹرانسفر کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور ان میں نور احمد بھی شامل تھا۔ اگرچہ نور احمد کا اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ہوتا یوں ہی ہے کہ

اکثر گیہوں کے ساتھ گھن بھی پستے ہیں۔ نور احمد کا بھی تبادلہ کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ اسے کراچی سے سکھر جیل منتقل کر دیا گیا۔

یہ بڑی تکلیف دہ صورت حال تھی شاکرہ کے لئے۔ کراچی سے سکھر جانا اور اسیر شوہر سے ملاقات کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس میں بہت ساری قباحتیں تھیں۔ اوّل تو شاکرہ کے لئے تنہا سکھر آنا اور وہاں رکنا ایک مشکل کام تھا۔ ان لوگوں کا کوئی عزیز رشتے دار یہاں اس شہر میں یا کہیں کسی دوسرے شہر میں موجود نہیں تھا۔ پھر اس میں خرچ بھی کافی تھا اور کام کا نقصان الگ۔ جتنے دن کام پر نہ جاؤ اتنے دن کی مزدوری غائب۔ پھر یہ بھی مسئلہ تھا کہ شاکرہ اگر اکیلی آتی تو بچوں کو کس پر چھوڑ کر آتی؟

کراچی میں شاکرہ سے اپنی آخری ملاقات کے دوران نور احمد نے اسے کئی باتیں اچھی طرح سمجھا دیں اور ان کے درمیان ایک باقاعدہ سمجھوتہ طے ہو گیا جس کے تحت قرار پایا کہ شاکرہ سال میں صرف ایک بار سکھر جیل آ کر اپنے شوہر سے ملاقات کرے گی۔ اس سے زیادہ کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ قیدیوں کو جیل سے اپنے گھر والوں کو پوسٹ کارڈ بھیجنے کی اجازت ہوتی ہے۔ نور احمد ہر ماہ ایک پوسٹ کارڈ کراچی بھجوا دیا کرے گا اور شاکرہ بھی اس کو خط لکھواتی رہے گی۔ اس طرح وہ لوگ ایک دوسرے کی خیریت سے آگاہ رہیں گے۔

"بچوں کو کبھی وہاں لے کر مت آنا۔" نور احمد نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے اس حالت میں دیکھیں۔ انہیں پڑھنے دو۔ میں انہیں اپنے سے دور ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ میں ویسے بھی انہیں کیا دے سکا؟ صرف یہی دکھ کہ وہ ایک سزا یافتہ قاتل کی اولادیں ہیں۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" شاکرہ نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ "بچے بڑے سمجھدار ہیں۔ وہ اس بات کو خوب سمجھتے ہیں کہ کیا ہوا تھا۔ انہیں تم سے ذرا سی بھی نفرت نہیں ہے۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور بار بار آنے کی ضد کرتے ہیں۔"

"میں اب ایک لمبے عرصے تک ان کی شکل نہیں دیکھ سکوں گا۔" نور احمد نے افسردگی کے ساتھ کہا۔ "لیکن مجھے اس کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ میں تو بس یہی چاہتا ہوں کہ وہ پڑھ لکھ کر کسی قابل بن جائیں اور ان کی زندگیاں بن جائیں۔ اپنا کیا ہے؟" وہ آہستہ سے ایک پھیکی ہنسی ہنسا۔ "جس وقت میری رہائی عمل میں آئے گی تب تک پینتالیس چھیالیس سال کی عمر ہو چکی ہو گی۔ بہت ہے، بس بہت جی لئے۔"

"پینتالیس چھیالیس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔" شاکرہ نے آہستہ سے کہا۔ "ہم اس عمر میں بھی ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہیں اور انشاء اللہ ضرور کریں گے تم دیکھ لینا۔ وقت تو چٹکی بجاتے گزر جائے گا۔ ایسا گزرے گا کہ ہمیں اور تمہیں احساس بھی نہیں ہو گا اور پھر جب تم باہر آؤ گے تو انشاء اللہ افشاں اس وقت تک ڈاکٹرنی بن چکی ہو گی۔ عمران بھی کافی پڑھ چکا ہو گا۔ میں تو ایک ایک پائی دانتوں سے پکڑ کر خرچ کر رہی ہوں۔ اگر کسی دن طبیعت ٹھیک نہیں ہوتی پھر بھی فیکٹری کا ناغہ نہیں کرتی۔"

"اب تو بس جو کچھ ہے تمہارے ہی دم سے ہے۔" نور احمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "خدا تمہاری مدد کرے۔ بس اسی طرح گاڑی چلتی رہے۔ میں جب بھی رہا ہو کر آؤں گا فوراً ہی اپنا دھندہ چالو کر دوں گا۔ کوئی سرکاری نوکر تو ہوں نہیں کہ سزا پانے کے بعد نوکری سے نکال دیا جاؤں۔ میرا تو اپنا ذاتی کام ہے جس میں نہ کوئی ریٹائرمنٹ ہے اور نہ کوئی اور پابندی۔ جب جی چاہے جیسے جی چاہے کام کرو۔ کوئی روک ٹوک تو ہے نہیں۔"

"جب تم رہا ہو کر آؤ گے تو اس وقت تک انشاء اللہ ہمارے حالات بہت بدل چکے ہوں گے۔" شاکرہ نے کہا۔ "تب تمہیں سبزی کا ٹھیلا لگانے کی ضرورت نہیں ہو گی بلکہ کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ افشاں ڈاکٹر بن جائے گی، عمران افسر بن جائے گا، میں بھی اس وقت کام کر رہی ہوں گی تو پھر تمہیں کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر ساری عمر تو محنت ہی کرتے رہے ہو۔"

نور احمد جب کراچی جیل سے سکھر جیل پہنچا تو اس وقت اس کی بیٹی افشاں نویں کلاس میں پڑھ رہی تھی اور اب اگلے سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھی۔ عمران ساتویں کلاس میں تھا۔ دونوں بچے اب کافی عرصے سے ہائی اسکول میں پڑھ رہے تھے اور شاکرہ نے ان دونوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی کہ وہ اسکول میں اپنے کسی بھی ساتھی سے یہ نہ کہیں کہ ان کے ابا جیل میں ہیں۔ بلکہ وہ انہیں یہ بتائیں کہ ان کے ابا ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں اور کافی عرصے کے بعد واپس آئیں گے۔ دونوں بچے اسی جھوٹ کے سہارے کسی نہ کسی طرح اسکول میں نبھاہ کرتے رہے اور شاکرہ فیکٹری میں جان توڑ محنت کرتی رہی۔ اس نے فی الحقیقت بچوں کو باپ کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔ وہ سارے گھر کے اخراجات پورے کرتی، بچوں کے تعلیمی اخراجات، ان کے کھانے پینے، لباس وغیرہ کے اخراجات اور دوسرے تمام اخراجات پورے کرتی۔ اس نے انہیں

محرومی کے احساس سے بچائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

سکھر پہنچنے کے بعد نور احمد کی زندگی کا ایک اور دور شروع ہو گیا۔ کراچی جیل میں ایک عرصے تک قیام کے دوران اس نے بہت سے ساتھی اور دوست پیدا کر لئے تھے۔ خود جیل کے اسٹاف کے لوگوں سے بھی اچھی خاصی یاداللہ ہو گئی تھی اور نشتم پشتم گزر بسر ہو رہی تھی۔ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن اب یہاں اس نئی جیل میں سب لوگ اجنبی تھے۔ نور احمد کے ساتھ کراچی سے دو قیدی اور بھیجے گئے تھے لیکن وہ دوسری بیرکوں میں تھے اور نور احمد کی ان سے بہت کم ملاقات ہو پاتی تھی۔

یہاں اس کی دوستی کرم حسین نامی ایک قیدی سے ہو گئی۔ کرم حسین نواب شاہ کے مضافات کا رہنے والا تھا اور دو قبیلوں کے درمیان ہونے والی لڑائی میں اس کے ہاتھوں کئی افراد کا خون ہو گیا تھا۔ اسے عمر قید کی سزا ہو گئی تھی۔ نور احمد اور کرم حسین ایک ہی بیرک میں تھے اور دونوں میں بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں کے بستر ایک دوسرے کے قریب قریب تھے۔

اور اب نور احمد کو سکھر جیل آئے ہوئے پورے آٹھ سال گزر چکے تھے۔ ان آٹھ برسوں کے دوران حالات میں بڑی تبدیلیاں آ چکی تھیں اور بہت سی تبدیلیاں ایسی تھیں جن کے بارے میں نور احمد کو کچھ نہیں معلوم تھا۔

اولین پانچ برسوں کے دوران شاکرہ معمول اور پروگرام کے مطابق سال میں ایک بار اس سے ملاقات کرنے کے لئے کراچی سے آتی رہی۔ ان پانچ برسوں کے دوران ان کی پانچ ملاقاتیں ہوئیں اور ہر ملاقات کے دوران نور احمد نے شاکرہ کو پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور اور تھکا ہوا پایا۔ وہ فیکٹری میں معمول کے مطابق کام کے علاوہ اوور ٹائم بھی کر رہی تھی اور اکثر رات گئے تک کام کرتی رہتی۔ اس سے یہ فائدہ تھا کہ کچھ زیادہ پیسے مل جاتے تھے اور گھر اور بچوں کے کام آتے تھے۔ آخر بچوں کے اخراجات بھی تو بڑھ رہے تھے بلکہ بہت زیادہ بڑھ چکے تھے۔ ان کو پورا کرنے کے لئے بھی تو کچھ کرنا تھا۔ افشاں اب میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی۔ اس نے انٹر سائنس میں بہت اچھے نمبر حاصل کئے تھے اور اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں میرٹ پر ہو گیا تھا۔ اسی سال عمران بھی میٹرک پاس کر کے کالج میں آیا تھا۔ دونوں بچے اب کالج اسٹوڈنٹ تھے۔ ان کے بڑھتے ہوئے اخراجات تھے، ضروریات تھیں، جنہیں بہرحال پورا کرنا تھا اور اس کے لئے شاکرہ کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت تھی۔

آخری بار جب شاکرہ آئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ اب وہ لوگ مکان تبدیل کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

"اس سال بارشیں میں بہت تکلیف ہوئی۔" شاکرہ نے بتایا۔ "ندی میں پانی بہت چڑھ آیا تھا اور ہماری بستی کے بھی کئی مکانوں کے اندر پانی داخل ہو گیا۔ حالانکہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ پانی ہماری بستی تک آتا۔ ندی کے کنارے کی جھونپڑیاں اور کچے مکانات تو بیشک متاثر ہوئے تھے لیکن ہماری بستی اونچائی پر ہونے کے باعث محفوظ رہتی تھی لیکن اس سال بارشیں ذرا زیادہ ہوئیں اور بستی پانی میں اس طرح گھر گئی کہ باہر نکلنا ناممکن ہو گیا۔ میں دو دن تک فیکٹری نہیں جا سکی۔ افشاں اور عمران بھی کالج نہیں گئے۔ ہم سب لوگ گھر پر ہی رہے پھر جب پانی خشک ہوا اور راستے کھلے تو ہم لوگ باہر نکلے اب ہم لوگ اس مکان کو بدلنے کی سوچ رہے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ کہاں جائیں۔ کرائے کا مکان لینا تو ہمارے بس سے باہر کی بات ہے۔ افشاں کہہ رہی تھی کہ اس کی کسی دوست کا بھائی کے ڈی اے میں کام کرتا ہے۔ اس سے کہہ کر کوئی چھوٹا موٹا پلاٹ کہیں لے لیں۔"

"کاش میں تم لوگوں کی کوئی مدد کر سکتا۔" نور احمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "اگر میں باہر ہوتا تو ہم سب لوگ مل جل کر کچھ نہ کچھ کر لیتے۔"

وہ شاکرہ سے نور احمد کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد سے تین سال کا عرصہ گزر گیا تھا اور شاکرہ نہیں آئی تھی اور نہ ہی نور احمد کو اپنے گھر والوں کے بارے میں کسی اور ذریعے سے کچھ معلوم ہو سکا تھا۔

اس سال بہ سال ملاقات کے علاوہ ان کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہتا تھا جس میں شروع میں تو بڑی باقاعدگی رہی لیکن رفتہ رفتہ اس میں کمی واقع ہونے لگی۔ اب نور احمد دو تین ماہ میں ایک بار ایک پوسٹ کارڈ اپنے گھر بھجوا دیا کرتا تھا اور گھر سے خیر خیریت کا خط آ جایا کرتا تھا بس اتنا کافی تھا۔

اس سال معمول کے مطابق شاکرہ نہیں آئی۔ نور احمد کو سکھر جیل میں چھٹا سال تھا اس دوران اس نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح اس کا تبادلہ دوبارہ کراچی میں ہو جائے لیکن یہ ممکن نہیں ہو سکا تھا۔ ویسے اسے یہاں اس کے علاوہ اور کوئی تکلیف نہیں تھی کہ وہ اپنے گھر والوں سے دور تھا۔ وہ سکون اور خاموشی سے یہاں اپنی قید کے دن کاٹ رہا تھا اور اس کا چال چلن بہت اچھا اور مثالی تھا۔ جس کے باعث اسے ملنے والی

معافیوں میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ معافیاں جمع ہو رہی تھیں اور قید کی مدت کم ہو رہی تھی۔ وہ جیل کی انتظامیہ کے مزاج کا پورا خیال رکھتا تھا اور کوئی جھگڑا فساد بھی نہیں کرتا تھا۔ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ جیل کی انتظامیہ کو راضی اور خوش رکھ کر ہی معافیوں میں اضافہ کروایا جا سکتا ہے اور اسے زیادہ سے زیادہ معافیوں کی ضرورت تھی۔

جب کئی ماہ انتظار میں گزر گئے اور شاکرہ نہیں آئی اور اسے شاکرہ یا اپنے بچوں کی طرف سے کوئی پیغام' کوئی خط بھی نہیں ملا تو اس نے بالآخر ایک پوسٹ کارڈ اپنے گھر بھجوا دیا اور پھر جواب کا انتظار کرنے لگا۔ دن ہفتوں میں بدلتے گئے اور ہفتے مہینوں میں۔ نور احمد کے پوسٹ کارڈ کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کی تشویش اور گھبراہٹ میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی اور دن میں بھی وہ پریشان رہتا تھا۔ سال میں ایک ہی تو موقع اسے ملتا تھا جب وہ کچھ دیر کے لئے جیسے جیل کی دنیا سے نکل کر اپنے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اپنی بیوی سے باتیں کرتا تھا' اپنے ان بچوں کو دیکھتا تھا جنہیں اس نے برسوں نہیں دیکھا تھا۔ ان سے باتیں کرتا تھا۔ جن سے اس نے برسوں سے باتیں نہیں کی تھیں۔ وہ خود کو ان سب لوگوں کے درمیان پاتا۔ ایک خوش و خرم کنبے کے افراد کی طرح اور پھر بس تھوڑی دیر کا طلسم ختم ہو جاتا اور وہی محرومی تنہائی اور حرماں نصیبی اس کا مقدر بن جاتی۔ پھر بس کبھی کبھار مل جانے والے اِکا دُکا خط سے گھر کے حالات کا علم ہوتا۔

لیکن اس سال نہ تو ملاقات آئی نہ کوئی خط آیا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور نور احمد کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے باہر کی دنیا سے اب اس کا رابطہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا ہے اور اس سے ملنے کے لئے اب کوئی بھی کبھی نہیں آئے گا۔ ناامیدی کا اندھیرا دھیرے دھیرے اس کے وجود کو نگلنے لگا۔ زندگی یکبارگی بالکل بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ گھر سے کوئی نہیں آیا نہ کوئی ملاقات نہ کوئی خط اور پھر جب ایک رات کرم حسین نے بہت آہستہ آہستہ اس سے گفتگو کرتے ہوئے ایک بات کہی تو نور احمد کا کلیجہ جیسے کٹ کر رہ گیا۔ کرم حسین نے یہ بات بہت ڈرتے ڈرتے اور بہت ہمت کر کے کہی تھی اور یہ الفاظ کہنے سے پہلے اس نے معذرت بھی کر لی تھی۔

"یہ بھی ہو سکتا ہے بھائی نور احمد کہ تمہاری بیوی نے تم سے علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہو۔" کرم حسین نے ایک بوجھل تمہید کے بعد کہا۔ "تمہاری بیٹی ڈاکٹرنی بن رہی ہے' تمہارا بیٹا افسر بنے گا تو پھر تمہاری بیوی ڈاکٹرنی اور افسر کی ماں بن کر رہنا زیادہ پسند کرے

گی۔ اسے ایک سزا یافتہ قاتل کی بیوی بن کر رہنے کی کیا ضرورت ہے؟"

اس رات نور احمد ایک نئے تجربے سے گزرا۔ رات کا نہ جانے کون سا وقت تھا جب اسے اپنے سینے میں یکایک درد محسوس ہوا۔ درد ایسا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ تاہم وہ خاموشی سے بستر پر لیٹا رہا لیکن پھر درد کچھ زیادہ بڑھ گیا اور وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا۔ اسے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی بیرک میں سناٹا تھا اور سارے لوگ سو رہے تھے۔ وہ جا کر جنگلے کے پاس کھڑا ہو گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہاں تازہ ہوا کے جھونکوں سے اسے کچھ سکون ہوا۔ اسی وقت پہرے کا سپاہی جنگلے کے پیچھے سے نمودار ہوا اور اس نے نور احمد کو وہاں کھڑے دیکھ کر اس سے پوچھا کہ وہ وہاں کیوں کھڑا ہے اور جا کر سوتا کیوں نہیں۔ نور احمد نے اسے بتایا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور اس کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔

"کم کھایا کرو۔" سپاہی نے اسے دوستانہ مشورہ دیا۔ "سینے میں درد گیس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ویسے بھی آج چنے کی دال تھی۔ رات کے کھانے میں۔" سپاہی آگے چلا گیا اور نور احمد کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ درد میں رفتہ رفتہ خود ہی کمی ہو گئی تھی پھر وہ واپس آ کر سو گیا۔

اگلے دن اس نے جیل کے ڈاکٹر کو اپنی کیفیت بتائی اور ڈاکٹر نے سرسری معائنے کے بعد اسے کچھ گولیاں چوسنے کے لئے دے دیں۔ "گیس کا درد ہے۔" ڈاکٹر اور سپاہی کی تشخیص میں کوئی فرق نہیں تھا۔ "کوئی خاص بات نہیں ہے۔ گولیاں چوستے رہنا' ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

اگر اس وقت نور احمد کا تفصیلی طبی معائنہ کیا جاتا اور اس کا ای سی جی' یعنی الیکٹرو کارڈیو گراف نکالا جاتا تو اس سے فوراً معلوم ہو جاتا کہ گزشتہ رات اس پر دل کا ہلکا سا دورہ پڑا تھا جو دل کی رگوں کو ایک خاص حد تک نقصان پہنچا کر ختم ہو گیا اور کسی کو اس کی خبر نہ ہو سکی۔

ایک سال کا عرصہ اور گزر گیا۔ نور احمد کی صحت گرتی جا رہی تھی۔ اس سے اب زیادہ محنت نہیں ہوتی تھی۔ وہ جلدی تھک جاتا اور اس کا سانس پھولنے لگتا تھا اب بدن میں بہت زیادہ کام کرنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

"ڈھلتی عمر ہے بھائی!" وہ کرم حسین سے کہتا۔ "اب جوانی لوٹ کر تھوڑی آئے گی۔ اب تو جو دن بھی گزرے گا وہ بدن کو کمزور ہی کرتا جائے گا۔ بس جی' اللہ ہی اللہ ہے .... اللہ ہی اللہ ہے۔"

نور احمد کو سکھر جیل میں نو سال ہو چکے تھے اور اس کی کُل سزا کو دس سال کا عرصہ
گزر گیا تھا۔ سکھر جیل میں گزشتہ چار سال سے اسے اپنے گھر والوں کے بارے میں کچھ
نہیں معلوم ہو سکا تھا اور یہ عرصہ اس نے سخت ترین اذیت اور کرب کے عالم میں گزارا
تھا۔ مگر اب اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔ کرم حسین اسے سمجھاتا رہتا تھا اور نور
احمد اب سمجھنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔ باہر والوں سے حد سے زیادہ مہربانیوں کی توقع رکھنا
ان پر ظلم کرنا تھا۔

اور پھر ایک دن اچانک اسے رہائی کا مژدہ مل گیا۔ اُسے جیل کے دفتر میں طلب کیا
گیا اور سپرنٹنڈنٹ نے اس کو مطلع کیا کہ اسے رہا کیا جا رہا ہے۔ یہ 18 جنوری 1989ء کا
دن تھا۔

"تمہارا چال چلن جیل میں بہت اچھا رہا ہے نور احمد!" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "کراچی
سے لے کر سکھر جیل تک تمہارا ریکارڈ بہت شاندار رہا ہے اور اسی لئے تم کو برابر زیادہ سے
زیادہ معافیاں ملتی رہی ہیں اور اب یہ ساری معافیاں مل کر اتنی ہو گئی ہیں کہ تم کو رہا کیا جا
سکتا ہے۔ چنانچہ تمہاری رہائی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ تم آزاد ہو اور جا سکتے ہو۔" اور اس
کے ساتھ ہی سپرنٹنڈنٹ نے گھسے پٹے الفاظ میں اسے نیک اور شریفانہ زندگی گزارنے
اور ایک اچھا شہری بننے کی تلقین شروع کر دی۔

نور احمد کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ابھی تو اس کی کافی قید باقی تھی۔
سال باقی تھے اگر بہت سی معافیاں بھی مل جاتیں تو بھی اتنی جلدی رہائی نہیں ہو سکتی تھی
لیکن اسے واقعی کچھ زیادہ ہی معافیاں مل گئی تھیں اور جب سال بہ سال ملنے والی
معافیوں کا حساب کیا گیا تو اس کی سزا کے صرف چند مہینے بچتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ نے
مدت اپنی طرف سے معاف کر دی۔

"لو یہ کچھ رقم ہے۔" سپرنٹنڈنٹ نے اسے ایک لفافہ پکڑاتے ہوئے کہا۔ "تم
دس سال تک جیل میں رہے ہو اور اس عرصے کے دوران تم نے جو مشقت کی ہے اس کا
یہ معاوضہ ہے۔ اسے رکھ لو اور سکھر سے کراچی تک کے ریل کے ٹکٹ کے پیسے
ہیں اور اب تم جا سکتے ہو۔"

نور احمد جب جیل کے گیٹ سے نکل کر باہر آیا تو اس کی حالت ایک ایسے متجسس
متجسس شخص کی سی تھی جس نے اچانک اور اتفاق سے کوئی نئی دنیا دریافت کر لی ہو
اب وہ اس نئی دنیا کے کنارے کھڑا ہوا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھ رہا ہو اور اس

عجائبات اور اسرار و رموز کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

چند منٹ پہلے تک وہ ایک محبوس' سزا یافتہ قیدی تھا جو جیل کی اونچی اونچی سنگلاخ
فصیلوں کے پیچھے اپنی قید کے دن کاٹ رہا تھا اور اب وہ اچانک ایک آزاد شہری بن گیا تھا۔
اسے آزادی تھی جہاں چاہے جائے جو جی چاہے کرے۔

خواب کے سے عالم میں ایک سوتی جاگتی کیفیت میں اس نے اپنے آپ کو آزاد دنیا کا
ایک شہری پایا اور ایک نئے عزم' نئی امید کے ساتھ اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچنے
لگا۔ جس طرح اب سے پہلے ہزاروں بار ان کے بارے میں سوچتا رہا تھا لیکن تب کی سوچ
اور اب کی سوچ میں بڑا فرق تھا۔ اب تو اس سوچ میں ملاقات کی عملی آرزومندی بھی
شامل تھی۔ طویل جدائی کی گھڑیاں ختم ہو گئی تھیں اور اب وہ سیدھا کراچی جا کر ان لوگوں
سے مل سکتا تھا۔ اس نے ہزاروں بار یہ بات سوچی تھی کہ افشاں اب ڈاکٹر بن چکی ہو گی۔
شاید ایک سال پہلے یا اس سے کچھ آگے پیچھے۔ وہ صحیح طور پر نہیں جانتا تھا کیونکہ گزشتہ
چار سال سے اس کا ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ آخری بار جب شاکرہ اس سے ملنے
آئی تھی تو اس وقت افشاں میڈیکل کالج میں پڑھ رہی تھی اور شاکرہ نے بتایا تھا کہ وہ ہر
سال نہایت اچھے نمبروں سے پاس ہوتی رہی ہے۔

"وہ دونوں اب کتنے بڑے ہو چکے ہوں گے۔" اس نے تحیر اور مسرت کے عالم میں
سوچا۔ "میں نے انہیں آخری بار اس روز عدالت میں دیکھا تھا جب مقدمے کا فیصلہ سنایا گیا
تھا اور اب اس بات کو دس سال گزر چکے ہیں۔ اُف میرے خدا! دس سال میرے اور ان
دونوں بچوں کے درمیان دس سال کا فاصلہ حائل ہے۔ بچوں کے لئے تو یہ فاصلہ بہت
زیادہ ہوتا ہے کیونکہ ان کی شکل و صورت میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہتی
ہیں۔ وہ دونوں تو اب اتنے بدل چکے ہوں گے کہ میں انہیں پہچان بھی نہیں سکوں گا۔
دونوں اب جوان ہوں گے ہائے۔ خدا جانے اب کتنے پیارے کتنے خوبصورت نظر آتے
ہوں گے دونوں اور ڈاکٹرنی افشاں۔ ہاں ڈاکٹرنی افشاں۔ اپنے ہاتھوں میں آلہ لئے ہوئے
سفید لمبا کوٹ پہنے کس مزے سے گٹ پٹ گٹ پٹ انگریزی بولتی ہو گی۔ میں تو اس کی
زبان بھلا کیا خاک سمجھوں گا۔ اس کی باتیں ہی سمجھ لوں تو بڑی بات ہے اس نے تو خدا
جانے کیا کیا کچھ پڑھ رکھا ہو گا۔"

اس کے ہونٹوں پر بڑی نرم اور دلآویز مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ یادوں'
امیدوں اور آرزوؤں کا نشہ اس کے رگ و پے میں اتر رہا تھا۔ اس کا بس نہیں تھا کہ وہ پَر

لگا کر اُڑ جائے اور سیدھا کراچی پہنچ جائے۔

جیل سے رہا ہونے سے پہلے اسے لباس تبدیل کرنے اور اپنا حلیہ ٹھیک ٹھاک کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ چنانچہ جب وہ جیل سے باہر آیا تھا تو اچھے خاصے معقول حلیے میں تھا لیکن اس دس سال کے عرصے میں اس کے اندر جتنی تبدیلیاں ہو چکی تھیں ان کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

وہ سیدھا ریلوے اسٹیشن پہنچا اور اس نے کراچی جانے والی گاڑی کے بارے میں معلومات حاصل کیں۔ گاڑی آنے میں ابھی کئی گھنٹے باقی تھے۔ اس نے یہ وقت بڑی بے چینی کے عالم میں ریلوے اسٹیشن پر ہی گزارا اور پھر جب گاڑی آئی تو وہ اس میں بیٹھ کر کراچی کے لئے روانہ ہو گیا۔

گاڑی رات کے پچھلے پہر کراچی پہنچی تھی۔ ویسے تو اسے بہت پہلے پہنچ جانا چاہئے تھا لیکن وہ کئی گھنٹے لیٹ تھی اور اسی لئے وہ رات کے پچھلے پہر کراچی پہنچی۔ یہ ایسا وقت نہیں تھا کہ نور احمد اپنے گھر جا سکتا اب اسے صبح تک انتظار کرنے کی ضرورت تھی۔

اس نے رات کا بقیہ حصہ کراچی کینٹ کے ریلوے اسٹیشن پر ہی گزارا کچھ دیر تک وہ مسافر خانے میں بیٹھا رہا اور کچھ دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہا۔ دل کے اضطراب کا عجیب و غریب عالم تھا بس کسی طرح صبح ہو .... کسی طرح صبح ہو .... مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج صبح ہو گی ہی نہیں۔

آخر خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ 19 جنوری 1989ء کی صبح اور نور احمد نے یہیں ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا پھر رکشا لے کر سیدھا لسبیلہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

دس سال کے عرصے میں کراچی میں اسے بہت تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ رکشوں کے میٹر پہلے سے دوگنی رفتار سے بھاگنے لگے تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ہجوم اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ کینٹ اسٹیشن سے لے کر لسبیلہ تک کے راستہ میں بہت سی نئی عمارتیں اور شاپنگ پلازہ بن چکے تھے۔ ہر طرف فلیٹوں کی ریل پیل نظر آ رہی تھی۔ بہت سی پرانی عمارتیں منہدم کی جا چکی تھیں اور وہاں بڑی بڑی کثیر المنزلہ عمارتیں تعمیر کی جا رہی تھیں۔ مجموعی طور پر شہر میں ہر طرف کثیر المنزلہ عمارتوں کی حکومت نظر آنے لگی تھی۔ جن میں نیچے دکانیں ہوتی تھیں اور اوپر فلیٹ۔ نور احمد یہ سب کچھ دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

اس نے اس شہر میں برسوں سبزی کا ٹھیلا چلایا تھا اور وہ یہاں کی رگ رگ اور نس نس سے واقف تھا۔ صبح کے اس حصے میں سڑکوں پر اسے جتنا ٹریفک اور لوگوں کا ہجوم نظر آ رہا تھا اتنا اس کے زمانے میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہر میں بسوں کی تعداد کچھ کم اور منی بسوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی۔ رکشوں اور ٹیکسیوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔

"شہر بہت بدل گیا ہے۔" اس نے دل ہی دل میں مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ "بہت کچھ بدل گیا ہے اور کیوں نہ بدلے گا آخر دس سال کا عرصہ بھی تو گزر گیا ہے اس عرصہ میں ہر چیز دس سال آگے جا چکی ہے۔ ہر چیز کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو چکا ہے۔ کہاں کہاں تبدیلی نہیں ہوئی ہو گی .... تبدیلی ہونا تو ضروری ہے۔"

"بس بھیا بس۔" اس نے لسبیلہ کے چوک سے ذرا آگے بڑھتے ہی رکشہ کو روک لیا اس سے آگے پیدل کا راستہ تھا۔ اس نے رکشے والے کو کرایہ ادا کیا اور کچے راستے سے نیچے اترنے لگا۔

دل کی دھڑکن لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جا رہی تھی اور آنکھوں میں رنگ سے اترتے آ رہے تھے۔ اب چند منٹ کے اندر اندر وہ اپنے گھر پہنچنے والا تھا۔ کس قدر حیرت ہو گی ان سب کو اسے دیکھ کر۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ وہ رہا ہو کر سیدھا گھر آ جائے گا۔ اف وہ سب لوگ کس قدر خوش اور حیران ہوں گے۔ بچے تو شاید اسے پہچان بھی نہ سکیں وہ یہی سمجھیں گے کہ کوئی اجنبی گھر میں گھس آیا ہے۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ کافی آگے نکل آیا ہے اور اس کی بستی پیچھے رہ گئی ہے۔ وہ ندی کے خشک کنارے سے کافی فاصلے پر اس کے متوازی چلا جا رہا تھا لیکن وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ ندی کے کنارے سے ملی ہوئی بھی نہیں اور اوپر کی طرف بھی نہیں۔ شاید وہ اپنے خیالات کی دھن میں بہت آگے نکل آیا ہے۔ وہ رک گیا اور رک کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اور تب اس کے ذہن میں ایک الجھن سی پیدا ہو گئی۔ اس جگہ کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا یہاں تو آبادی ہی نہیں تھی۔ اس نے اچھی طرح سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس جگہ سے صرف تھوڑے سے فاصلے پر ہی موجود تھا جہاں اس کی بستی ہوا کرتی تھی لیکن اب وہاں کوئی بستی نہیں تھی۔ وہاں کسی آبادی کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ صرف کچھ اونچے نیچے، بے ترتیب اور ناہموار سے ٹیلے تھے، جن میں سے سیلی سیلی ناگوار بو آ رہی تھی اور جگہ جگہ کیکر کی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ایک ٹیلے پر دو بڑے قد کے کتے خوفناک انداز میں لڑ رہے تھے۔ پھر وہ لڑتے لڑتے ٹیلے کے دوسری جانب اتر گئے اور پھر نظروں سے غائب ہو

گئے۔

"یا میرے خدا' یہ کیا چکر ہے؟" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "میں غلطی تو نہیں کر رہا ہوں' نہیں۔ دس سال گزرے ہیں دس صدیاں تو نہیں گزریں۔ میں اپنا گھر کیسے بھول سکتا ہوں؟" اسے یقین تھا کہ وہ صحیح جگہ سے نیچے اترا ہے اور بالکل ٹھیک راستہ طے کرتا ہوا' ٹھیک جگہ پر آیا ہے لیکن وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔

وہ تقریباً دو گھنٹے تک اس جگہ کے آس پاس دیوانوں کی طرح بھٹکتا پھرا۔ کبھی وہ ندی کے کنارے کے متوازی آگے کی جانب چلا جاتا اور کبھی پیچھے واپس پلٹ پڑتا۔ اس کا ذہن ماؤف ہوا جا رہا تھا اور دل و دماغ پر وحشت سی طاری تھی۔

ساری کوشش ناکام ہو گئی۔ اسے اپنی بستی نہیں ملی۔ جہاں کبھی اس کی بستی تھی اس کا گھر تھا وہاں اونچے نیچے مرطوب اور سیلے ہوئے ٹیلوں کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ جن کے اندر سے جیسے سڑے ہوئے پانی کی بو آ رہی تھی۔

وہ بوجھل اور تھکے ہوئے قدموں سے واپس ہوا اور اوپر چڑھنے لگا۔ اب لسبیلہ کے پاس جا کر کسی سے اس جگہ کے بارے میں پوچھنا ہو گا۔ پوری کی پوری بستی غائب ہے۔ سب لوگ غائب ہیں۔ وہ سخت بدحواسی کا شکار تھا اور اسے لگتا تھا کہ وہ کسی حیرت کدے میں آ گیا ہے۔

اچانک ایک چھوٹی سی دکان کے آگے وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ ایک درزی کی دکان تھی۔ بہت ہی معمولی قسم کی دکان جس میں ایک میز کے سامنے کھڑا ہوا ایک بالکل سفید بالوں والا بوڑھا درزی ایک بھاری قینچی ہاتھ میں لئے ہوئے کوئی کپڑا کاٹ رہا تھا۔ نور احمد نے اس درزی کو دیکھا اور پھر اسے دیکھتا ہی رہا۔ اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ بوڑھا درزی دلشاد خان تھا جو آج سے تقریباً بارہ سال پہلے بھی بوڑھا تھا اور آج پہلے مقابلے دس سال زیادہ بوڑھا تھا اور اب اس کے سر میں جو بھی تھوڑے بہت بال باقی تھے ان میں ایک بھی کالا بال نہیں تھا۔ دلشاد خان کو دیکھ کر اور پہچان کر تقریباً گیارہ سال پہلے کی اس خون آلود شام کے جگر خراش مناظر نور احمد کی نظروں کے سامنے گھوم گئے۔ یہ دلشاد خان ہی تو تھا جس نے اس شام اپنی باری سے دستبردار ہونے کی پیشکش کی تھی اور نور احمد اور عبدالرحیم کے درمیان جھگڑا ختم کرانا چاہا تھا لیکن کسی نے بھی تو اس کی بات نہیں مانی اور پھر......... وہ سب کچھ ہو گیا تھا۔

نور احمد بے دھڑک دکان کے اندر داخل ہو گیا اور دلشاد خان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ بوڑھے درزی کے کپڑا کاٹتے ہوئے ہاتھ رک گئے اور وہ اپنی بھنویں سکیڑ کر اس اجنبی کو دیکھنے لگا جو دکان میں داخل ہو کر سیدھا اس کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔

"جی کہئے۔" دلشاد خان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں کہا۔ "کیا کام ہے؟"

"مجھے پہچانا نہیں دلشاد چاچا!" نور احمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس نے دلشاد خان کی آواز سن کر اسے اور بھی اچھی طرح پہچان لیا تھا اور اس کی آنکھیں بھیگنے لگی تھیں۔ بوڑھے دلشاد خان کے بوڑھے اور گھسے ہوئے پیکر میں اسے اپنی گمشدہ مسرتوں کی تجسیم نظر آ رہی تھی۔

"کون ہیں آپ؟" بوڑھے نے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا بھائی اب نظر بھی کافی کمزور ہو گئی ہے اور دماغ بھی' یادداشت پوری طرح ساتھ نہیں دیتی۔ کوئی کپڑا دے گئے تھے آپ سینے کے لئے؟ کاریگر آج چھٹی پر ہے۔"

"دلشاد چاچا!" نور احمد نے آگے بڑھ کر اس کے بوڑھے اور ناتواں کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "میں نور احمد ہوں۔ مجھے پہچانو۔ نور احمد۔ تمہارا پڑوسی .... آج سے تقریباً دس سال پہلے........." اور اس کے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا بلکہ اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔ کیونکہ بوڑھے درزی نے اسے پہچان لیا تھا اور بڑے جوش و مسرت کے عالم میں اسے اپنے کمزور بازوؤں کے ساتھ اپنے کمزور سینے سے جکڑ لیا تھا اور کچھ دیر کے بعد وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے .... اور پھر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

نور احمد کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بچوں کی طرح سسک سسک کر رو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی بوڑھا درزی دلشاد خان بھی رو رہا تھا۔ دونوں ان بیتے ہوئے دنوں کو یاد کر کے رو رہے تھے جو ماضی کے مردہ خانوں میں جا کر دفن ہو گئے تھے اور اپنے ساتھ بہت کچھ لے گئے تھے۔

دلشاد خان کی زبانی نور احمد کو یہ معلوم ہوا کہ آج سے تقریباً چار سال پہلے برسات کے موسم میں ایک رات نہایت شدید طوفانی بارش کے دوران ندی میں ایک دم طغیانی آ گئی اور سیلاب کا پانی پوری بستی کو بہا کر لے گیا۔ سارے مکانات مع اپنے مکینوں اور ساز و سامان کے بہہ گئے۔ کچھ تھوڑے سے پکے مکانات بچ گئے تھے جنہیں بعد میں حکومت نے مسمار کروا دیا۔ اس رات کی طوفانی بارش میں نور احمد کا گھر بھی بہہ گیا۔ اس کی بیوی شاکرہ

اور بیٹا عمران گھر پر ہی تھے اور ان دونوں کی لاشیں بھی دستیاب نہیں ہو سکیں۔ زیادہ
لاشیں ندی میں بہتی ہوئی سمندر تک چلی گئی تھیں اور وہاں سے غائب ہو گئی تھیں۔ اس
کے بعد سے وہ بستی ہمیشہ کے لئے اجڑ گئی اور حکومت نے وہاں کسی کو ایک جھونپڑی
بنانے کی اجازت نہیں دی۔ اب وہاں صرف اونچے نیچے بدبودار مرطوب اور بے
ٹیلوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

جس پانی کے حصول کی خاطر نور احمد کے ہاتھوں ایک انسان کا قتل ہو گیا تھا' اس
پانی کی خاطر دو گھرانوں کی زندگی تباہ ہو گئی تھی' اسی پانی نے ایک خوفناک اور ظالم روپ
بن کر ان سب لوگوں کو ختم کر دیا تھا۔

"پانی کے ہاتھوں ہونے والے قتل!" نور احمد اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھامے
ہوئے تھا۔

"تمہاری بیٹی اس وقت اپنے گھر میں نہیں تھی۔" بوڑھے دلشاد خان نے بتایا۔ "وہ
اپنی کسی سہیلی کے گھر کسی تقریب میں گئی ہوئی تھی اور بارش زیادہ ہونے کے باعث وہیں
رک گئی۔ اس طرح اس کی جان بچ گئی اور اسی طرح میں بھی ان خوش نصیبوں میں سے
ایک تھا جو اس رات اپنے گھر سے باہر تھے۔"

"میری بیٹی؟" نور احمد نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی' اچانک مسرت اور حیرت سے
بھرا جانے والی آواز میں پوچھا۔ "میری بیٹی..........؟"

"ہاں بھیا۔" دلشاد خان نے کہا۔ "میں تمہاری بیٹی افشاں کی بات کر رہا ہوں۔ اس
کی جان بچ گئی تھی اور پھر وہ شاید ہاسٹل میں رہنے لگی تھی اور پھر وہ ڈاکٹرنی بن گئی۔ ابھی سال
بھر سے کچھ کم کا عرصہ ہوا عابد پان والے کی ماں کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ حیدر آباد کے
زنانے ہسپتال میں کام کرتی ہے۔ عابد پان والے کی ماں ان دنوں حیدر آباد میں گئی ہوئی
ہے وہ اپنی بہو کو زنانہ ہسپتال لے کر گئی تھی وہاں اسے افشاں نظر آئی تھی۔"

"افشاں زندہ ہے۔" چاروں طرف پھیلے ہوئے گھور اندھیرے میں اچانک
روشنی کی ایک تیز اور دل و دماغ کو ٹھنڈک پہنچانے والی کرن نمودار ہوئی۔ "افشاں
ہے۔ میری بیٹی۔ میری ڈاکٹرنی بیٹی۔ زندہ ہے۔" نور احمد کی آواز بری طرح کانپ
تھی۔

"ہاں بیٹا!" درزی دلشاد خان نے کہا۔ "کوئی سال بھر پہلے تک کی خبر تو مجھ
ہے آگے کا اللہ جانے۔"

اور اس کے کچھ دیر کے بعد نور احمد نے تین ہٹی سے حیدر آباد جانے والی بس لی اور
سیدھا حیدر آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کا دل غم کے بوجھ سے پھٹا جا رہا تھا۔ شاکرہ
اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔ عمران اس دنیا میں نہیں رہا تھا۔ چار سال سے زیادہ کا عرصہ
گزر گیا اور ظالم پانی ان کو نگل گیا تھا۔ پانی' اف پانی۔

لیکن افشاں تو زندہ تھی وہ تو ڈاکٹرنی بھی تھی اور حیدر آباد کے زنانہ ہسپتال میں کام
بھی کر رہی تھی تو پھر اس نے .... اس نے کبھی ملاقات کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یا
اگر وہ وہاں نہیں آنا چاہتی تھی تو کم از کم ایک خط لکھ کر ہی حالات سے مطلع کر سکتی تھی۔

"کم از کم مجھے صورت حال کا علم تو ہو جاتا۔" وہ سوچ رہا تھا۔ "میں چار سال سے
اس بے خبری کی آگ میں جل رہا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ باہر کیا ہو چکا ہے؟ میری
بیٹی نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"

نور احمد نے اپنا سر سامنے والی سیٹ کی پشت پر ٹکا رکھا تھا اور اس کی آنکھوں سے
بے تحاشہ آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بہت کوشش کر رہا تھا کہ ان آنسوؤں کو روک لے
لیکن طوفان تھا کہ امنڈا چلا آ رہا تھا۔ شاکرہ اور عمران دونوں مر چکے تھے۔ دونوں کو پانی نے
نگل لیا تھا اور وہ انہیں زندہ سمجھ کر ان کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ مگر افشاں ....
اس کی اپنی پیاری بیٹی افشاں نے جو اس تباہی سے بچ گئی تھی اور جو اب ڈاکٹرنی بن چکی
تھی' اس سے کیوں آنکھیں پھیر لیں؟ اس سوال کا جواب تو اسی وقت مل سکے گا جب
افشاں سے ملاقات ہو گی۔

سارے راستے اس کا دل خون کے آنسو روتا رہا اور وہ کرب کی ایک عجیب و غریب
کیفیت سے دوچار رہا۔ مرنے والوں کا ناقابل برداشت دکھ تو اپنی جگہ پر تھا ہی لیکن جو
زندہ تھے اور جنہوں نے خاموشی اختیار کر لی تھی ان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا تھا؟

جب وہ حیدر آباد کے زنانہ ہسپتال کے بڑے گیٹ میں داخل ہو رہا تھا تو اس کی
ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اسے ایسا
لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ابھی ابھی بس گر پڑے گا۔ اتنی کمزوری' اتنی شدید کمزوری اس نے
کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ہاتھ پیروں میں ایسی سنسنی دوڑ رہی تھی کہ جان نکلی جا رہی
تھی۔

وہ تقریباً سہ پہر کا وقت تھا اور ہسپتال میں بیرونی مریضوں کے دیکھے جانے کا وقت ختم
ہو گیا تھا۔ اسی وجہ سے رش بالکل نہیں تھا۔ چوکیدار نے کھچڑی بالوں والے اس بوڑھے

کو اندر جانے کی اجازت دے دی کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اس کی بیٹی اس ہسپتال میں کام کرتی ہے اور وہ اس سے ملنے جا رہا ہے۔

کاؤنٹر پر دو نرسیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ نور احمد جلدی جلدی چلتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور ان میں سے ایک سے مخاطب ہو کر بولا۔ "میں لیڈی ڈاکٹر افشاں صاحبہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ اس وقت کہاں ہوں گی؟"

"لیڈی ڈاکٹر افشاں؟" نرس نے بھویں سکیڑ کر کہا۔ "آپ کا مطلب ہے ڈاکٹر افشاں عبدالحمید؟"

"جی نہیں۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ "ڈاکٹر افشاں ولد نور احمد........"

"ارے یہ انہی کو تو پوچھ رہے ہیں۔" دوسری نرس جلدی سے بولی۔ "شادی سے پہلے تو وہ ڈاکٹر افشاں نور احمد ہی تھیں۔ افشاں عبدالحمید تو وہ شادی کے بعد بنی تھیں۔" اور پھر وہ نور احمد سے مخاطب ہوئی۔ "وہی نا جو کراچی سے یہاں آئی تھیں؟"

"جی ہاں جی ہاں۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ اس کے ہاتھ پیر بے جان ہوئے جا رہے تھے۔

"وہ .... اپنے شوہر ڈاکٹر عبدالحمید کے ساتھ ہنی مون پر یورپ گئی ہوئی ہیں۔" نرس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تین ماہ پہلے ان کی شادی ہوئی ہے اور وہ فی الحال چھ ماہ کی چھٹی پر ہیں۔"

☆======☆======☆

افشاں نے اپنے باپ کو آخری بار اس روز دیکھا تھا جس روز اسے عدالت سے سزا ہوئی تھی اور اس دن کو اب تک کئی برس گزر گئے تھے۔ نور احمد نے اپنی قید کا تقریباً ایک سال کا زمانہ کراچی جیل میں گزارا تھا اور پھر وہ سکھر جیل چلا گیا تھا۔ سزا یاب ہونے کے بعد سے افشاں نے اپنے باپ کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باپ کے ساتھ اس کا رابطہ صرف ماں کے حوالے سے ہوتا تھا جو سال میں ایک بار اس سے ملاقات کے لئے سکھر جاتی تھی۔ باپ کی مشکل یہ تھی کہ وہ بے چارہ ان پڑھ تھا اس لئے وہ خود اپنے بچوں کو خط بھی نہیں لکھ سکتا تھا۔ اسے گھر کوئی بھی خط بھیجنا ہوتا تھا تو دوسروں سے لکھوانا پڑتا۔ البتہ دونوں بچے اسے خود لکھ کر خط بھیجتے تھے اور یوں ان کے درمیان گاہے بگاہے خطوط کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔

ماں کی ہدایت کے مطابق افشاں اور عمران دونوں نے اسکول اور کالج میں اپنے

ساتھیوں سے یہ بات چھپائی تھی کہ ان کا باپ جیل میں ہے اور قتل کے الزام میں سزا کاٹ رہا ہے۔ شاکرہ ایک تجربے کار اور ہوشیار عورت تھی۔ وہ اس بات کو بخوبی جانتی تھی کہ لوگ کسی کا غریب اور مفلس ہونا تو برداشت کر سکتے ہیں لیکن سزا یافتہ قاتل اور مجرم ہونا برداشت نہیں کر سکتے۔ کوئی اس بات پر غور نہیں کرتا کہ آیا وہ شخص واقعی مجرم ہے یا اسے غلط طور پر سزا دی گئی ہے اور نہ ہی کوئی اس بات پر توجہ دیتا ہے کہ اگر واقعی اس شخص نے جرم کیا ہے تو اس جرم کے محرکات کیا تھے' وہ کیا حالات تھے جن میں اس سے یہ جرم سرزد ہوا اور کیا وہ واقعی مذمت و ملامت اور استرداد کا سزاوار ہے۔ بھلا ان ساری باتوں پر کون غور کرتا ہے؟ لوگ صرف ایک بات جانتے ہیں۔ مجرم ہے تو قابلِ مذمت ہے اور اس سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہئے۔

شاکرہ نے یہ ساری باتیں اپنے دونوں بچوں کے دماغوں میں اچھی طرح بٹھا دی تھیں اور انہیں اس خطرے سے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر ان کے ساتھیوں کو یہ علم ہو گیا کہ اُن کا باپ سزا یافتہ قاتل ہے تو ساتھیوں کی نظروں میں ان کی دو کوڑی کی عزت نہیں رہے گی۔ چنانچہ ان دونوں نے اپنے تمام ساتھیوں میں یہی مشہور کر رکھا تھا کہ ان کے ابا لمبے عرصے کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔

باپ سے مسلسل دوری باپ اور بچوں کے درمیان ایک برابر وسیع ہوتے رہنے والے خلا کو جنم دے رہی تھی جو معروضی حالات کا تقاضہ تھا۔ بچوں کی اپنے باپ کے ساتھ جذباتی وابستگی بتدریج کم ہوتی جا رہی تھی اور ان کی زندگی میں ماں کی شخصیت کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

دردانہ ایک بہت بڑے گھر کی لڑکی تھی اور وہ ڈاؤ میڈیکل کالج میں افشاں کی کلاس فیلو تھی۔ افشاں کا شمار اپنی کلاس کے بہترین طلباء میں ہوتا تھا اور اسے ایک بہت ذہین اور محنتی طالب علم کی حیثیت سے اپنے اساتذہ اور ساتھی طلباء کی نظروں میں ایک خاص حیثیت حاصل تھی۔ دردانہ اور افشاں میں بہت دوستی تھی۔ یہ دوستی شروع سے ہی چلی آ رہی تھی۔ دونوں نے انٹر سائنس بھی ایک ہی کالج سے کیا تھا اور ایک ساتھ ہی ڈاؤ میڈیکل کالج میں داخلہ لیا تھا۔

کالج اور دیگر تعلیمی اداروں میں طلباء کی دوستیاں عام طور سے ان کی سماجی حیثیتوں سے لاتعلق ہوتی ہیں۔ تعلیمی ادارہ ایک ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں تمام طلباء اپنے اپنے سماجی مرتبوں سے قطع نظر اس لحاظ سے ایک جیسے ہوتے ہیں کہ وہاں ان سب کا مقصد و نصب

العین ایک ہی ہوتا ہے۔ پڑھنا' تعلیم حاصل کرنا۔ امتحان پاس کرنا اور ان کے درمیان اگر مقابلہ ہوتا ہے تو ذہانت اور محنت اور پڑھائی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ چنانچہ افشاں اور دردانہ کے درمیان بھی ان کے گہرے سماجی فرق کے باوجود گہری دوستی تھی۔ افشاں نے اپنے گھر کے حالات دردانہ سے یا کسی سے بھی کبھی نہیں چھپائے تھے۔ سب جاننے والوں کو یہ بات معلوم تھی کہ وہ ایک غریب خاندان کی لڑکی ہے جس کی ماں ایک محنت کش عورت ہے اور یہ خاندان گولی مار کے پل کے نیچے ایک کچی اور ناجائز طور پر تعمیر کردہ بستی میں رہتا ہے۔

دردانہ کا بڑا بھائی حمید بھی اسی کالج میں پڑھتا تھا اور وہ ان دونوں سے دو سال سینئر تھا۔ حمید اور افشاں کی پہلی ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب افشاں فرسٹ ایئر سائنس میں پڑھتی تھی اور ایک دن حمید اسے اور اپنی بہن دردانہ کو گاڑی میں بٹھا کر کالج سے اپنے گھر لایا تھا۔ افشاں بہت خوبصورت لڑکی تھی اور وہ پہلے ہی دن حمید کو بہت اچھی لگی۔ افشاں کو بھی حمید اچھا لگا اور پھر رفتہ رفتہ ان کی ملاقاتوں اور دوستی میں اضافہ ہوتا گیا اور پھر دو سال بعد تو وہ دونوں ایک ہی کالج کے طالب علم بن گئے اور پھر بالکل غیر محسوس طریقے پر حمید اور افشاں کی دوستی محبت میں بدلتی گئی۔

لیکن افشاں اتنا بڑا خواب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ حمید کو پسند ضرور کرتی تھی لیکن حمید کے ساتھ شادی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی محبت تو بس چپکے چپکے چاہنے تک محدود تھی۔ کتنی ہی محبتیں ایسی ہوتی ہیں جن کے انجام سے انسان بخوبی واقف ہوتا ہے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتا ہے کہ نہ تو وہ اپنے محبوب کو حاصل کر سکے گا اور نہ کبھی اس کے ساتھ زندگی گزار سکے گا۔ پورے یقین کے ساتھ اس بات کو جاننے کے باوجود بھی وہ پوری سچائی کے ساتھ اپنے محبوب سے محبت کرتا ہے اور ناکامیوں' محرومیوں اور فرقتوں کی دولت سمیٹ کر اس سے اپنے جذباتی خزانے کو مالا مال کرتا ہے۔ افشاں کی حالت بھی کم و بیش یہی تھی۔

لیکن حمید کی حالت اس سے مختلف تھی۔ اس نے افشاں سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اپنے ماں باپ کو بھی اس بات کے لئے راضی کر لیا تھا۔ آخر کیا خرابی تھی اس لڑکی میں؟ وہ بہت ذہین اور سمجھدار تھی' بہت خوبصورت تھی۔ اپنی کلاس میں بہترین طالب علم تھی اور ایک دن ڈاکٹر بن کر نہایت کامیاب زندگی گزار سکتی تھی۔ بس یہی نا وہ ایک غریب اور معمولی خاندان سے تھی۔ تو کیا ہوا یہ غربت تو بہت جلد ختم ہو جانے والی

تھی۔ ڈاکٹر بن جانے کے بعد اس کی سماجی حیثیت بالکل بدل جاتی۔ اسے کسی ہسپتال یا کلینک وغیرہ میں نوکری مل سکتی تھی اور وہ اپنی آزاد پریکٹس بھی کر سکتی تھی جس میں وہ بہت زیادہ کامیاب رہتی کیونکہ وہ یقینی طور پر بہت اچھی ڈاکٹر بنتی اور یہ بات حمید کے والدین کی سمجھ میں آ گئی۔ افشاں کی غربت عارضی تھی جو آئندہ چل کر ختم ہو جانے والی تھی۔

حمید کے والدین خود بہت زیادہ دولت مند ہونے کے باوجود ایک غریب خاندان کی لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے لئے بخوشی تیار تھے کیونکہ غریب خاندان کی یہ لڑکی آئندہ چل کر ان کے لئے عزت' دولت' سماجی حیثیت اور خاندانی وقار ساری چیزوں میں اضافے کا سبب بن سکتی تھی۔

اس شام دردانہ کی سالگرہ تھی۔ افشاں کالج سے ہی سیدھی اس کے گھر چلی گئی تھی۔ اس کی ماں کو معلوم تھا کہ وہ سیدھی دردانہ کے ہاں چلی جائے گی اور وہ مطمئن تھی۔ افشاں اکثر دردانہ کے گھر جایا کرتی تھی اور پھر دردانہ خود ہی اپنے ڈرائیور کے ساتھ اسے لسبیلہ کے قریب چھوڑ جایا کرتی تھی۔

سہ پہر سے ہی بارش شروع ہو گئی اور رات ہوتے ہوتے تو بارش نے ایسا زور باندھا کہ قیامت برپا ہو گئی۔ کئی گھنٹے کی موسلا دھار بارش نے ساری شہری زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیا۔ رات کے بارہ بج گئے تھے اور اس قدر طوفانی بارش ہو رہی تھی کہ سوائے بسوں اور ٹرکوں جیسی بڑی گاڑیوں کے کوئی گاڑی سڑک پر نہیں چل سکتی تھی اور افشاں حیران و پریشان دردانہ کے گھر پھنسی بیٹھی تھی۔ سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ وہ اپنی بستی تک تو کسی طرح بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اور رات کے دو بجے وہ سانحہ پیش آیا جس سے افشاں اگلے دن ہی واقف ہو سکی۔ لیاری ندی میں سیلابی پانی نے بڑھ کر کناروں کو تیزی سے کاٹنا شروع کر دیا اور پھر وہ بستی بھی پانی کی لپیٹ میں آ گئی جو کافی عرصے سے محفوظ چلی آ رہی تھی۔ مٹی تیزی سے جگہ جگہ سے کٹنے لگی اور بلندی پر بنے ہوئے مکانات بھی ڈھلک ڈھلک کر گرنے لگے۔ پھر ایک زبردست ریلا آیا اور آن کی آن میں ساری بستی مع مکانوں اور مکینوں کے غرقاب ہو گئی اوپر سے بھی موسلادھار بارش ہو رہی تھی اور نیچے سے بھی پانی کا سمندر موجیں مار رہا تھا۔ کوئی کسی کی مدد نہ کر سکا سب کچھ ختم ہو گیا۔ ڈوبنے والوں کی لاشیں لیاری ندی کے بہاؤ میں شامل ہو کر سمندر تک چلی گئیں اور بحیرۂ عرب نے انہیں نگل لیا۔ جو لوگ

سمندر کا لقمہ بنے ان میں شاکرہ اور اس کا بیٹا عمران بھی شامل تھے۔

رات کے آخری حصے میں بارش رک گئی اور اگلے دن صبح کو دردانہ اور حمید افشاں کو ایک بڑی گاڑی میں بٹھا کر اس کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ جگہ جگہ پانی کی پیدا کردہ رکاوٹوں کو پار کر کے جب وہ اس جگہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ پانی تو افشاں کا سب کچھ بہا کر لے گیا۔

حمید اور دردانہ صدمہ سے نڈھال اور نیم بے ہوش افشاں کو اپنے ساتھ واپس گھر لے آئے۔ افشاں کا اب دنیا میں کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ حمید اور دردانہ کے والدین نے افشاں کو اپنی سرپرستی میں لینے اور ہاسٹل میں رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

کئی ماہ تک تو افشاں اس دوہرے صدمے کے بوجھ تلے دبی رہی اور پھر جب صدمے کی شدت ذرا کم ہوئی تو اس نے سوچا کہ اپنے باپ کو خط لکھ دے اور اس سانحے سے اسے مطلع کر دے لیکن پھر وہ یہ سوچ کر اس خیال سے باز رہی کہ ابا بے چارے تو خود ہی قید و بند کے عذاب جھیل رہے ہیں ان کو اس تازہ حادثے کی اطلاع دے کر ان کے صدمے میں کیوں اضافہ کیا جائے۔ "میں کبھی خود جاؤں گی اور انہیں سب کچھ بتا دوں گی۔" اس نے سوچا اور پھر وہ زندگی کی گوناگوں مصروفیتوں میں گم ہو گئی۔ کالج تھا' پڑھائی تھی' ہاسٹل کی زندگی تھی' دردانہ کی دوستی تھی اس کے گھر والوں کے احسانات تھے اور سب سے بڑھ کر سب سے قیمتی اور نایاب شے حمید کی محبت تھی۔ حمید نے اسے اپنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ کبھی کبھی باپ کو یاد کرتی تھی اور اس کے دل میں یہ بھی خیال آیا تھا کہ ابا کو جب اپنے گھر کی طرف سے کوئی خبر نہیں ملے گی تو وہ کس قدر پریشان ہوں گے پھر وہ یہ سوچنے لگتی کہ ان کے لئے اس سے کوئی زیادہ فرق بھی تو نہیں پڑتا کہ باہر کون زندہ ہے اور کون مر گیا۔ ان کی اپنی زندگی ہے جیسے بھی گزر رہی ہے۔

ماں اور بھائی کی موت اور گھر کی بربادی کے صدمے کے اثرات جب زائل ہوئے تو ایک نئی اور خوبصورت زندگی اس کے خیرمقدم کے لئے تیار کھڑی تھی اور وہ اس زندگی میں ایک سزا یافتہ قاتل کے لئے کوشش کے باوجود کوئی جگہ نہیں نکال پا رہی تھی۔

اس جذباتی اور ذہنی کشمکش میں دن پر دن گزرتے چلے گئے اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکی۔ وہ نہ تو اپنے باپ سے رابطہ قائم کر سکی اور نہ حمید کو اس کی اصلیت کے بارے میں کچھ بتا سکی۔ زندگی کی اس نہایت کٹھن آزمائش میں وہ کوئی ٹھوس اور فیصلہ کن قدم اٹھانے کے بجائے اپنے آپ کو بہلانے میں مصروف رہی۔ "ابا کی رہائی میں تو ابھی کئی

سال باقی ہیں۔" وہ اپنے آپ سے کہتی۔ "وہ جیل میں ہی تو ہیں۔ کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے ہیں۔ کچھ نہ کچھ سوچ لوں گی۔ کوئی راستہ نکال لوں گی۔ مناسب وقت پر حمید کو بتا دوں گی۔ وہ بہت سمجھدار آدمی ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میری بات سمجھ لیں گے۔" دن گزرتے گئے۔ برس گزرتے چلے گئے اور اس کی نوبت نہ آ سکی۔ یہاں تک کہ حمید ڈاکٹر بن گیا اور کچھ عرصے بعد حیدر آباد کے ایک ہسپتال میں کام کرنے لگا۔ دو سال بعد افشاں بھی ڈاکٹر بن گئی اور کچھ عرصے بعد حمید نے اپنی کوششوں سے اسے بھی حیدر آباد کے زنانہ ہسپتال میں ملازمت دلوا دی۔

اور اس طرح اپنے آپ کو طفل تسلیاں دیتی ہوئی' حقائق سے آنکھیں چراتی ہوئی اور تلخ اور جان لیوا سچائیوں کے نکیلے کانٹوں سے اپنے دامن کو بچاتی ہوئی وہ ایک دن ڈاکٹر عبدالحمید کی بیوی بن گئی اور ہنی مون منانے ملک سے باہر چلی گئی۔ نئی زندگی کی امیدوں' آرزوؤں' خوشیوں اور مسرتوں کو بہرحال ماضی کے مزاروں پر تو قربان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

☆======☆======☆

نور احمد ہسپتال سے باہر نکلا اور گیٹ کے پاس آ کر بس اسٹاپ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اس کا دل خون بن کر آنکھوں کے راستے بہا جا رہا تھا۔ کچھ باتیں اگر اس کی ٹھیک تھیں تو کچھ کرم حسین کی ٹھیک تھیں۔ شاکرہ اور عمران زندہ نہیں تھے اور اس نے ٹھیک ہی سوچا تھا کہ وہ لوگ کسی مشکل میں مبتلا ہیں۔ افشاں زندہ تھی اور اپنی دنیا میں مست اور مگن تھی اور کرم حسن نے ٹھیک سوچا تھا کہ "باہر والوں" کے اپنے مسائل ہوتے ہیں ان کی اپنی الگ دنیا ہوتی ہے اور "اندر والوں" کو ان سے بہت زیادہ توقعات نہیں رکھنی چاہئیں۔

یہ افشاں ہی تھی جس کی حمیدہ سے لڑائی ہوئی تھی۔ پھر نور احمد نے عبدالرحیم سے جھگڑا کیا تھا اور عبدالرحیم کو قتل کر دیا تھا اور اب افشاں سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس بدنصیب باپ کو بالکل بھول گئی تھی جو جیل میں پڑا سڑ رہا تھا۔ اس نے اسے اس کی بیوی اور بیٹے کی موت کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا اور نہ ہی اپنی شادی کے بارے میں بتانا مناسب سمجھا تھا۔

"واہ میری ڈاکٹرنی بیٹی.........." اس نے ایک پھیکی اور نیم مردہ مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔ "خدا تجھے خوش رکھے۔"

اس کے ہاتھ پیروں میں تو پہلے ہی سنسنی دوڑ رہی تھی اور دماغ بھی جیسے دھائیں

دھائیں کر رہا تھا۔ اچانک سینے میں درد کی ایک تیز اور شدید لہر اٹھی اور یہ درد ناقابل برداشت ہو تا گیا۔ اس نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن سنبھال نہ سکا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔

یہ دل کا دوسرا دورہ تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ کچھ دیر کے بعد اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں یہ معلوم ہوا کہ اس کی موت دل کا دورہ پڑنے سے واقع ہوئی تھی۔

21 جنوری 1989ء کے اخبارات میں ایک مختصر سی خبر شائع ہوئی۔ حیدر آباد زنانہ ہسپتال کے سامنے بس کے انتظار میں کھڑا ہوا ایک نامعلوم شخص دل کا دورہ پڑنے سے ہلاک ہو گیا۔

لیڈی ڈاکٹر افشاں عبدالحمید کی نظر سے یہ خبر کبھی نہیں گزری۔

☆======☆======☆

دعویٰ کس پر؟

اس نامعلوم شخص کی کہانی جس کی لاش، اخبار میں شائع ہونے والی خبر کے مطابق، کراچی میں ناظم آباد کے ایک فٹ پاتھ سے ملی۔

(22 جنوری 1989ء)

"ڈبل ہیس" کنڈکٹر مقصود نے دوباہ زور سے بس پر ہاتھ مارا اور چیخ کر آواز لگائی۔ "جانے دوس' جانے دوس۔"

ڈرائیور شیر علی نے ایکسیلیٹر پر پیر رکھ کر دباؤ ڈالا اور مسافروں سے بھری ہوئی بس تیزی سے سڑک پر بھاگنے لگی۔ شیر علی آس پاس کی گاڑیوں کو بچاتا ہوا' اسٹیرنگ کو تیزی کے ساتھ اِدھر سے اُدھر کاٹتا ہوا' بس کو دوڑا رہا تھا۔ پُرہجوم سڑک پر وہ بڑے بے ڈھنگے انداز میں گاڑی دوڑا رہا تھا۔

"جانے دوس۔" اچانک مقصود ایک بار پھر چلایا اور اس نے دو بار زور زور سے بس کی باڈی پر ہاتھ مارا۔ "جانے دو استاد پنجی اٹھ ونجا پیچھے آ رہی ہے۔ دبی رکھ' دبی رکھ۔"

پنجی اٹھ ونجا کے آنے کی خبر سنتے ہی شیر علی نے گاڑی کی رفتار میں ایک دم اضافہ کر لیا۔ اب وہ اسے بڑی تیزی کے ساتھ دوڑا رہا تھا۔ اسے آس پاس سے گزرنے والے ٹریفک کی' پیدل سڑک کراس کرنے والوں کی' بس سے اترنے اور چڑھنے والوں کی کسی کی اتنی پرواہ نہیں تھی جتنی اس بات کی کہ پنجی اٹھ ونجا اسے اوورٹیک کر کے آگے نہ نکل جائے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ آخری اسٹاپ پر وہ پہلے پہنچے اور زیادہ سے زیادہ مسافروں کو بس میں بھر کر وہاں سے جلد از جلد روانہ ہو جائے۔

پنجی اٹھ ونجا آج صبح ہی سے ان کا ٹرپ خراب کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

دونوں ٹو کے (K-2) کی بسیں تھیں جو ٹاور سے براستہ صدر نارتھ ناظم آباد جاتی تھیں اور آج صبح ہی سے دونوں میں زبردست دوڑ لگی ہوئی تھی۔

نارتھ ناظم آباد میں اپنے آخری اسٹاپ سے شیر علی اور مقصود کی بس پہلے روانہ ہوئی تھی' کیونکہ اس کا پہلا نمبر تھا۔ پنجی اٹھ ونجا کا دوسرا نمبر تھا اور وہ اس کے بعد روانہ ہوئی۔ رشید ترابی روڈ پر پنجی اٹھ ونجا نے ان کی بس کو اوورٹیک کر لیا اور آگے نکل گئی اور اس کے بعد ان دونوں بسوں میں ایک خوفناک ریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جو آخری بس اسٹاپ تک جاری رہا۔ آخری اسٹاپ پر پنجی اٹھ ونجا پہلے پہنچی اور مقصود اور شیر علی کی بس

بعد میں اور یہاں پہنچ کر دونوں بسوں کے ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں میں آپس میں کچھ تُو تُو مَیں مَیں بھی ہوئی لیکن دوسرے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا اور دونوں فریقین ایک دوسرے کو نفرت بھری' کینہ توز نظروں سے گھورتے ہوئے' آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہوئے واپس اپنی اپنی بسوں کی طرف چلے گئے۔

پنجی اٹھ ونجا پہلے روانہ ہوئی اسے آخری اسٹاپ پر پہنچنے کے تقریباً فوراً ہی بعد بہت سے مسافر مل گئے تھے۔ پھر اس نے زیادہ انتظار نہیں کیا' کیونکہ دوسری بس پیچھے لگی ہوئی تھی۔

مقصود اور شیر علی کی بس پنجی اٹھ ونجا کے جانے کے کوئی دس منٹ بعد روانہ ہوئی۔

"استاد چھوڑنے کا نہیں ہے پنجی اٹھ ونجا کو۔" مقصود نے اپنے ڈرائیور شیر علی کو للکارتے ہوئے کہا۔ "آگے جا کر پکڑنا ہے سالے کو۔ سارے دن کا ستیاناس کر رہی ہے۔ ہر ٹرپ کو خراب کرے گی۔"

"اوئے تُو آواز تو لگا جلدی جلدی۔" شیر علی نے چلا کر کہا۔ "آواز مار........... آواز مار۔"

اور مقصود کی زبان ایک دم قینچی کی طرح چلنے لگی۔ وہ نہایت روانی کے ساتھ ٹاور سے لے کر نارتھ ناظم آباد کے تمام اسٹاپوں کے نام ایک ہی سانس میں گنا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بیچ بیچ میں بس کی باڈی پر رک رک کر ایک ہاتھ بھی مارتا جا رہا تھا' جس کا مطلب تھا کہ پسنجر آ رہے ہیں۔ گاڑی کو ذرا روکا جائے۔

"ڈبل ہیس۔" مقصود نے دو دفعہ زور سے ہاتھ مارا اور شیر علی نے گاڑی کو اندھا دھند دوڑانا شروع کر دیا۔

اگلے اسٹاپ پر چڑھنے والا کوئی مسافر نہیں تھا۔ صرف ایک بڑے میاں اترنے والے تھے۔ وہ بے چارے پہلے ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے کے پاس آ کھڑے ہوئے تھے اور انہوں نے بس کا ڈنڈا مضبوطی سے پکڑ لیا تھا۔

"روک کے۔" مقصود نے اسٹاپ آنے پر آواز لگائی۔ شیر علی نے دیکھ لیا تھا کہ سوار ہونے والا مسافر کوئی نہیں ہے۔ اس نے گاڑی کو پورے طور سے نہیں روکا' بلکہ اس کی رفتار میں ذرا کمی کر دی۔

"چلو چاچا چلو۔" مقصود نے بوڑھے سے کہا۔ "جلدی کرو........... شاباش۔"

"اوئے گاڑی تو روکو۔" بڑے میاں چلائے۔ "کیا چلتی بس میں سے چھلانگ لگا

دوں۔"

"اوئے جاؤ جاؤ .... چلو۔" مقصود نے کسی وحشی کی طرح آنکھیں نکالیں۔ "
اترو۔"

بڑے میاں بے چارے کا پچھلا پیر ابھی فٹ بورڈ پر ہی تھا کہ مقصود نے "ڈبل
ہیس" کی بھیانک آواز لگاتے ہوئے دو مرتبہ بس پر زور سے ہاتھ مارا' شیر علی نے بس
بھگانا شروع کر دیا۔ بڑے میاں نے جلدی سے بس سے چھلانگ لگائی اور بس کی سمت پر
رخ کر کے کچھ دور تک بھاگتے چلے گئے۔ اس طرح وہ گرنے سے بچ گئے۔

صدر سے کچھ دور آگے جا کر شیر علی نے پنجی اٹھ ونجا کو پکڑ لیا۔

"جلدی کر اوئے مقصودے۔" اس نے مضطرب ہو کر صدا لگائی۔ "آگے پنجی اٹھ
ونجا ہے۔"

"روک کے۔" مقصود نے زور سے ایک ہاتھ بس پر مارا۔ "لیڈیز ہیں........"

برقعہ پوش خواتین کی ایک ٹولی تیزی سے بس کی طرف آ رہی تھی اور جب تک
عورتیں بس میں پہنچیں اتنی دیر میں پنجی اٹھ ونجا اسٹاپ سے روانہ ہو کر ہوا کے گھوڑے
پر سوار' اڑتی چلی گئی۔

"ڈبل ہیس۔" مقصود نے وحشیانہ انداز میں ہانک لگائی اور زور زور سے دو بار بس
باڈی پر ہاتھ مارا۔ اس سے بھی زیادہ وحشیانہ طور پر شیر علی نے بس کو بھگانا شروع کر دیا۔
پنجی اٹھ ونجا آگے نکل چکی تھی۔ جلد از جلد اس تک پہنچنا اور اس کو اوورٹیک
ضروری تھا۔ ورنہ اگلے ٹرپ کے بھی خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔

ایک رکشہ بس کی زد میں آنے سے بال بال بچا۔ شیر علی نے آگے کھڑی ہوئی
کے جانے کا انتظار کرنے کے بجائے بس کو ایک دم بہت تنگ زاویے سے اور تیزی
دائیں جانب کاٹا تھا۔ اسی وقت پیچھے سے ایک رکشہ آ رہا تھا۔ اگر رکشہ والا فوراً بریک
لگاتا تو بس کا اگلا حصہ رکشہ میں گھستا چلا جاتا اور ڈرائیور اور سواریاں سب بری طرح
ہو جاتے۔

رکشہ والے نے بڑی زور سے چلا کر دو چار گالیاں دیں لیکن شیر علی کو گالیاں
کی فرصت نہیں تھی۔ اسے تو کچھ بھی سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے دماغ پر
ایک ہی دھن سوار تھی۔ پنجی اٹھ ونجا کو اوورٹیک کر کے نکلنا ہے۔

☆=====☆=====☆

شیر علی کی عمر کوئی اٹھائیس سال کے قریب تھی اور اسے ڈرائیونگ کرتے ہوئے
چار سال ہو گئے تھے۔ وہ ضلع سیالکوٹ کے ایک نواحی گاؤں کا رہنے والا تھا جہاں اس کے
خاندان کی تھوڑی سی زمین تھی۔ وہ تین بھائی تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد ان میں آپس
میں خوب جھگڑا ہوا۔ تینوں بھائی شادی شدہ تھے۔ سارا خاندان ایک ہی گھر میں رہتا تھا۔
تینوں کے کئی کئی بچے تھے اور ان کی بیویاں آپس میں ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی تھیں۔
اپنے باپ کی طرح شیر علی اور اس کے دونوں بھائی بھی بالکل ناخواندہ تھے۔ انہوں نے
ہوش سنبھالتے ہی اپنے باپ کے ساتھ زمین اور مویشیوں کی دیکھ بھال کا کام شروع کر دیا
تھا۔

جب تک بڈھا زندہ رہا' سب کو اپنے جوتے کے زور پر قابو میں کئے رہا۔ وہ خاندان
کا سربراہ تھا' بزرگ تھا' یہ خاندان اس کی قلمرو تھا جہاں صرف اس کا حکم چلتا تھا اور کسی
کی مجال نہیں تھی جو اس کے حکم سے سرتابی کر سکے' زمین اور گھر کا وہی مالک تھا' جسے
چاہتا بے دخل کر سکتا تھا' نکال سکتا تھا۔

اس کی تینوں بہوئیں ایک سے ایک بڑھ کر کنکالا قہر تھیں۔ لڑنے میں حاتم' جب
آپس میں جھگڑا شروع ہو جاتا تو گھر میں جیسے ایک قیامت برپا ہو جاتی۔ جھگڑا عام طور سے
اس وقت ہوتا تھا جب سارے مرد گھر سے باہر کام پر گئے ہوئے ہوتے تھے۔ سب کو
معلوم تھا کہ فوری طور پر مردوں کی واپسی کا کوئی امکان نہیں' اس لئے وہ اس موقع سے
فائدہ اٹھاتے ہوئے خوب دل کی بھڑاس نکالتیں اور ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کر برا بھلا
کہتیں' ان کی بارہ بارہ ہاتھ کی لمبی زبانیں ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلنے میں ایک
دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوششوں میں مصروف رہتیں۔ ایک دوسرے کی دلآزاری
کر کے انہیں ایک خاص قسم کی مسرت محسوس ہوتی تھی۔ غربت' جہالت' پسماندگی اور
محرومی کے کثیف ماحول کی پروردہ یہ تینوں عورتیں اپنے وجود کے اندر اپنے سماج کی ساری
زہر آلود تلخیوں کو سمیٹے ہوئے تھیں۔

ان کی بڑھیا ساس انہیں روکنے کی کوشش کرتی لیکن بہوئیں بڑھیا کو تو خاطر میں
نہیں لاتی تھیں۔ وہ بکتی جھکتی رہتی' انہیں گالیاں دیتی' برا بھلا کہتی اور خاموش کرنے کی
کوشش کرتی' مگر اس کی سنتا کون تھا۔ بڑھیا بک جھک کر خود ہی خاموش ہو جاتی اور
بہوئیں بھی لڑتے لڑتے تھک جاتیں اور اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتیں۔

شام کو جب مرد گھر واپس آتے تو تینوں عورتیں اپنے اپنے شوہروں سے اپنی دیورانی

جٹھانی کے خلاف شکایتوں کے دفتر لے کر بیٹھ جاتیں اور پھر مردوں میں بھی تکرار شروع ہو جاتی۔

لیکن بڈھے کی ایک ڈانٹ پر سب چپکے ہو جاتے اور بڑبڑاتے بدبداتے' دل ہی دل میں ایک دوسرے کو لعن طعن کرتے اپنی اپنی راہ لیتے۔

زمین تھوڑی تھی' کھانے والے بہت تھے' گھر میں ہمیشہ غربت کی حکمرانی رہتی تھی۔ گھر کے سارے افراد' سوائے چھوٹے بچوں کے سارا سارا دن طرح طرح کی جان مشقت میں مصروف رہتے' لیکن اس کے باوجود اتنی بہت سی جانوں کا پیٹ بھرنا آسان نہ ہوتا۔ پھر اوپر سے بڑھتی ہوئی مہنگائی' تن کو تو سب کچھ چاہئے ہوتا ہے' روٹی بھی' کپڑا بھی' رہنے کا ٹھکانہ بھی' دوا دارو بھی اور ان کے علاوہ بھی اور بہت کچھ' پھر بھلا کہاں کی تعلیم اور کیا اسکول! افلاس کی ماری ہوئی اس فضا میں کچلی ہوئی تمناؤں اور ناآسودہ آرزوؤں کے ساتھ محرومیوں سے بھرپور زندگی گزارنا کوئی خوشگوار بات نہیں تھی اور جہاں یہ سب کچھ ہو' وہاں لوگ اگر بات بات پر ایک دوسرے کو کاٹ کھانے کو دوڑ پڑتے تھے تو اس میں کوئی تعجب نہیں تھا۔

بڈھا جب تک زندہ رہا' خاندان کے شیرازے کو سمیٹے رہا اور مشترکہ خاندان کی زندگی کی گاڑی کسی نہ کسی طرح آگے گھسٹتی رہی' لیکن اس کی آنکھ بند ہوتے ہی زور و شور کے ساتھ جوتیوں میں دال بٹنے لگی۔ شیر علی تینوں بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ منجھلے بھائی نے زمین کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ شیر علی غیر جانبدار تھا۔

بڑھیا نے منجھلے بیٹے کو سمجھایا کہ زمین اگر تقسیم ہو گئی تو یہ بات خاندانی روایات کے منافی ہو گی۔ علاوہ ازیں زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اتنا کچھ نہ دے سکیں گے جس سے پیٹ بھرا جا سکے۔

شیر علی کو اپنی ماں کی بات سے اتفاق تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر زمین تقسیم ہو گئی تو زندگی گزارنا مشکل ہو جائے گی' بڑھتی ہوئی مہنگائی نے پہلے ہی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اور تب شیر علی نے خوب سوچ سمجھ کر ایک فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ جتنی محنت وہ اپنی زمین پر کرتا ہے اور اس کے باوجود بھی اسے بہت کم حاصل ہوتا ہے' اتنی ہی محنت شہر جا کر کسی اور کام میں کرے تو اس سے زیادہ کما سکتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو جانتا تھا جو کھیت مزدور تھے' یا بہت چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالک تھے جو ہمیشہ شدید غربت کا شکار رہتے تھے اور پھر وہ محنت مزدوری کرنے شہر چلے

وہاں انہیں کام بھی مل گیا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ بہتر حالت میں تھے۔

ملک بھر میں لے دے کے ایک ہی شہر تھا جس میں روزگار کے وسیع اور فوری مواقع موجود تھے۔ کراچی .... شیر علی گھر کے آئے دن کے جھگڑوں سے بیزار ہو گیا تھا۔ یہ گھر اسے کسی جہنم کی طرح لگتا تھا جس کی دہکتی ہوئی آگ میں وہ اور دوسرے تمام لوگ رات دن جلا کرتے تھے۔ یہاں سکون کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں تھا۔ وہ اس دوزخ سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

کراچی میں اس کے گاؤں کا ایک آدمی کئی برس سے رہ رہا تھا اور اب تو اس کے سارے گھر والے بھی کراچی منتقل ہو گئے تھے۔ اس نے کراچی میں پرانا گولی مار کے علاقے میں کسی جگہ مویشیوں کا ایک چھوٹا سا باڑہ بنایا تھا اور دودھ بیچتا تھا۔ اچھا خاصہ کاروبار چل رہا تھا۔ اس باڑے کے ایک حصے میں وہ رہتا تھا۔ اس شخص کا نام دین محمد تھا۔

شیر علی نے جب اپنی بیوی سے یہ کہا کہ وہ کراچی جا کر محنت مزدوری کرنا چاہتا ہے تو اس نے ایک قیامت برپا کر دی۔ وہ ہرگز اس بات کے لئے تیار نہیں تھی کہ اس کا شوہر اپنی زمین اور مکان کو چھوڑ کر کراچی چلا جائے۔ کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ اس کے شوہر کی عدم موجودگی میں دونوں بڑے بھائی ساری "جائیداد" پر قبضہ کر کے اسے آپس میں بانٹ لیں گے اور شیر علی کو کچھ بھی نہیں مل سکے گا۔

شیر علی نے پہلے تو اسے نرمی اور پیار سے سمجھایا کہ اس کا کراچی جانا اس کے اور اس کے بچوں کے حق میں بہتر ہو گا لیکن جب مریم کسی طرح نہ مانی اور اس کی بات سننے پر تیار ہی نہیں ہوئی تو اس نے ڈنڈا اٹھایا اور اسے کسی مویشی کی طرح پیٹنے لگا۔ سارے گھر میں ایک غدر برپا ہو گیا اور وہ بات جو شیر علی ابھی اپنی بیوی مریم کے علاوہ اور کسی کو بھی نہیں بتانا چاہتا تھا' سب کو معلوم ہو گئی۔

دونوں بڑے بھائیوں کا فوری ردِعمل تو خاموشی کا تھا لیکن وہ دل ہی دل میں اس بات سے خوش بھی تھے' مگر ساتھ ہی کچھ خدشات بھی سر اٹھا رہے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ شیر علی جانے سے پہلے اپنے حصے کی زمین فروخت کرنے کی بات کرے۔ پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔

لیکن شیر علی اس زمین سے عاجز آ چکا تھا۔ جب محنت کرنا ہی ٹھہرا تو پھر ایسی جگہ محنت کیوں نہ کی جائے کہ زیادہ اور اچھے پیسے ملیں۔ زمین کا کیا ہے' پڑی رہے گی۔ کہاں بھاگی جاتی ہے! ہو سکتا ہے شہر جا کر اس کے پاس اتنے پیسے جمع ہو جائیں کہ وہ واپس آ کر

مزید زمین خرید سکے۔ پھر تو اس کا یہ چھوٹا سا قطعہ اراضی بھی کسی کام کا بن جائے گا۔

چنانچہ شیر علی اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ اس نے مریم کو بچوں کے ساتھ کچھ دنوں کے لئے اس کے میکے بھیج دیا۔ مریم نے صاف کہہ دیا تھا کہ اس کے جانے کے بعد وہ جٹھانیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی' وہ دونوں اسے چین سے نہیں رہنے دیں گی۔

شیر علی نے اپنی زندگی میں جس شہر کو سب سے زیادہ دیکھا تھا وہ سیالکوٹ تھا۔ جہاں وہ اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ لاہور اتنا دور نہیں تھا لیکن شیر علی زندگی میں صرف دو بار لاہور گیا تھا اور مریم تو ایک بار بھی نہیں گئی تھی۔ کراچی کا شیر علی نے صرف نام سنا تھا۔ وہ یہاں کبھی نہیں گیا تھا۔

جنوری 1973ء میں شیر علی نے کراچی کی سرزمین پر قدم رکھا۔ جب وہ لاہور سے چلا تھا تو وہاں کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا۔ دن بھر سرد ہوائیں چلتی رہتی تھیں اور رات کو جیسے فضا میں برف گھل جاتی تھی لیکن جب وہ دن کے بارہ بجے کے قریب کراچی کینٹ ریلوے اسٹیشن پر اترا تو اس کو پسینہ آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر جو ایک بہت پرانا گرم کوٹ تھا وہ اس کو کاٹے ڈال رہا تھا۔ اس نے کوٹ کندھے پر ڈال لیا اور اسے فرحت کا احساس ہوا۔ جسم کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لگے تو پسینہ خشک ہونے لگا۔ دھوپ میں بڑی تیزی تھی اور زیادہ دیر تک دھوپ میں چلنے یا کھڑے ہونے سے جسم جلنے لگتا تھا۔

چاچا دین محمد نے ایک بار اسے کراچی میں اپنی رہائش کا پتہ بتایا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ کینٹ اسٹیشن سے صدر تک بہت سی بسیں چلتی ہیں۔ "کسی بھی بس میں بیٹھ کر صدر آ جاؤ پھر وہاں کسی سے بھی پوچھ لو کہ پرانا گولی مار کون سی بس جائے گی۔ اس میں بیٹھ کر کنڈکٹر سے کہہ دو کہ تمہیں پرانا گولی مار کے بس اسٹاپ پر اتار دے۔ یا پاس بیٹھے کسی مسافر سے کہہ دو کہ جب پرانا گولی مار کا اسٹاپ آئے تو تمہیں بتا دے۔ وہاں جاؤ۔" اور پھر اس نے باڑے کی جگہ کی نشاندہی کی تھی۔

مگر شیر علی بے چارہ تو باہر آتے ہی بدحواس ہو گیا۔ چاروں طرف ٹریفک کی قدر ریل پیل تھی کہ اس کا دم بولایا جا رہا تھا۔ بسوں کی تو بارات کی بارات تھی۔ نہیں اس قدر بسیں کہاں سے آ گئی تھیں اور کہاں جا رہی تھیں اور تعجب کی بات تو یہ کہ ہر بس میں لوگ موجود تھے۔

بہرحال' سہ پہر تک وہ دھکے کھاتا ہوا اپنی کرخت دیہاتی پنجابی میں لوگوں سے پوچھتا' کسی نہ کسی طرح پرانا گولی مار کے علاقے میں پہنچ گیا اور وہاں جا کر

باڑا تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی۔

دین محمد اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ شیر علی نے اسے بتایا کہ وہ روزگار کی تلاش میں کراچی آیا ہے' اور چونکہ اس شہر میں اس کا اور کوئی واقف نہیں ہے' اس لئے وہ سیدھا اس کے پاس ہی چلا آیا ہے۔

"کام کی یہاں کمی نہیں ہے شیر علی۔" دین محمد نے کہا۔ "کام ہی کام ہے۔ آدمی کے ہاتھ پیر سلامت ہوں تو کام بہت ہے۔ مجھے خود اپنے باڑے کے لئے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ تم کل ہی کام سے لگ جاؤ۔" اور دین محمد نے اسے اپنے مویشیوں کے باڑے میں کام سے لگا دیا۔

لیکن شیر علی یہاں مویشیوں کا کام کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو کوئی "شہری" قسم کی محنت مزدوری کرنا چاہتا تھا۔ مویشیوں کا کام تو وہ اپنے گاؤں میں بھی رہ کر کر سکتا تھا۔ جلد ہی وہ اس کام سے بیزار ہو گیا اور اس نے دین محمد سے کہا کہ وہ اسے کوئی اور کام دلا دے۔ مگر دین محمد کو اپنے باڑے کے کام کے لئے ایک آدمی کی اشد ضرورت تھی۔ شیر علی اس کے گاؤں کا تھا۔ سیدھا سادا اور سو فیصدی قابل اعتماد دیہاتی' جسے اب تک شہر کی ہوا نہیں لگی تھی۔ وہ برابر ٹالتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ وہ تلاش میں ہے اور جلد ہی کوئی معقول بندوبست کر دے گا لیکن اس "معقول بندوبست" میں اس نے دو مہینے نکال دیئے۔ شیر علی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ چاچا دین محمد اسے اپنے باڑے میں ہی لگائے رکھنا چاہتا ہے اور اب اسے خود اپنے طور پر ہی کچھ کوشش کرنی ہو گی۔

باڑے کے قریب بڑی سڑک پر' دونوں جانب کئی گیراج تھے جہاں بہت سی گاڑیاں اور بسیں وغیرہ کھڑی رہتی تھیں اور ان کی مرمت کا کام ہوتا تھا۔ شیر علی ان میں سے ایک گیراج میں روز شام کو دودھ لے کر جاتا تھا۔ وہاں اسے طرح طرح کے لوگ نظر آتے تھے۔ میلے کچیلے' تیل اور گریز میں لتھڑے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے مکینک' ان کے شاگرد چھوٹے بڑے' نو عمر لڑکے' ڈرائیور کنڈکٹر' کلینر وغیرہ۔ وہ ان کو کام کرتے ہوئے دیکھتا' ان کی باتیں سنتا اور ان میں دلچسپی لیتا۔ انہی لوگوں میں مکینک رحمت علی بھی شامل تھا۔ جو اس گیراج کا سب سے زیادہ معمر اور ہوشیار مستری تھا' اور مالک بھی۔

ایک دن ایک بس کو' جو مرمت کے لئے لائی گئی تھی' اسٹارٹ کرنے کے لئے دھکا لگانے کی ضرورت پڑی۔ شیر علی اسی وقت دودھ لے کر وہاں آیا تھا۔ "چل بھئی جوان" رحمت علی نے اس سے کہا۔ "ذرا لگا تو دھکا گاڑی میں' شاباش۔"

اور شیر علی دھکا لگانے والوں میں شامل ہو گیا۔ بہت سے لوگ مل کر بس کو دھکا دے رہے تھے اور پھر ایک جھٹکے کے ساتھ بس اسٹارٹ ہو گئی اور تیزی سے آگے کو بڑھی۔ ناتجربہ کار شیر علی گرتے گرتے بچا اور رحمت علی مستری قہقہے لگانے لگا۔

"ابے کیسا جوان ہے تُو؟" رحمت علی نے ہنستے ہوئے اس سے کہا۔ "ابے پنجاب کا دیسی گھی کھا کر بھی بدن میں طاقت نہیں ہے؟ واہ بیٹا نام ڈبوئے گا پنجاب کا۔" شیر علی بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔

اگلے چند روز میں اس نے عمر رسیدہ مکینک سے دوستی کر لی اور اس سے کہا کہ اسے کوئی کام دلا دے۔ رحمت علی نے اسے غور سے دیکھا، مضبوط ہاتھ پیروں کا صحت مند جوان تھا۔

اور اس کے ساتھ ہی رحمت علی کو دلاور خان کا خیال آ گیا۔ دلاور خان اس علاقے کے تھانے کا ایس ایچ او تھا اور وہ رحمت علی کے علاوہ ان تمام لوگوں سے بخوبی واقف تھا جو اس کے اس علاقے میں گیراج چلا رہے تھے۔ یہ سارے گیراج تھانے والوں کی آمدنی کا ایک مستقل ذریعہ تھے۔ دلاور خان خود بھی کئی بسوں کا مالک تھا اور اس کی بسوں کا کام رحمت علی کے گیراج میں آتا تھا کیونکہ رحمت علی ایک بہت ہوشیار مکینک تھا۔ چند روز پہلے دلاور خان نے رحمت علی سے کہا تھا کہ وہ دو نئی بسیں خرید رہا ہے جن کے لئے اسے قابلِ اعتماد ڈرائیوروں کی ضرورت ہے۔

"اچھا تو ایسا کر، کل صبح سے گیراج میں آ جا۔" رحمت علی نے اس سے کہا۔ "چار پانچ بجے تک گیراج میں کام کر۔ کوئی مشکل نہیں ہے۔ جلد ہی کام سیکھ جائے گا اور پانچ بجے کے بعد پھر ڈرائیونگ کی ٹریننگ دوں گا تجھے۔ چند مہینے میں پورا پکا ڈرائیور بن جائے گا۔ بس پھر عیش ہیں تیرے۔"

شیر علی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ ڈرائیور بنے گا، گاڑی چلائے گا، اس سے پیسے کمائے گا، پھر تو وہ مریم اور بچوں کو بھی یہیں بلوا لے گا۔ سب مل کر ساتھ رہیں گے اور پھر مریم دیکھے گی کہ اُس نے کراچی آ کر کتنا اچھا کیا۔

"اور ہاں .... ابھی تو چونکہ تجھے کوئی کام آتا نہیں ہے اس لئے تھوڑے سے پیسے جیب خرچ کے لئے تجھے دے دوں گا۔ بعد میں جب کچھ کام ڈھنگ سے کرنے لگے گا تو پھر پیسے بھی بڑھ جائیں گے۔"

اگلے دن سے شیر علی نے رحمت علی کے گیراج میں کام شروع کر دیا۔

بھی دین محمد کے بارے میں تھا اور اگلے چند ماہ کے اندر اندر اس نے بس چلانا سیکھ لی۔ اس کے علاوہ وہ تھوڑا بہت مکینک کا کام بھی سیکھ گیا تھا۔

تھوڑے ہی عرصے میں وہ بسوں کے پیشہ ور ڈرائیوروں کے طور طریقوں سے پورے طور پر واقف ہو گیا۔ اس کا لائسنس بھی بن کر آ گیا اور اب اس نے آزادانہ طور پر بس چلانے کا کام شروع کر دیا۔

جو آدمی پولیس آفیسر دلاور خان کی تمام بسوں کی مینیجر کے طور پر نگرانی کرتا تھا، اس کا نام سلیم تھا اور وہ دلاور خان کا کوئی قریبی عزیز تھا۔ سلیم نے شیر علی کو ساری باتیں پہلے ہی بتا دی تھیں۔

"روز رات کو کیش کا حساب ہو گا۔" اس نے کہا۔ "یہ مت سمجھ لینا کہ بس تنخواہ مل رہی ہے تو کام چل رہا ہے۔ نہیں، تمہارے اور تمہارے ساتھ چلنے والے کنڈکٹر کے لئے ضروری ہے کہ زیادہ سے زیادہ پسنجر اٹھاؤ، تاکہ زیادہ سے زیادہ کیش لا سکو۔ جتنا زیادہ کیش لاؤ گے اس میں سے تمہیں بھی زیادہ کیش ملے گا۔ زیادہ کیش، زیادہ کیش۔ کم کیش، کم کیش اور گاڑی کو نقصان سے بچاؤ اور اگر کبھی چالان ہو جائے تو پرواہ مت کرو۔ سیدھے ادھر آ کر دفتر میں مجھے اطلاع دو۔ چالان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ کیش زیادہ سے زیادہ آنا چاہئے۔ چھوٹے موٹے ایکسیڈنٹ کی فکر مت کرو۔ بس یہ ہے کہ کوئی بندہ نہ مار دینا اور اگر اتفاق سے ایسا ہو بھی جائے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اور اس طرح کراچی میں شیر علی کی پیشہ ورانہ زندگی کا بھرپور آغاز ہو گیا۔

شیر علی نے صرف بس چلانا سیکھا تھا۔ یعنی یہ کہ گاڑی کو کس طرح حرکت میں لایا جائے اور اسے چلایا جائے۔ اسے ٹریفک کے چند موٹے موٹے قواعد کے علاوہ جن سے ڈرائیوروں کے علاوہ عام لوگ بھی واقف ہوتے ہیں۔ باقی قواعد و ضوابط کا کچھ علم نہیں تھا۔ وہ مکمل طور پر ناخواندہ تھا اور کوئی سائن بورڈ کوئی تحریر نہیں پڑھ سکتا تھا۔

وہ جس پس ماندہ دیہی ماحول سے نکل کر آیا تھا۔ وہاں زندگی کی ناقدری اور قانون سے بے شعوری معاشرتی ڈھانچے کا ایک جزو تھی۔ صدیوں کے معاشی اور جاگیردارانہ استحصال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی جہالت، کم فہمی اور تنگ نظری ایک خاص قسم کی نفسیاتی بے رحمی اور درشتی میں ظاہر ہوتی تھی۔ نسلوں پرانی دشمنی کی بنا پر ہونے والی بے مقصد اور بے معنی ہلاکتیں، عورتوں کے قتل اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہونے والے مسلسل

جھگڑے ان فضاؤں کا ایک حصہ تھے جن میں شیر علی نے پرورش پائی تھی۔ وہ شہر آیا تو اپنے ساتھ ایک مخصوص مزاجی کیفیت کو بھی لے کر آیا تھا جو اس کی شخصیت کا حصہ تھی۔ اگر شہر آنے کے بعد وہ کسی اور پیشے سے وابستہ ہو گیا ہوتا تو اس کے اندر شاید کچھ مثبت تبدیلیاں پیدا ہوتیں اور ہنرمند شہری محنت اس کی شخصیت میں ایک نکھار پیدا کر دیتی۔ بدقسمتی سے وہ ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہو گیا اور ایسے لوگوں میں گھر گیا جو اسے رات دن قانون شکنی پر اکسایا جاتا تھا اور تشدد آمیز رویوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس کی شخصیت اور زیادہ مسخ ہو گئی۔

اب وہ کراچی کی سڑکوں پر اندھا دھند بس دوڑاتا پھرتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیش، زیادہ سے زیادہ کیش اور اس کے حصول کے لئے غلط سلط، بے قاعدہ اندھا دھند ڈرائیونگ، بے لگام تیز رفتاری اور خطرناک اوورٹیکنگ کے بغیر کام نہیں چل سکتا تھا۔

کراچی میں پرائیویٹ ٹرانسپورٹ کا یہی انداز تھا، اس پوری مشینری کا یہی ڈھانچہ اور شیر علی اس مشینری کا ایک چھوٹا سا پرزہ تھا۔ اگر اسے ایک پیشہ ور ڈرائیور کی حیثیت سے کام کرنا تھا، تو اس کے لئے وہی کچھ کرنا ضروری تھا جو دوسرے کر رہے تھے۔ اس کے بغیر وہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سفاکانہ مقابلے کا میدان تھا۔ نرمی برتنے والوں اور پیچھے جانے والوں کی یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔

شیر علی کو بس چلاتے ہوئے چار سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس عرصے کے دوران ایس ایچ او دلاور خاں ڈی ایس پی بن چکا تھا اور اب تو نصف درجن بسوں کے علاوہ اس کی کئی پرائیویٹ ٹیکسیاں بھی چل رہی تھیں۔ شیر علی بس ہی چلاتا تھا۔

ان چار برسوں کے دوران اس نے بیسیوں ایکسیڈنٹ کئے۔ کتنی ہی کاروں، رکشوں، ٹیکسیوں اور دوسری گاڑیوں کو مارا، کتنے ہی لوگوں کو زخمی کیا لیکن اس کا لائسنس ہمیشہ ویسا ہی بے داغ رہا اور وہ کبھی چند گھنٹوں کے لئے بھی حوالات میں بند نہیں ہوا۔ ہر بار اس کا چالان ہوا لیکن کبھی ایک بار بھی اسے جرمانہ نہیں بھرنا پڑا۔ چنانچہ وہ ہر خوف، تعزیر سے بے نیاز ہو کر گاڑی دوڑاتا تھا۔ کسی قاعدے قانون، ضابطے، طریقے پابندی کی ضرورت نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ کیش ...... زیادہ سے زیادہ کیش اس کے لئے سب کچھ جائز تھا۔ اس کے سرپرستوں کے ہاتھ بہت لمبے اور مضبوط تھے۔

☆======☆======☆

تین چار اسٹاپوں کے بعد شیر علی نے پنجی اٹھ ونجا کا پیچھا لیا اور نہایت تیز رفتاری

ساتھ بہت سی گاڑیوں کو رانگ سائڈ سے اوورٹیک کرتے ہوئے اس سے آگے نکل گیا اور اسٹاپ سے خاصی دور جا کر بس کی رفتار کو ذرا کم کیا۔ اسٹاپ پر اترنے والے مسافر شور مچانے لگے۔ "گاڑی روکو" کی غصے بھری آوازیں بس میں گونجنے لگیں لیکن مقصود اور شیر علی کے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ لوگ تو ان چیزوں کے عادی تھے۔ کتنی ہی مرتبہ وہ پنجروں کی ٹھکائی بھی کر چکے تھے۔

"چلو جلدی کرو ...... شاباش۔" مقصود نے اترنے والے مسافروں کو جلدی جلدی ہاتھوں سے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ اس اثنا میں بس آہستہ آہستہ رینگ رہی تھی۔ آخری مسافر کا ایک پیر ابھی فٹ بورڈ پر ہی تھا کہ مقصود نے "ڈبل ہے" کا وحشیانہ نعرہ لگا کر دو دفعہ زور سے بس پر ہاتھ مارا اور شیر علی نے فوراً گاڑی دوڑا دی۔

آخری مسافر نے تیزی سے چھلانگ ماری اور کچھ دور تک بس کے ساتھ بھاگتا چلا گیا۔ کراچی کے لاکھوں شہریوں کی طرح وہ بھی اس فن سے واقف تھا کہ چلتی ہوئی بس سے کس طرح چھلانگ لگائی جائے کہ آدمی سڑک پر گرنے سے محفوظ رہے۔

بس ایک بار پھر برق رفتاری سے دوڑنے لگی اور مقصود بار بار بس پر ڈبل ہاتھ مار رہا تھا اور "ڈبل ...... ڈبل۔" کا نعرہ لگا رہا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ پنجی اٹھ ونجا زیادہ دور نہیں ہے۔

پرانی نمائش تک پنجی اٹھ ونجا شیر علی اور مقصود کی بس سے پیچھے رہی لیکن نمائش کا اسٹاپ گزرتے ہی وہ ایک زناٹے کے ساتھ آگے نکل گئی۔ اس وقت شیر علی کی بس میں کئی مسافر سوار ہو رہے تھے اور ایک مسافر تو ابھی بس کی طرف بھاگ ہی رہا تھا کہ مقصود نے "ڈبل ہے" کا سگنل دیا اور مسافر کے آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ پنجی اٹھ ونجا آگے نکل گئی تھی اور ایک مسافر کی خاطر ٹرپ کو خراب نہیں کیا جا سکتا تھا۔

گرومندر کے اسٹاپ پر اس وقت پہلے سے بہت سی بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔ شیر علی نے گاڑی کا رخ اسٹاپ کی طرف نہیں کیا بلکہ اسٹاپ کے قریب قریب تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا آگے کی طرف گیا۔ وہ سب سے آگے جا کر گاڑی کو روکنا چاہتا تھا تاکہ اترنے والے مسافر اتر سکیں۔ مصیبت یہ تھی کہ یہاں کچھ لیڈیز کو بھی اترنا تھا اور اس لئے بس کو پورے طور پر روکنا ضروری تھا۔ شیر علی نے آگے جانے کے بعد اچانک بڑی تیزی کے ساتھ اسٹیئرنگ کو بائیں جانب کاٹ دیا۔

اس نے اس شخص کا بالکل خیال نہیں کیا جو سڑک کے بائیں جانب تھوڑا سا آگے

کی جانب کھڑا ہوا تھا۔

اور وہ شخص اس گزرتی ہوئی بس کو دیکھ کر یہ اندازہ بالکل نہیں کر سکا کہ
ڈرائیور بس کو ایک دم بائیں جانب کاٹ دے گا۔ وہ تو یہ سمجھا تھا کہ بس' اسٹاپ سے
آگے آکر' سڑک پر سیدھی آگے کی جانب جا رہی ہے۔

شیر علی نے بہت تیزی کے ساتھ اسٹیئرنگ کاٹا تھا۔ وہ شخص ایک دم گھبرا کر پیچھے
طرف ہٹا لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ اس کا جسم
کے بائیں حصے سے ٹکرا کر فضا میں بری طرح اچھلا اور پھر بس سے کافی فاصلے پر جا گرا
اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ بھی نکل تھی۔

شیر علی نے رکنے کے بجائے' اتنی ہی تیزی سے بس کے اسٹیئرنگ کو دائیں
کاٹ کر موقعہ واردات سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ادھر ایک دوسری بس
تھی جس پر شیر علی نے اپنی گھبراہٹ میں توجہ نہیں دی تھی۔ شیر علی کی بس کا دایاں
دوسری بس کے' جو کم رفتار کے ساتھ ادھر سے گزر رہی تھی' بائیں حصے کے ساتھ
اور ایک بہت زور کا دھماکہ ہوا۔ شیر علی کی بس کا انجن جھٹکے سے بند ہو گیا اور اس
ساتھ ہی وہ اپنے ڈرائیور والے حصے میں قید ہو گیا' کیونکہ دوسری بس نے اس کے
نکلنے کا راستہ بند کر دیا تھا۔ سیٹ سے اٹھ کر لیڈیز والے دروازے سے نکل کر باہر
جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اس طرف کوئی دو درجن بھر عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ جن
سے کئی تو فٹ بورڈ پر بھی کھڑی ہوئی تھیں۔

آن کی آن میں سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ گرومندر جیسا علاقہ جہاں ہر وقت
اور انسانوں کا ہجوم رہتا تھا۔ عورتیں چیخیں مارتی ہوئی جلدی جلدی بس سے اتر کر
اُدھر بھاگ رہی تھیں۔ لوگوں نے بس کو گھیرے میں لے لیا تھا اور بہت سے لوگ
شخص کے گرد جمع ہو گئے تھے جو خون میں لت پت سڑک پر پڑا ہوا تھا۔

ٹریفک رک گیا تھا اور بسوں کی ایک لمبی قطار اسٹاپ پر جمع ہو گئی تھی۔
گاڑیاں بھی رک گئی تھیں۔ شیر علی چند منٹ کے بعد جب لیڈیز والے دروازے سے
نکلا تو اس وقت اسے لوگوں نے پکڑ لیا۔

"بھاگنے نہ دینا سالے کو............ سؤر کے بچے نے آدمی کو مار دیا۔" کسی نے
پیس کر شیر علی کے منہ پر ایک طمانچہ رسید کر دیا۔

"اسٹاپ پر کھڑے ہوئے آدمی کو مارا ہے اس نے۔ اندھے کی اولاد سالا"

دوسرے آدمی نے شیر علی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور اس کی قمیض پھٹتی چلی گئی۔

"کنڈکٹر کہاں گیا؟ کنڈکٹر کہاں گیا؟ اسے بھی تو پکڑو۔" کسی نے آواز لگائی۔

لیکن مقصود تو کب کا وہاں سے فرار ہو گیا تھا۔ جیسے ہی اس نے اس اسٹاپ کے
آگے کھڑے ہوئے اس آدمی کو ہوا میں اچھلتے ہوئے دیکھا' ویسے ہی وہ بس میں سے تیزی
سے اتر کر ایک طرف کو بھاگ کھڑا ہوا۔ اس وقت تک تو لوگ سمجھ میں نہیں پائے تھے
کہ کیا ہوا ہے۔ بس کے اندر سیٹوں پر بیٹھے اور پیچھے کی طرف کھڑے ہوئے بہت سے
لوگوں کو تو یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ بس نے کسی آدمی کو ٹکر مار دی ہے اور مقصود وہاں
سے نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

اس سے پہلے بھی شیر علی نے کئی بار راہ گیروں کو زخمی کیا تھا لیکن معمولی طور پر۔
اکثر ایسا ہوا تھا کہ بس میں سوار ہوتے یا اترتے وقت' بس کو پوری طرح سے نہ روکنے کے
باعث مسافر گر پڑتے تھے اور زخمی ہو جاتے تھے۔ شیر علی ایسے مسافروں کے لئے بس نہیں
روکتا تھا۔ وہ اور زیادہ تیزی سے بس کو بھگاتا ہوا وہاں سے نکل جاتا تھا۔ بس میں بیٹھے
ہوئے مسافروں سے نمٹنے کے لئے اس کا کنڈکٹر ہی کافی ہوتا تھا۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کر کے
آستینیں چڑھا کے لڑنے کے لئے تیار ہو کر احتجاج کرنے والوں کو خاموش کر دیتا تھا اور پھر
شیر علی کو ان مسافروں کے بارے میں کبھی کچھ نہ معلوم ہو پاتا کہ ان کا بعد میں کیا حشر
ہوا۔ وہ تو اگلے اسٹاپ تک پہنچتے پہنچتے ہی ان کے بارے میں بھول جاتا تھا۔

لیکن آج پہلی بار وہ پھنس گیا تھا اور چار سال کے عرصے میں یہ اپنی نوعیت کا سب
سے زیادہ سنگین حادثہ تھا جس کا وہ مرتکب ہوا تھا۔ اس نے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوئے
ایک آدمی کو ٹکر مار دی تھی۔

شیر علی سخت گھبرایا ہوا تھا اور وہ اس شخص کے بارے میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ زندہ
ہے یا مر گیا لیکن وہ وہاں تک پہنچ ہی نہیں سکا' کیونکہ مشتعل لوگوں نے اسے اپنے گھیرے
میں لے رکھا تھا۔ وہ اسے مار رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ ہر شخص اس سے
نفرت کا اظہار کر رہا تھا۔

ذرا دیر میں پولیس والے جائے حادثہ پر پہنچ گئے اور انہوں نے شیر علی کو مشتعل
ہجوم کے چنگل سے چھڑایا۔ بھیڑ چھٹی اور شیر علی نے پہلی بار اس جگہ کو دیکھا جہاں وہ
شخص اچھل کر گرا تھا۔ ہر طرف خون ہی خون پھیلا ہوا تھا۔ شیر علی کو جھرجھری آ گئی۔ وہ
شخص یقیناً مر گیا ہو گا۔

لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ شدید طور پر زخمی ہو جانے کے باوجود وہ زندہ تھا۔ پولیس والوں نے اسے اٹھا کر سول ہسپتال پہنچا دیا اور شیر علی کو مع بس کے تھانے لے گئے۔

تھانے پہنچ کر شیر علی نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ ہجوم تو شاید مار مار کر اس کی ہڈی پسلی توڑ دیتا لیکن اب وہ محفوظ جگہ پر تھا۔ یہاں تو سب اپنے ہی لوگ تھے۔

ایک ایس آئی نے جس کا نام مشتاق احمد تھا' تفتیش شروع کرنے سے پہلے اس سے لائسنس اور گاڑی کے کاغذات طلب کئے۔ شیر علی نے ساری چیزیں فوراً اس کے حوالے کر دیں۔

"ڈی ایس پی دلاور خاں کی گاڑی ہے صاحب!" شیر علی نے ایس آئی سے آہستہ سے کہا۔ "وہی مالک ہیں اس کے' میں چار سال سے ان کے پاس ہی کام کر رہا ہوں۔"

"کیا؟" مشتاق احمد نے چونک کر کہا۔ "ڈی ایس پی دلاور خاں کی گاڑی ہے؟"

"جی صاحب!" شیر علی نے قدرے فخریہ انداز میں جواب دیا۔ "انہی کی گاڑی ہے۔ آپ ذرا تکلیف کر کے انہیں فون پر بتا دیں .... راہ گیر زبردستی بس سے ٹکرا گیا۔ میں نے تو اسے بچانے کی بہت کوشش کی صاحب مگر وہ تو بالکل اندھوں کی طرح چل رہا تھا۔ اس نے بس کو دیکھا ہی نہیں.........."

"ٹھیک ہے۔" مشتاق احمد نے کہا۔ "میں ابھی ان کو فون کرتا ہوں........."

لیکن اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

مقصود جب وہاں سے بھاگا تھا تو وہ کچھ دور جا کر ایک رکشہ میں بیٹھ کر سلیم کے پاس پہنچا۔

اس نے دور سے دیکھ لیا تھا کہ بس رک گئی ہے اور لوگوں نے بس کو گھیر لیا ہے۔ اس آدمی کے بارے میں اسے یقین تھا کہ وہ مر گیا ہو گا۔ بڑے زوروں کی ٹکر ہوئی تھی۔ بس نے سامنے سے اسے مارا تھا۔

"تمہارا خیال ہے کہ وہ آدمی مر گیا ہو گا؟" سلیم نے فون کا ریسیور اٹھاتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"ہاں۔" مقصود نے جواب دیا۔ "بچنا مشکل ہے۔ شیر علی کو بھاگنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اس نے کوشش تو کی تھی۔"

سلیم نے ڈی ایس پی دلاور خان کو اطلاع دے دی اور دلاور خان اس یقین کے ساتھ متعلقہ تھانے پہنچ گیا کہ شیر علی کو اب تک وہاں پہنچا دیا گیا ہو گا۔

ایس آئی کو ڈی ایس پی کے آنے کی اطلاع ملی اور وہ فوراً اٹین شن ہو گیا۔ دلاور خان جب اس کے کمرے میں داخل ہوا تو ایس آئی نے کھڑے ہو کر اسے سیلوٹ کیا اور اپنی کرسی اس کو پیش کر دی۔

کمرے کے ایک کونے میں شیر علی کھڑا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر اب طمانیت کے آثار تھے۔ ڈپٹی صاحب آ گئے تھے۔ اب اس کو کسی بات کا ڈر نہیں تھا۔ وہ آدمی مرتا ہے تو مر جائے۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔

دلاور خان نے شیر علی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا اور شیر علی اسے جلدی جلدی بتانے لگا۔

"وہ خود ہی گاڑی سے ٹکرا گیا تھا جی۔ میں تو گاڑی کو اسٹاپ کی طرف کاٹ رہا تھا۔"

"مضروب کے بارے میں کیا رپورٹ ہے؟" دلاور خان نے شیر علی کی تمام باتوں کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے ایس آئی سے سوال کیا۔

"اسے ہسپتال پہنچا دیا گیا ہے جناب!" ایس آئی نے کہا۔ "ابھی مرا تو نہیں ہے لیکن شدید زخمی ہے' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔"

"ایف آئی آر کہاں ہے؟" دلاور خان نے پوچھا اور ایس آئی نے اسے ایف آئی آر دکھا دی۔

"معاملے کو سنبھالو یار!" دلاور خان نے دوستانہ انداز میں ایس آئی سے کہا۔ "یہ غریب آدمی خواہ مخواہ میں مارا جائے گا۔ بال بچے دار آدمی ہے جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ غلطی اس راہ گیر کی بھی ہو گی۔"

"بیشک بیشک سر!" ایس آئی نے تابعداری کے ساتھ کہا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں' سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ ابھی تو معاملہ اپنے ہاتھ میں ہی ہے۔"

اور پھر سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ ایف آئی آر تبدیل کر دی گئی۔ سارے گواہوں کے نام تبدیل کر دیئے گئے۔ حادثے کی نوعیت ایسی ظاہر کی گئی کہ سارا قصور پیدل چلنے والے کا تھا۔ وہ خود ہی چلتی ہوئی بس سے آ کر ٹکرا گیا تھا۔

"اگر اس آدمی کے مرجانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں سارے معاملے کو خود رفع دفع کر دیتا۔" ایس آئی نے کہا۔ "مگر اسے شدید زخمی حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا ہے۔ وہ مر بھی سکتا ہے' اس لئے اب کچھ نہ کچھ کارروائی تو کرنی ہی ہو گی۔ آخر کاغذوں کا پیٹ بھی تو بھرنا ہے۔"

"ضرور بھرو۔" ڈی ایس پی دلاور نے مسکرا کر کہا۔ "مگر اس کے پیٹ کو بچا کر" اس نے کونے میں کھڑے ہوئے شیر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا۔

مقدمہ تو بہرحال درج ہو گیا تھا۔ اگلے روز شیر علی کی ضمانت ہو گئی اور اب تو مسئلہ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ آدمی مر بھی جاتا تو گواہوں کی مدد سے یہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ حادثہ اس کی اپنی غلطی کی وجہ سے ہوا۔

شیر علی دو دن تک اپنے گھر میں بیٹھا رہا اور تیسرے دن سے اسے ایک دوسرے روٹ کی بس پر کام سے لگا دیا گیا۔ یہ بس صدر سے لانڈھی جاتی تھی۔

ایک بار پھر وہ سڑکوں پر وحشیانہ انداز سے بس دوڑا رہا تھا۔ اندھا دھند تیز رفتار غلط سلط اور بے قاعدہ ڈرائیونگ' خطرناک اوورٹیکنگ' سب کچھ وہی تھا۔

اور اس آدمی کے بارے میں تو اب وہ سوچ بھی نہیں رہا تھا جس کو اس نے دن پہلے ٹکر ماری تھی۔ اس کے بارے میں سوچنا اس کا کام نہیں تھا۔ اسے تو صرف ایک بات کے بارے میں سوچنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیش۔ زیادہ سے زیادہ کیش .... کیش .... کیش .... کیش۔ اس کی گاڑی کا پہیہ تو صرف اسی محور کے گرد گھومتا تھا۔

☆======☆======☆

1950ء میں زاہد علی کو کراچی پورٹ ٹرسٹ کے ٹریفک ڈیپارٹمنٹ میں اچھی خاصی نوکری مل گئی اور وہ اپنے جملہ افراد خانہ کے ساتھ لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا۔

لاہور میں سوائے ایک پرانے آبائی مکان کے زاہد علی کی اور کوئی جائیداد وغیرہ تھی۔ اس کا تعلق زمیندار طبقے سے نہیں تھا۔ اس نے اس پرانے آبائی مکان کو فروخت کر دیا اور کراچی میں پی آئی بی کالونی میں ایک کوارٹر خرید لیا۔

زاہد علی کی تین اولادیں تھیں۔ سب سے بڑی بیٹی سائرہ تھی جس کی عمر اٹھارہ برس کی تھی۔ اس سے چھوٹے دو بیٹے .... اشرف اور مشرف تھے جو سولہ اور چودہ سال عمر کے تھے۔ زاہد علی کی بیوی کا نام سلمیٰ تھا۔

زاہد علی اپنے خاندان کے ساتھ کراچی آیا تو پھر یہیں کا ہو رہا۔ پھر تو برسوں لاہور جانا ہی نہیں ہوتا تھا اور بچوں کے لئے تو اب کراچی ہی سب کچھ تھا۔ وہ کبھی برسوں بعد لاہور جاتے تو چند ہی روز میں ان کا دل گھبرانے لگتا اور وہ واپس جانے کے لئے بے چین ہو جاتے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زاہد علی کے خاندان میں تبدیلیاں نمودار ہو گئی تھیں۔ سائرہ کی شادی ہو گئی تھی اور وہ اپنی سسرال چلی گئی۔ سائرہ کے شوہر کا نام رئیس احمد تھا اور ایک بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی میں ایک اچھے عہدے پر فائز تھا۔ اشرف اور مسرت کی تعلیم ختم ہو گئی اور ان دونوں نے نوکریاں کر لیں۔ اشرف ایک بینک میں کلرک بھرتی ہوا تھا اور رفتہ رفتہ مینجر کے عہدے پر پہنچ گیا۔ مشرف ایک دواؤں کی کمپنی میں سیلز ری پریزینٹیٹو بن گیا۔ ان دونوں کی شادیاں ہو چکی تھیں اور وہ بال بچوں والے لوگ تھے۔ اشرف کی بیوی کا نام رقیہ اور مشرف کی بیوی کا نام سعدیہ تھا۔ دونوں پڑھی لکھی عورتیں تھیں اور مشرف کی بیوی سعدیہ تو ایک اسکول میں ٹیچر تھی۔

زاہد علی ریٹائرڈ ہو چکا تھا اور وہ اور اس کی بیوی سلمیٰ اپنے بڑے بیٹے اشرف کے ساتھ رہتے تھے۔

پی آئی بی کالونی والا کوارٹر کب کا فروخت ہو چکا تھا اور اب سب لوگ الگ الگ رہتے تھے۔ سائرہ اپنی سسرال میں تھی' اشرف اور اس کی بیوی رقیہ ناظم آباد میں رہتے تھے اور اشرف کے والدین بھی اسی کے ساتھ تھے۔ مشرف اور اس کی بیوی سعدیہ فیڈرل بی ایریا میں رہتے تھے۔

سائرہ کے دو بچے تھے' اشرف کے بھی دو بچے تھے' البتہ مشرف کا صرف ایک ہی بیٹا تھا' مظفر۔

1978ء کا سال تھا اور دسمبر کی بائیس تاریخ۔ آج اشرف اور رقیہ کے دونوں بچوں کی سالگرہ کی تقریب تھی اور صبح ہی سے گھر میں زور و شور سے تیاریاں جاری تھیں بلکہ تیاریاں تو کئی دن سے جاری تھیں۔ بہت سے مہمانوں کو آنا تھا۔ رات کا کھانا بھی تھا۔ کھانے کے سارے بندوبست کی ذمہ داری ہر سال کی طرح اس سال بھی' زاہد علی نے لی تھی۔ اسی نے ہوٹل جا کر آرڈر دیا تھا اور دوسرے انتظامات کئے تھے۔

شام کے بعد سے مہمانوں کی آمد شروع ہو گئی۔ سب سے پہلے سائرہ اور رئیس احمد اپنے دونوں بچوں کے ساتھ وہاں پہنچے اس کے بعد کچھ اور مہمان آئے جن میں اشرف کی بیوی رقیہ کے کچھ رشتہ دار شامل تھے۔

آٹھ بجے تک سارے مہمان آ چکے تھے۔ البتہ مشرف اور سعدیہ ابھی نہیں آئے تھے۔ کھانا بھی آ چکا تھا۔ میزیں سجا دی گئی تھیں۔ سالگرہ کا بڑا سا خوبصورت کیک' جو زاہد علی چورنگی کی ایک بڑی بیکری سے بنوا کر لایا تھا' میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کے برابر چھری

رکھی تھی۔ کیک کے گرد بہت سی موم بتیاں لگا دی گئی تھیں لیکن انہیں ابھی روشن نہیں کیا گیا تھا۔

ساڑھے آٹھ بج گئے لیکن مشرف اور سعدیہ نہیں آئے۔

"ذرا مشرف کے گھر فون تو کرو۔" اشرف نے بگڑ کر اپنی بیوی رقعہ سے کہا۔ "کمال کر دیا ان لوگوں نے۔ کیا آدھی رات کو گھر سے نکلیں گے؟"

رقیہ نے مشرف کے گھر فون کیا اور سعدیہ سے اس کی بات ہوئی۔

"بھابی میں خود بہت پریشان ہوں۔" سعدیہ نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "مشرف پانچ بجے گھر واپس آنے کا کہہ کر گئے تھے اور اب ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں اور وہ اب تک نہیں آئے۔ میں اور مظفر تو چھ بجے سے تیار بیٹھے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہاں چلے گئے۔ اگر کہیں کسی کام میں پھنس گئے تھے تو فون کر دیا ہوتا۔ وہ ہمیشہ یہی کرتے ہیں لیکن آج تو ابھی تک ان کا فون بھی نہیں آیا۔"

"اچھا!" رقیہ نے تعجب سے کہا۔ "ویسے انہیں .... میرا مطلب ہے یاد تو تھا نا؟"

"ارے! یہ بھی بھلا کوئی بھولنے والی بات ہے۔" سعدیہ نے کہا۔ "بلکہ انہوں نے تو آپ کے گھر کی تقریب کے لئے اپنے کپڑے بھی صبح ہی سے نکلوا کر مجھے دے دیئے تھے اور مجھ سے کہا تھا کہ استری کر دینا .... اچھا آپ ایسا کیجئے، آپ مہمانوں کو انتظار مت کرائیے۔ آپ تقریب شروع کروا دیجئے۔ جیسے ہی مشرف آئیں گے، ہم لوگ آپ کے گھر آ جائیں گے۔"

چنانچہ تقریب شروع کر دی گئی۔ کیک کاٹا گیا۔ "ہیپی برتھ ڈے ٹو یو" کا غل مچا اور اس کے بعد کھانا شروع ہو گیا لیکن مشرف علی کے والدین، اس کے بھائی بہن، اس کی اور اس کی بیوی اور بچے کی کمی کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہے تھے۔ ایسا آج تک نہیں ہوا تھا کہ کسی خاندانی تقریب میں مشرف اور سعدیہ شریک نہ ہوئے ہوں۔ یہ پہلا موقع تھا اور اسی لئے وہ لوگ خاصے پریشان تھے۔ آخر ایسی کون سی بات ہو گئی تھی کہ مشرف اب تک آئے ہی نہیں۔

مہمانوں سے فرصت پاتے ہی کوئی ساڑھے نو بجے کے قریب اشرف نے دوبارہ مشرف کے گھر فون کیا اور اس نے فون پر سعدیہ کی گلوگیر آواز سنی۔ "وہ ابھی تک نہیں آئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، میں کیا کروں اور کس سے معلوم کروں۔ میں

نے ان کے دفتر بھی فون کیا تھا۔ وہاں کے چوکیدار سے میری بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو دو بجے کے قریب ہی دفتر سے نکل گئے تھے۔ میں نے ان کے چند دوستوں کے ہاں بھی فون کئے، کسی کو کچھ نہیں معلوم۔"

"اچھا، تم گھبراؤ مت۔" اشرف نے جلدی سے کہا۔ "ہم لوگ ابھی آ رہے ہیں۔"

سب لوگ ٹیلی فون کے پاس کھڑے ہوئے اشرف کی بات سن رہے تھے۔ زاہد علی اور سلمٰی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سائرہ بالکل خاموش تھی۔

سائرہ اور رئیس اپنی گاڑی میں اور اشرف اور رقیہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فوراً مشرف کے گھر روانہ ہو گئے۔ بچوں کو انہوں نے گھر پر ہی چھوڑ دیا۔

جب دونوں گاڑیاں فیڈرل بی ایریا میں مشرف علی کے مکان کے گیٹ کے سامنے پہنچ کر رکیں تو سامنے ہی گیٹ کے پیچھے مشرف کی کار کھڑی دکھائی دے گئی۔

"لیجئے، تشریف لے آئے موصوف۔" اشرف نے گاڑی سے اترتے ہوئے سائرہ کی طرف دیکھ کر کہا جو اپنی گاڑی سے اتر چکی تھی اور اس کے چہرے پر ایک طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

سعدیہ گاڑیوں کی آوازیں سنتے ہی گیٹ کے پاس آ گئی تھی۔ مظفر بھی اس کے ساتھ تھا اور آنے والوں نے جب سعدیہ کا چہرہ دیکھا تو انہیں دھچکا لگا۔ سعدیہ کے چہرے پر تو تشویش اور پریشانی کی تحریریں تھیں اور اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟" اشرف نے جلدی سے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "آ گئے مشرف؟"

"نہیں۔" سعدیہ نے رقت بھری آواز میں جواب دیا۔ "نہیں آئے۔"

"مگر گاڑی تو کھڑی ہوئی ہے؟" سائرہ نے تعجب سے کہا۔

"گاڑی کل خراب ہو گئی تھی۔" سعدیہ نے کہا۔ "اس میں کچھ لمبا کام ہے۔ گیئر بکس کھلے گا۔ دو دن لگیں گے، ہم لوگ تو رکشہ ٹیکسی سے آتے۔ وہ خود بھی صبح گاڑی کے بغیر ہی گئے تھے۔ آپ لوگ اندر تو آئیے۔"

☆======☆======☆

مشرف کے گھر کچھ دیر رکنے اور سعدیہ سے مشرف کے پروگراموں اور معمولات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کرنے کے بعد رئیس احمد اور اشرف رئیس احمد کی گاڑی میں بیٹھ کر نکل کھڑے ہوئے۔ دونوں عورتوں کو انہوں نے سعدیہ کے پاس چھوڑ دیا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے انہوں نے مشرف علی کو شدید زخمی حالت میں بڑا ہسپتال کے شعبہ حادثات میں تلاش کر لیا۔ مشرف کی حالت دیکھ کر اشرف کی آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ بے ہوش تھا اور اس کا چہرہ اور سر پٹیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پٹیاں اس وقت بھی خون میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

اشرف علی اور رئیس احمد کو معلوم ہوا کہ پولیس والے مشرف علی کو شدید زخمی حالت میں ہسپتال لے کر آئے تھے اور تب سے اب تک وہ بے ہوش تھا۔ اسے گرو مندر کے اسٹاپ پر کسی بس نے ٹکر مار دی تھی۔ چوٹیں شدید تھیں اور سر کی چوٹ بہت زیادہ خطرناک تھی۔ مریض کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔

"تو .... تو اب کیا کرنا ہے؟" اشرف نے سخت پریشانی کے ساتھ کہا۔ وہ زندگی میں کبھی ایسی صورت حال سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ سول ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اس نے آج پہلی بار قدم رکھا تھا۔

"کل ان کا آپریشن کیا جائے گا۔" ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر نے بتایا۔ "فی الحال ضروری ڈریسنگ وغیرہ کر دی گئی ہے اور دوائیں دے دی گئی ہیں۔ کل مریض کو یہاں سے جناح ہسپتال شفٹ کر دیا جائے گا اور وہیں آپریشن ہو گا۔ یہاں کوئی نیورو سرجن نہیں ہے۔"

"لیکن اتنے سیریس کیس میں تو فوری آپریشن کی ضرورت تھی۔" رئیس احمد نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "سر کی چوٹ ہے، دیکھئے نا، آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ ہم سے زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔"

"اب یہ آپریشن مجھے تو نہیں کرنا تھا۔" ڈاکٹر نے تلخی کے ساتھ جواب دیا۔ "میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں آج ہی کر دیتا۔ آپریشن تو نیورو سرجن کو کرنا ہے انہوں نے کل صبح کا وقت دیا ہے۔ آپریشن کے لئے۔"

"لیکن مریض کی حالت کے پیش نظر........"

"پلیز!" ڈاکٹر نے اشرف کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ یہ شکایت انہی سے کیجئے گا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔"

"اور .... وہ ڈرائیور؟" رئیس نے پوچھا۔ "کیا وہ پکڑا گیا؟"

"اس کے بارے میں تفصیلات آپ کو تھانے سے حاصل ہو سکتی ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "شاید پکڑا گیا ہے۔"

اشرف علی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ رئیس احمد نے اسے تسلی دی اور ایک

طرف لے گیا۔ "ہمت سے کام لو اشرف، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم فکر مت کرو۔ ہم مشرف کو یہاں نہیں چھوڑیں گے۔ فی الحال پولیس تھانے پر تو لعنت بھیجو۔ سب سے ضروری بات مشرف کی جان بچانا ہے۔ تم ایسا کرو، تم تو یہاں مشرف کے پاس ٹھہرو میں یہاں سے پہلے سیدھا سیونتھ ڈے ہسپتال جاتا ہوں اور وہاں کیس کی نوعیت بتا کر مشرف کے داخلے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"اور گھر؟" اشرف نے مردہ آواز میں کہا۔

"بعد میں دیکھا جائے گا۔" رئیس احمد نے کہا۔ "پہلے ہم شفٹنگ کا بندوبست کر لیں۔ اس کے بعد کم از کم اطمینان تو ہو جائے گا کہ مریض صحیح جگہ پہنچ گیا ہے۔ اس قصائی خانے میں تو کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ بعد میں گھر والوں کو بتائیں گے۔ پہلے یہ کام ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے، آپ جایئے۔" اشرف نے کہا۔ "میں یہاں مشرف کے پاس موجود ہوں۔"

رئیس احمد وہاں سے چلا گیا اور اشرف، مشرف کے بیڈ کے پاس پڑی ہوئی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ وہ مشرف کے پٹیوں میں بندھے ہوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مشرف اس کا اکلوتا بھائی تھا۔ خاندان ہی کتنا بڑا تھا۔ دو بھائی ایک بہن اور ان تینوں کی عمروں میں بھی کوئی بہت زیادہ فرق نہیں تھا۔ بچپن میں وہ کبھی کبھی لڑتے جھگڑتے بھی رہتے تھے لیکن ان میں آپس میں گہری محبت تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ بڑے ہو جانے کے بعد، الگ الگ ہو جانے کے بعد اس محبت کی گہرائی میں کمی ہونے کے بجائے اور زیادہ اضافہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ تینوں ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک رہتے تھے۔ کسی کے ساتھ بھی اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو سب مل کر اس کو حل کرنے اور مدد کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ ان تینوں میں آپس میں گہری مفاہمت تھی۔

اور اسی مفاہمت کے نتیجے میں دونوں بھائیوں کی بیویاں اور سائرہ کا شوہر بھی جیسے اسی خاندان کا حصہ بن گئے تھے۔ آپس میں کسی بھی قسم کی غیریت یا تکلف نہیں تھا۔ وہ چونکہ ان بھائی بہنوں میں سے نہیں تھے جو اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو جانے کے بعد ایک دوسرے سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور صرف اپنی اپنی دنیا میں مگن ہو جاتے ہیں اس لئے ان کے لواحقین بھی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔

اشرف نے مشرف کی بند آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی ایک پلک پر خون کی

ننھی سی بوند جمی ہوئی تھی جو اب سوکھ کر سیاہ ہو گئی تھی۔ "یا پاک پروردگار" اس نے
دل ہی دل میں روتے ہوئے کہا۔ "ان آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بند ہو جانے سے بچالینا
یا میرے مولا۔ اپنا رحم کرنا' یا پاک پروردگار۔"

کوئی ایک گھنٹے کے بعد رئیس واپس آیا اور اس نے بتایا کہ اس نے مشرف کے
سیونتھ ڈے ہسپتال میں داخلے کا بندوبست کر دیا ہے اور وہ ایمبولینس بھی اپنے ساتھ
لے آیا ہے۔ پھر وہ دونوں ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کے پاس گئے اور اس سے کہا کہ وہ اپنے
مریض کو لے جانا چاہتے ہیں۔

"آپ صرف اپنی ذمہ داری پر ایسا کر سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔ "مریض کی
حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو ہماری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔"

"آپ کی نہ پہلے کوئی ذمہ داری تھی اور نہ اب کوئی ذمہ داری ہے۔" رئیس نے
تلخی سے کہا۔ "آپ مہربانی کر کے ہمیں مریض کو لے جانے کی اجازت دے دیجئے۔"

ضروری کارروائی کے بعد مشرف کے زخموں سے چور چور بدن کو سول ہسپتال سے
سیونتھ ڈے ہسپتال منتقل کر دیا گیا اور وہاں فوری طور پر اس کا نئے سرے سے معائنہ
شروع ہو گیا۔

"اب میں مشرف کے گھر جا رہا ہوں۔" رئیس احمد نے کہا۔ "ان لوگوں کو بھی بتا
دوں اور سائرہ یا رقیہ کو ساتھ لے آؤں۔ میں سعدیہ کو فی الحال یہاں نہیں لانا چاہتا۔ اس
کے لئے مشرف کو اس حال میں دیکھنا بے حد تکلیف دہ ہو گا۔"

مشرف علی کے جسم کے دوسرے حصوں پر جو زخم آئے تھے وہ خطرناک اور جان لیوا
نہیں تھے اور سب کے سب قابل علاج تھے لیکن نازک ترین مسئلہ اس کے سر کی چوٹ
تھا۔ ایکسرے رپورٹوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ سر میں آنے والی چوٹ جان لیوا بھی ثابت ہو
سکتی ہے۔ اگلے دن دوپہر کو اس کا آپریشن ہونے والا تھا۔

آپریشن کے وقت وہ سب ہی لوگ وہاں موجود تھے' سوائے بچوں کے۔ مظفر کو بھی
اشرف کے گھر اس کے دادا دادی کے پاس پہنچا دیا گیا اور تمام بچے ان دونوں بوڑھوں کی
تحویل میں تھے۔

زاہد علی اور سلمیٰ ساری رات ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سوئے تھے۔ سلمیٰ نے
رو رو کر برا حال کر لیا تھا اور زاہد علی قدرت کی اس ستم ظریفی پر خون کے آنسو رو رہا تھا
کہ وہ تو اتنی عمر ہو جانے کے باوجود بھی آج تک زندہ سلامت تھا اور اس کا جوان بیٹا

جس کی عمر ابھی صرف بیالیس سال کی تھی' زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ سلمیٰ تو
مصلیٰ بچھا کر بیٹھ گئی تھی اور تقریباً ساری رات بیٹھی دعائیں مانگتی رہی۔

اگلے دن رئیس نے متعلقہ تھانے جا کر اس حادثے کے بارے میں معلومات حاصل
کیں۔ اس کی ملاقات ایس آئی مشتاق احمد سے ہوئی اور وہ اس سے بے حد شرافت' نرمی
اور خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آیا۔

"مجھے اس حادثے کا بے حد افسوس ہے رئیس احمد صاحب!" مشتاق احمد نے کہا۔
"معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگ زخمی کو سیونتھ ڈے ہسپتال لے گئے ہیں۔ وہاں کے
ڈاکٹروں کی کیا رائے ہے؟"

"آج آپریشن ہو گا۔" رئیس احمد نے کہا۔ "لیکن آپ یہ بتایئے کہ کیا آپ نے
اس ڈرائیور کو گرفتار کیا جس نے یہ حادثہ کیا تھا۔ اس کے خلاف رپورٹ درج ہوئی؟"

"ارے صاحب کیوں نہیں ہوتی؟" مشتاق احمد نے کہا۔ "رپورٹ بھی درج ہو گئی۔
ڈرائیور کو ہم نے موقع سے گرفتار بھی کر لیا' بس بھی پکڑ لی آخر قانون ہے کوئی مذاق تو
نہیں ہے۔ آپ مطمئن رہیے ساری کارروائی قانون کے مطابق ہو گی۔ قانون تو سب کے
لئے ہے جناب اور ہم یہاں قانون کی خدمت کے لئے ہی بیٹھے ہیں۔"

"لیکن آپ لوگوں نے اتنا بھی نہیں کیا کہ مجروح کے گھر ہی اطلاع دے دیتے۔"
رئیس احمد نے شکایت کی۔ "حالانکہ ان کی جیب میں شناختی کارڈ بھی تھا۔ وزیٹنگ کارڈ بھی
تھا۔ گھر کا فون نمبر بھی لکھا تھا۔ دفتر کا فون نمبر بھی تھا۔"

"آپ کی شکایت بجا ہے۔" ایس آئی مشتاق نے قطعاً کوئی جرح نہیں کی۔
"دراصل ہمارا فون کل سے خراب پڑا ہے۔ کیا کریں صاحب ٹیلی فون والے بھی اپنی
مرضی کے بادشاہ ہیں۔ جب جی چاہے گا تب ٹھیک کریں گے۔ ویسے پولیس نے مجروح کو
فوراً ہسپتال پہنچا دیا تھا اور آج میں کسی کو اس کے پتے پر بھیجنے ہی والا تھا کہ آپ آ گئے۔"

"کیا میں ایف آئی دیکھ سکتا ہوں؟" رئیس نے کہا۔

"جی کیوں نہیں بڑے شوق سے۔" ایس آئی مشتاق احمد کا رویہ تعاون سے بھرپور
تھا۔ "لیجئے دیکھئے۔" اس نے فائل اس کے سامنے کر دی۔

ایف آئی آر کے مطابق حادثہ راہ گیر کی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا اور بس ڈرائیور کا
اس میں کوئی قصور نہیں تھا۔ بس والا سیدھی سڑک پر اپنے ہاتھ اور اپنے راستے پر بالکل
ٹھیک ٹھیک جا رہا تھا کہ سڑک پار کرنے کی جلدی میں راہ گیر بس کے سامنے آ گیا تھا۔

ڈرائیور نے اس کو بچانے کی کوشش میں بس کو دائیں جانب تیزی سے کاٹا تھا جس کے
میں اس کی بس ایک دوسری بس سے ٹکرا گئی تھی جو اس کے برابر سے گزر رہی تھی۔

"موقعے کے گواہوں کے بیانات کے مطابق حادثہ مجروح کی اپنی غلطی کی وجہ
ہوا۔" ایس آئی مشتاق احمد نے بڑی نرمی کے ساتھ کہا۔ "لیکن پھر بھی ہم نے ڈرائیو
گرفتار کرلیا ہے۔ اب اصل غلطی کس کی ہے اس کا فیصلہ تو عدالت کرے گی۔"

رئیس احمد نے ایف آئی آر دیکھی۔ ایس آئی مشتاق احمد کی باتیں سنیں اور
کھیل اس کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ ایک تجربہ کار اور جہاندیدہ آدمی تھا۔ ساری عمر کراچی
گزاری تھی اور پولیس اور انتظامیہ کے خونی ہتھکنڈوں سے بخوبی واقف تھا۔ اسے
نہیں معلوم تھا کہ حادثے میں ملوث بس کسی پولیس افسر کی ملکیت تھی لیکن وہ یہ سمجھ
کہ پولیس والوں نے بس کے مالک سے رشوت لے کر اس کی مرضی کا کیس بنا دیا
کیس بنانا تو پولیس کے ہاتھ میں تھا۔ مجروح کے حق میں کیس بنانے سے پولیس کو کوئی
فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا تھا جبکہ ڈرائیور کے حق میں کیس بنانے سے پولیس کا فائدہ
فائدہ تھا اور پولیس نے ایسا ہی کچھ کیا ہو گا۔ تاہم اس نے اپنے طور پر اصل حقیقت
جاننے کی کوشش کی۔ مشرف علی کی زبان تو بند تھی اور کون جانے اب اس کی زبان
کھلے بھی یا نہ کھلے۔ مکمل حقیقت تو صرف وہی بتا سکتا تھا۔

رئیس احمد تھانے سے نکل کر گرو مندر پہنچا اور تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر چکر
رہا۔ وہاں اب کل کے حادثے کا کوئی نشان نہیں تھا۔ پھر اس نے اس ٹھیلے والے کو د
جو اسٹاپ کے قریب اپنے پھلوں کا ٹھیلا لئے کھڑا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا گیا۔

"تم روز یہاں ٹھیلا لگاتے ہو؟" اس نے ٹھیلے والے سے کہا۔

"ہاں جی!" ٹھیلے والے نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "کیوں کیا
ہے؟"

"کل دوپہر کے بعد کوئی تین ساڑھے تین بجے کے قریب یہاں کوئی ایکسیڈنٹ
تھا؟" اس نے پوچھا۔ "کسی بس نے آدمی کو ٹکر مار دی تھی۔ کیا تم اس وقت یہاں مو
تھے؟ اطمینان رکھو، میں پولیس کا آدمی نہیں ہوں اور تمہارا نام گواہوں وغیرہ میں شا
کروانا نہیں چاہتا ہوں۔ میں تو صرف اس ایکسیڈنٹ کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔"

"ہاں جی ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔" ٹھیلے والے نے کہا۔ "آدمی تو سڑک کے کنارے ک
ہوا تھا۔ بس نے اچانک سامنے سے آ کر اسے ٹکر مار دی۔ پھر اسے ہسپتال لے گئے پتہ

معلوم نہیں زندہ ہے یا مر گیا۔ ویسے لوگوں نے ڈرائیور کو پکڑ لیا تھا اور اسے مارا پیٹا بھی تھا
اور پھر پولیس اسے پکڑ کر لے گئی تھی۔ مگر کیا ہوتا ہے صاحب! کچھ بھی نہیں۔ وہ سالا
بچ جائے گا۔ پولیس کو مال کھلائے گا اور چھوٹ جائے گا۔ جانے والا تو اپنی جان سے
گیا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ آدمی سڑک کراس نہیں کر رہا تھا؟" رئیس احمد نے کہا۔
"وہ اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا؟"

"ہاں جی!" ٹھیلے والے نے کہا۔ "وہ تو یہاں کھڑا ہوا تھا۔ سڑک کراس نہیں کر رہا
تھا۔ اسے تو بس نے خود ہی ٹکر ماری دی۔ مگر بھائی جان، میرے کو کسی لفڑے میں مت
گھسیٹنا۔ آپ نے پوچھا تو میں نے بتا دیا۔ صاحب میں اِدھر بال بچوں کے لئے دو پیسے
کمانے کے لئے آتا ہوں۔ پولیس والوں کو بھی بھتہ دینا پڑتا ہے۔ ورنہ وہ ڈنڈے مار کر
بھگا دیں اِدھر سے۔"

"تم فکر مت کرو دوست!" رئیس احمد نے کہا۔ "میں نے تو اسی لئے تم سے تمہارا
نام تک نہیں پوچھا ہے۔ میں تمہیں کسی بھی لفڑے میں نہیں گھسیٹ رہا ہوں۔"

رئیس احمد جب وہاں سے روانہ ہوا تو غم و غصے، نفرت اور مایوسی کے عالم میں اس
کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ہر چیز کو آگ لگا دے، سب کچھ
پھونک کر رکھ دے۔ سب کچھ تباہ کر دے۔ اس کے جسم میں خون کی جگہ جیسے آگ بھر
گئی تھی جو اس کے وجود کو بھسم کئے ڈال رہی تھی۔

لیکن یہ غصے اور نفرت کا مجہول طوفان تھا۔ جس میں کچھ دیر کے بعد ٹھہراؤ پیدا ہو
گیا۔ غصہ تو کم ہو گیا لیکن نفرت کی آگ بدستور اس کے رگ و ریشے میں بھڑکتی رہی۔
اٹھ، وہ کچھ کر سکتا۔

اس نے بس اسٹاپ سے کچھ دور کھڑے ہو کر دو چار لمبی لمبی سانسیں لیں اور اپنے
منتشر وجود کو سمیٹنے کی کوشش کی۔ اس حادثے کے بارے میں سوچنا بے کار تھا۔ اب اس
میں کیا رکھا تھا، صاف ظاہر تھا کہ پولیس نے پہلے ہی ڈرائیور کی سزایابی کے تمام راستے بند
کر دیئے تھے۔ اب تو صرف مشرف کے بارے میں سوچنا تھا۔ کاش اس کی جان بچ جائے۔
خدا اس کے حال پر اپنا رحم کرے اور اس کے بیٹے کو یتیم ہونے اور بیوی کو بیوہ ہونے
سے بچائے۔

وہ جس وقت ہسپتال پہنچا تو اس وقت مشرف علی کو آپریشن تھیٹر لے جانے کی

تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ وہ ہنوز بے ہوش تھا اور ڈاکٹروں کی تمامتر کوششوں کے با
اسے ہوش نہیں آیا تھا اور یہ چیز زیادہ خطرناک تھی۔

رئیس احمد نے کسی کو نہیں بتایا کہ اس نے حادثے کی اصل نوعیت معلوم کر لی
اور پولیس نے حادثے کے بارے میں بالکل جھوٹی اور من گھڑت ایف آئی آر درج کر
مجرم ڈرائیور کے بچاؤ کا سارا سامان پہلے ہی کر دیا ہے۔ وہ یہ سب کچھ کہہ کر ان لوگوں
مزید ذہنی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ بے بسی کا یہ احساس آدمی کے لئے بڑا جان لیوا
ہے۔ یہ انسان کی روح کو کچل کر رکھ دیتا ہے اور پھر ہر سچائی پر سے آدمی کا اعتماد اٹھ
ہے۔

رئیس احمد نے ان لوگوں کو حادثے کی بالکل وہی نوعیت بتائی جو ایف آئی آر
درج تھی۔ اس طرح ان لوگوں کے صدموں کی شدت کو تھوڑا سا تو کم کیا جا سکتا
غلطی آخر مشرف کی بھی تو تھی۔ اسے دیکھ بھال کر سڑک کراس کرنی چاہئے تھی۔

"ڈرائیور کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہمارے لئے
سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب چاہے وہ اسے پھانسی پر بھی لٹکا دیں تو ہماری بلا سے۔ ہمیں
ہمارا مشرف واپس مل جائے بس یہی دعا ہے خدا سے۔"

"خدا میرے بھائی کی جان بچا لے۔" سائرہ نے روتے ہوئے کہا۔ "ڈرائیور
اب ہمیں کیا لینا ہے۔ ہمیں تو بس اپنے بھائی کی زندگی کے لئے دعا کرنی چاہئے اور خدا
ڈرائیور کو بھی نیک توفیق دے۔"

ڈرائیور کو نیک توفیق کی دعا دینے والی سائرہ کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اگلے دو دن
بعد ہی' وہ ڈرائیور اسی مجرمانہ انداز میں سڑکوں پر بس دوڑاتا پھر رہا ہو گا۔

مشرف علی کا آپریشن تو ہو گیا اور ڈاکٹروں نے یہ مژدہ سنایا کہ اس کی جان بچ گئی
اور وہ زندہ رہے گا لیکن اس کی دماغی حالت کے بارے میں فی الحال کچھ نہیں کہا جا
تھا۔ اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ وہ اپنی یادداشت کھو بیٹھے یا اس کا دماغی توازن در
نہ رہے۔ اس کے بارے میں چند روز کے بعد ہی کچھ کہا جا سکتا تھا۔

وہ چند روز بڑے کرب اور اذیت کے عالم میں گزرے۔ مشرف علی کو ہوش آ
تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اسے چمچے سے غذا دی جانے لگی تھی اور وہ
لے رہا تھا۔ اس سے یہ امید بندھی تھی کہ اس کا دماغ صحیح طور پر کام کرنے لگا ہے
وہ ابھی تک زبان سے کچھ نہیں بولا تھا اور اس کی آنکھوں میں ایک بے نام سی حیرت

وہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگلے چند روز میں یہ ہولناک انکشاف ہوا کہ مشرف علی اپنی یادداشت سے مکمل
محروم ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کا دماغی توازن بھی بگڑ گیا ہے۔
وہ کسی کو نہیں پہچانتا تھا۔ حتیٰ کہ اسے اپنا نام تک یاد نہیں تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی اور
ان آنکھوں میں صرف وحشت تھی۔ ان میں کوئی جذبہ نہیں تھا۔ وہ پوری طرح بول
تھا' بات کر سکتا تھا لیکن وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا' بے سر و پا' مہمل باتیں' کبھی بیٹھے
بیٹھے ہنسنے لگتا اور کبھی خود ہی رونے لگتا اور خوب روتا۔

ڈاکٹروں کی ایک ٹیم بار بار اس کا معائنہ کر رہی تھی اور اسے فی الحال ہسپتال کے
الگ کمرے میں انڈر آبزرویشن رکھا گیا تھا۔ پیسہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ نہ جانے کتنا
خرچہ ہو چکا تھا اور ابھی کتنا خرچہ ہونا باقی تھا۔ مشرف حسین جس کمپنی میں کام کرتا تھا وہاں
ملازمین کو مکمل طبی سہولتیں حاصل نہیں تھیں بلکہ میڈیکل الاؤنس کی مد میں ایک خاص
رقم تنخواہ میں شامل کر دی جاتی تھی۔ اس طرح وہ رقم تنخواہ کا حصہ بن جاتی تھی۔ بیماری
ہسپتال جانے کی صورت میں علیحدہ سے کوئی رقم نہیں ملتی تھی' اس لئے اخراجات کا سارا
بوجھ خود ہی برداشت کرنا پڑتا تھا۔

ڈاکٹروں نے تقریباً ایک ہفتے تک اسے انڈر آبزرویشن رکھا۔ مشرف علی کی حالت
میں کسی بہتری کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے وہ اسی طرح بہکی بہکی الٹی سیدھی باتیں
کرتا تھا۔

ڈاکٹروں نے زار و قطار روتی ہوئی سعدیہ کو تسلی دی اور اسے اور دوسرے لواحقین
کو اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے' مسز مشرف!" نیورو سرجن نے کہا۔ "ان کے
ہو جانے کے امکانات نہیں مگر ہم ان کی طرف سے بالکل ناامید نہیں ہیں۔ علاج کیا
جا سکتا ہے لیکن اس کے لئے کچھ انتظار کرنا ہو گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے
ساتھ ان کی حالت میں کچھ افاقہ ہو۔ ہم دوائیں دے رہے ہیں لیکن اگر کوئی افاقہ نہ
ہوا تو پھر الیکٹرک شاکس کے ذریعے ان کا علاج کریں گے۔ مگر اس علاج کو کچھ عرصے کے
بعد ہی شروع کیا جا سکے گا۔ ابھی یہ بہت کمزور ہیں۔ ان کے جسم کے دوسرے حصوں میں
بھی کافی چوٹیں آئی ہیں۔ جب ان کی جسمانی طاقت قدرے بہتر ہو جائے گی تو پھر ہم ان کا
الیکٹرک شاکس سے علاج شروع کریں گے۔ فی الحال آپ ان کو گھر لے جائیے اور کوشش

کیجئے کہ انہیں مزید کوئی صدمہ نہ پہنچے۔"

"ڈاکٹر صاحب! اس کا تو کوئی خطرہ نہیں ہے کہ .... یہ تشدد آمیز حرکتوں پر آئیں؟" اشرف نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "وائلنٹ ہونے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ عام طور پر اس کے مریض خاموش اور پُرسکون رہتے ہیں۔ وہ وائلنٹ نہیں ہوتے اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ویسے بھی اس دوران ان کو جو دوائیں ملتی رہیں گی وہ انہیں پُرسکون رکھیں گی۔"

چنانچہ مشرف علی کو ہسپتال سے گھر لے آیا گیا اور زاہد علی اور سلمیٰ جو اب اشرف کے ساتھ رہ رہے تھے، مشرف کے گھر منتقل ہو گئے تاکہ سعدیہ کے ساتھ رہ سکیں اور مشرف کی دیکھ بھال میں آسانی ہو۔

مشرف علی گھر واپس آ گیا اور اس کی حالت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ وہ کھاتا تھا، بات سمجھ لیتا تھا، بات مان لیتا تھا لیکن یہ سب کچھ وہ کسی کھوئے کھوئے اجنبی کی طرح کرتا تھا۔ اس کی یادداشت مکمل طور پر ختم ہو چکی تھی اور کبھی کبھی تو وہ بالکل بچوں کی سی باتیں کرنے لگتا تھا۔ اس کا دماغی توازن بالکل خراب ہو چکا تھا لیکن وہ کسی کے لئے خطرہ نہیں بنا۔ وہ اپنے کمرے میں خاموش پڑا رہتا تھا۔ نہ کبھی وائلنٹ ہوا نہ اس نے کسی سے کوئی لڑائی جھگڑا کیا البتہ وہ بستر پر پڑے پڑے گھنٹوں اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ باتوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا تھا۔

سعدیہ اپنی زندگی کے ایک اور اذیت ناک دور سے گزر رہی تھی۔ جب تک مشرف علی ہسپتال میں تھا اور زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا تو اس اذیت کا ایک الگ رنگ تھا اور اب وہ بچ گیا تھا۔ زندہ تھا لیکن کیا وہ واقعی مشرف علی تھا؟ کیا وہ واقعی اس کا شوہر، اس کے بچے کا باپ، ہنسنے بولنے والا، بے تحاشہ باتیں کرنے والا، ہنسی مذاق کرنے والا مشرف تھا جو محفلوں کی جان تھا؟

نہیں .... یہ وہ مشرف نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اور ہی تھا۔ یہ تو کوئی بے روح انسان تھا۔ جس کی آنکھوں میں کوئی جذبہ نہیں تھا، جس کے لب پر شناسائی کا کوئی کلمہ نہیں، جس کے انداز میں اپنائیت کا کوئی رچاؤ نہیں تھا۔ یہ تو کوئی اجنبی شخص تھا، بالکل اجنبی۔

سعدیہ گھنٹوں چھپ چھپ کر روتی رہتی۔ اس کے ہونٹوں سے ہنسی غائب ہو چکی تھی۔ بہت دن ہو گئے کہ وہ مسکرائی تک نہیں تھی۔ اس نے اسکول سے چند ماہ کی

[چھٹی] لے لی تھی اور سارا دن گھر پر ہی رہتی تھی۔ مظفر کو وہ برابر اسکول بھیج رہی تھی اور اس کے بوڑھے ساس سسر اس کے ساتھ موجود تھے۔ ان دونوں کی وجہ سے بہت سہارا تھا۔ زاہد علی نے اپنا بستر بیٹے کے کمرے میں ہی لگا لیا تھا اور وہ رات کو وہیں سوتا تھا۔ دن کو بھی زیادہ تر وہ بیٹے کے پاس ہی رہتا تھا۔

مشرف علی کو دوائیں برابر دی جا رہی تھیں اور اس کی عام جسمانی صحت میں بہتری کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ چوٹیں بھی ٹھیک ہوتی جا رہی تھیں لیکن اس کا ذہن ہنوز ماؤف تھا۔ وہ مکمل طور پر خود فراموشی کی کیفیت میں تھا۔ اس کے چہرے کے خد و خال بدل گئے تھے۔ اس کا چہرہ ہونقوں کی طرح رہتا تھا۔ زاہد علی ہر دوسرے تیسرے دن اپنے ہاتھ سے اس کا شیو بنا دیتا تھا اور مشرف اس سے تعرض نہیں کرتا تھا۔

اسے ایک بار پھر ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا اور ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد یہ کہا کہ پندرہ دن کے بعد سے وہ اس کا الیکٹرک شاکس کے ذریعے علاج شروع کرے گا۔ مشرف علی اب اس قابل ہو چکا تھا کہ اس علاج کی اذیت کو برداشت کر سکے۔ [لیکن] ڈاکٹر نے یہ بات واضح کر دی تھی کہ یہ علاج بہت طویل بھی ہو سکتا ہے۔ برسوں کے عرصے پر مشتمل۔

وہ لوگ اسے واپس لے آئے۔ اب پندرہ دن کے بعد اسے ہسپتال لے جانا تھا۔

زاہد علی الصباح بیدار ہو جاتا تھا اور دوسرے بستر پر سوئے ہوئے مشرف علی پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہاتھ منہ دھو کر اور وضو کر کے فجر کی نماز پڑھتا تھا۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ مشرف علی کے پاس آ کر اس پر دم کرتا تھا۔ مشرف علی عام طور سے دیر تک سوتا رہتا تھا، کیونکہ اسے مسکن دوائیں دی جا رہی تھیں۔

مشرف علی کا الیکٹرک شاکس کا علاج چند روز بعد شروع ہونے والا تھا۔ اس رات اس نے معمول کے مطابق کھانا کھایا۔ سعدیہ نے اسے دوا دی جو اس نے خاموشی سے کسی سعادت مند بچے کی طرح کھا لی۔

"اب آپ آرام سے لیٹ جایئے اور سو جایئے۔" سعدیہ نے اس سے کہا۔ مشرف نے خالی خالی ویران اور بے معنی نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھا اور بستر پر لیٹ گیا۔ سعدیہ نے اسے چادر اڑھا دی۔

اگلی صبح حسب معمول زاہد علی تڑکے ہی بیدار ہوا اور اس نے مشرف علی کے بستر کی طرف نظر ڈالی تو بستر کو خالی پایا۔ اس نے سمجھا کہ شاید وہ باتھ روم میں گیا ہو گا لیکن پھر

اچانک باتھ روم کے دروازے پر اس کی نظر پڑی اور وہ اسے پورا کھلا ہوا نظر آیا۔ اس ر
اندر جھانک کر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔

اس باتھ روم کے دروازے میں اندر کی طرف کو لگی ہوئی چٹخنی خاص طور سے نکا
کر الگ کر دی گئی تھی تاکہ کبھی ایسا نہ ہو سکے کہ مشرف علی اپنے آپ کو اندر سے بند
لے۔ اس کو سمجھا دیا گیا تھا کہ جب باتھ روم جائے تو دروازے کو اندر سے بھیڑ لے اور
اس ہدایت پر پوری طرح عمل کرتا تھا۔ ان بنیادی باتوں کی سمجھ اس کے اندر موجود تھ

"شاید باہر نکل کر ٹہل رہا ہو۔" زاہد علی نے سوچا اور جلدی سے کمرے سے نک
آیا۔ مشرف علی اسے دکھائی نہیں دیا اور پھر وہ مکان کے احاطے میں آ کر اسے تلا
کرنے لگا۔ اندرونی دروازہ اسے کھلا ہوا ملا تھا اور وہ کافی پریشان ہو گیا تھا کیونکہ گیٹ
کھڑکی میں اندر سے تالا لگا ہوا نہیں تھا۔

جیسے ہی اس کی نظر گیٹ پر پڑی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ گیٹ کی کھڑکی
ہوئی تھی۔

گھر کے باقی افراد اس وقت سو رہے تھے۔ زاہد علی نے تیزی سے گھر کے احاطے
جائزہ لیا' مشرف علی وہاں کہیں نہیں تھا۔ پھر وہ جلدی سے گیٹ کی کھلی ہوئی کھڑکی سے با
نکلا۔ علی الصباح کے ملگجے منظر میں سڑک تاحدِ نظر بالکل خالی پڑی ہوئی تھی۔

زاہد علی بھاگا ہوا اندر آیا۔ اس نے جلدی سے اپنی بیوی سلمٰی اور بہو سعدیہ
جگایا۔

"اشرف کو فون کرو۔" اس نے کہا۔ "مشرف کہیں باہر نکل گیا ہے۔ میں اس
تلاش میں جا رہا ہوں۔ شاید ابھی زیادہ دور نہ گیا ہو۔ گیٹ کی کھڑکی کھلی ہوئی ملی ہے۔"

"ہائے اللہ!" سعدیہ اچھل کر بستر سے اٹھی اور ٹیلی فون کی طرف بھاگی۔ اس
بوڑھی ساس جلدی جلدی مکان کے سارے کمروں کا چکر لگانے لگی اور زاہد علی جلد
سے گھر سے باہر نکل گیا۔

اس نے پہلے تو گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر سڑک کے دونوں طرف دور دور
دیکھا۔ کسی آدمی کا نام و نشان بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ گھروں کے دروازے بند تھے اور
پر گہرا سناٹا طاری تھا۔ زاہد علی چند لمحوں تک سوچتا رہا کہ وہ دائیں طرف جائے یا
طرف اور پھر اس نے بائیں طرف چلنے کا فیصلہ کر لیا۔

بڑھاپے اور ناتوانی کے باوجود وہ بہت تیزی کے ساتھ چل رہا تھا بلکہ کسی کسی

دوڑنے بھی لگتا۔ اپنے بوڑھے جسم کی ساری طاقت کو مجتمع کر کے وہ زیادہ سے زیادہ تیز
رفتاری کا مظاہرہ کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ چاروں طرف نظریں بھی دوڑاتا جا رہا تھا لیکن
مشرف علی کا دور دور تک کوئی پتہ' نشان نہیں تھا۔ سڑک پر کوئی آدمی بھی نہیں تھا جس
سے وہ کچھ پوچھ سکتا۔

"جانے کدھر نکل گیا۔" اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا۔ "خدا جانے
اب تک کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہو گا۔"

پھر اس کے دل میں ایک موہوم سی امید پیدا ہوئی کہ شاید وہ خود ہی واپس آ
جائے۔ اتنی سمجھ تو اس میں تھی۔ اسے اپنے گھر کا راستہ یاد ہو گا۔ اپنا گھر یاد ہو گا۔ شاید وہ
آ جائے۔

زاہد علی بہت دور تک اسے تلاش کرتا ہوا چلا گیا۔ اس نے بہت سی گلیوں میں بھی
جھانک کر اسے دیکھا۔ اب اجالا ہونے لگا تھا اور سڑکوں پر اور گلیوں میں کچھ لوگ بھی چلتے
پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

تقریباً ایک گھنٹے تک زاہد علی اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا رہا اور پھر ناکام ہو کر واپس آ
گیا۔ مشرف کہیں نہیں ملا۔ جب وہ اپنا اترا ہوا پریشان چہرہ لے کر واپس آیا تو اس نے
اپنی بیوی سلمٰی کو گیٹ کے پاس کھڑا ہوا پایا۔ سلمٰی نے اسے بتایا کہ سعدیہ نے اشرف کو
فون کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ خود بھی مشرف کی تلاش میں نکل گئی تھی۔ اشرف تھوڑی
دیر میں آ گیا تھا لیکن سعدیہ سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی کیونکہ سعدیہ نکل چکی تھی۔
اب اشرف گاڑی میں اکیلا مشرف کو ڈھونڈنے نکلا تھا۔

اس رات دس بجے کے قریب وہ سب کے سب مشرف کے گھر کے ڈرائنگ روم
میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے کا ماحول آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا۔ تیز روشنی کے باوجود جیسے
ہر طرف اندھیرے کا راج تھا۔ جب دلوں میں اندھیرا اتر جائے تو پھر ساری روشنیاں دم
توڑ دیتی ہیں۔ سعدیہ کی آنکھیں سارا دن خون کے آنسو روتی تھیں۔ اس کے لئے اس
لمحے کا سب سے زیادہ دردناک اور غم انگیز پہلو یہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو قصوروار گردان
رہی تھی۔ پچھتاوے کا زہر اس کی نس نس میں گھل رہا تھا اور وہ دیواروں سے اپنا سر ٹکرا
دینا چاہتی تھی۔ کاش .... کاش .... وہ گیٹ کی کھڑکی میں تالا لگا کر رکھتی۔ اس کے
وہم و گمان میں بھی یہ بات کبھی نہیں آئی تھی کہ مشرف چپکے سے رات کو باہر نکل جائے
گا۔ وہ تو ہسپتال سے جب گھر آیا تھا تو اس دن کے بعد سے اس نے گھر کے باہر قدم ہی

نہیں نکلا تھا۔ وہ گھر کے احاطے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہتا تھا اور زاہد علی اس کے ساتھ ہوتا تھا اور اس نے کبھی بھی گیٹ سے باہر جانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن کل رات خدا جانے کیا ہو گیا۔

اشرف، رئیس، زاہد علی اور دوسرے لوگ سارا دن مشرف کو تلاش کرتے رہے تھے لیکن اس کا کوئی پتہ نہیں چلا تھا۔ انہوں نے آس پاس بلکہ دور دور تک کے سارے علاقوں کو چھان مارا تھا۔ جگہ جگہ لوگوں سے، دکانداروں سے، ٹھیلے والوں سے، ہوٹل والوں سے پوچھا تھا لیکن کسی نے اس آدمی کو نہیں دیکھا تھا۔ جس کی عمر بیالیس سال کے قریب تھی اور جو ہلکے نیلے رنگ کی شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا اور جس کے دائیں گال پر ٹھوڑی کے قریب ایک بڑا سا سیاہ مسہ تھا۔

پولیس کو اس کی گمشدگی کی اطلاع دے دی گئی تھی اور اگلے دن کے اخبارات میں اشاعت کے لئے اس کی گمشدگی کا اعلان دے دیا گیا تھا۔ کئی رفاہی تنظیموں اور اداروں سے بھی تعاون کے لئے رابطہ قائم کیا گیا تھا۔ سارے سرکاری اور نیم سرکاری ہسپتالوں میں دیکھ لیا گیا تھا۔ غرضیکہ وہ سب کچھ کر لیا گیا تھا جو ایک دن میں کرنا ممکن تھا۔

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے تین ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ ہزار تلاش کے باوجود مشرف علی کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔ اخبارات میں متعدد بار اس کی گمشدگی کے اعلانات شائع کرائے گئے۔ پتہ لگانے والے کے لئے انعام کی پیشکش بھی کی گئی۔ ٹھٹھہ، حیدر آباد اور لاہور سمیت ملک کے بہت سے دوسرے شہروں میں بھی اسے تلاش کیا گیا۔ پاگل خانوں میں اور ہسپتالوں میں دیکھا گیا۔ مردہ خانوں میں رکھی ہوئی لاوارث لاشوں کا معائنہ کیا گیا لیکن مشرف علی کہیں نہیں تھا۔ خدا معلوم وہ زندوں میں تھا یا مُردوں میں۔

سعدیہ کے لئے یہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ غم انگیز دور تھا۔ تقدیر نے اس کے ساتھ عجیب و غریب قسم کا مذاق کیا تھا۔ اگر مشرف علی مر جاتا تو یہ صدمہ کی ایک متعین اور طے شدہ شکل ہوتی۔ موت کا صدمہ جو اگرچہ انسان کی زندگی میں سب سے بڑا صدمہ ہوتا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شدت میں کمی ہو جاتی ہے لیکن سعدیہ کے صدمے کی تو نوعیت ہی بالکل منفرد تھی۔ یہ لاچاری، مجبوری، بے بسی اور محرومی کا ایک ایسا اذیت ناک احساس تھا جو ہر لحظہ اس کے دل میں کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ ہر شام شامِ فراق تھی اور آنکھوں سے جوئے خوں بہتی رہتی تھی۔ دو شمعیں تھیں جو فروزاں رہتی تھیں۔ یہ ایک لاتناہی اور غیر معینہ کرب تھا جس کا سلسلہ شاید دائمی تھا۔

تن پھیلا ہوا تھا۔

"اب تک ان کے جسم پر ایک ہی لباس ہو گا۔" سعدیہ یہ اکثر سوچتی۔ "ان کی داڑھی بھی کس قدر بڑھ گئی ہو گی۔ اب تو شکل بھی نہیں پہچانی جاتی ہو گی۔ خدا معلوم وہ کہاں ہوں گے، کس حال میں ہوں گے؟ کھانے پینے کو کہاں سے ملتا ہو گا۔ کس طرح ملتا ہو گا۔" اور یہ سب کچھ سوچتے سوچتے اس کے کلیجے میں ٹیسیں اٹھنے لگتیں اور آنکھوں سے ایک بار پھر جوئے خوں رواں ہو جاتی۔ چشم خون بستہ سے ہر رات لہو ٹپکتا اور یہ ایسا آزار تھا جو جانے والا نہ تھا۔ مشرف کی بے خبری اسے نہ جانے کہاں لے گئی تھی اور سعدیہ کے پاس دھند میں لپٹی ہوئی تصویروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

دکھوں کے سمندر میں زندگی قطرہ قطرہ بہہ رہی تھی۔ ٹیلیفون کی ہر گھنٹی پر وہ دیوانہ وار لپکتی اور جھپٹ کر ریسیور اٹھا لیتی۔ دروازے پر ہونے والی ہر دستک پر وہ مضطرب ہو کر بھاگتی، شاید .... شاید کوئی اطلاع .... کوئی خبر .... یا شاید وہ خود۔ مگر کچھ بھی نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں تھا۔

نہ تُو تُو رہا نہ مَیں مَیں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی

وہ ہر روز بڑے غور سے اخبارات کو دیکھتی لیکن بڑی خبروں کے بجائے اس کی نظریں چھوٹی چھوٹی، ایک کالمی اور چند سطری غیر اہم خبروں کو تلاش کرتیں۔ حادثات کی خبریں۔ لاوارث لاشوں کے پائے جانے کی خبریں اور اسی قسم کی دوسری خبریں جن کو دوسرے لوگ عام طور پر نظرانداز کر جاتے ہیں لیکن سعدیہ کے لئے ان خبروں کی ایک خاص اہمیت تھی۔ شاید ایسی ہی کسی خبر کے ذریعے اسے اپنی فردوسِ گم گشتہ کا کوئی سراغ مل جائے۔

اور پھر ایک دن اس نے اخبار میں ایک ایسی خبر دیکھ لی جسے پڑھ کر وہ حواس باختہ ہو گئی۔ لانڈھی کے ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک نامعلوم ادھیڑ عمر کا آدمی ریل کی پٹڑی پار کرتے ہوئے ٹرین کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ لوگوں نے بتایا تھا کہ وہ کوئی لاوارث پاگل فقیر تھا جو اکثر اس علاقے میں دیکھا جاتا تھا۔ پولیس نے اس کی لاش کو سول ہسپتال کے مردہ خانے میں رکھ دیا تھا۔

سعدیہ نے یہ خبر پڑھی اور اس کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ اس نے اسی وقت اشرف کو فون کیا اور اسے یہ خبر سنائی۔ اشرف نے اس سے کہا کہ وہ ابھی رئیس کو ساتھ لے کر سول ہسپتال جا رہا ہے۔

کوئی تین گھنٹے کے بعد جب اشرف اور رئیس سعدیہ کے گھر پہنچے تو وہ تنہا نہیں
تھے۔ ان کے ساتھ ایک ایمبولینس بھی تھی۔ ایمبولینس میں ایک نہلائی اور کفنائی ہوئی
لاش تھی۔

اشرف اور رئیس نے مشرف کی مسخ شدہ لاش کو پہچان لیا تھا۔ اس کے جسم پر میلا
کچیلا، خون آلود، نیلے رنگ کا شلوار قمیض سوٹ تھا جو کئی جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ پاؤں میں
پشاوری چپل تھی۔ اس کی داڑھی بے تحاشہ بڑھی ہوئی تھی اور ٹھوڑی کے دائیں جانب
وہ سیاہ مسہ موجود تھا جو اب داڑھی کے سیاہ و سفید بالوں میں چھپ گیا تھا۔

لاش سالم حالت میں نہیں تھی۔ وہ کئی ٹکڑوں میں منقسم تھی اور اس کا چہرہ اس
طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا جیسے کسی مٹی کے کھلونے کا چہرہ ٹوٹ جائے۔ بے تحاشہ بڑھی
ہوئی داڑھی نے چہرے کو اور بھی زیادہ بدل دیا تھا۔ تاہم ٹھوڑی کے دائیں جانب وہ سیاہ
مسہ جو مشرف علی کی نمایاں ترین شناختی علامت تھی، موجود تھا۔

پولیس والوں نے متوفی کے بارے میں علاقے کے لوگوں سے جو معلومات حاصل کی
تھیں ان کے مطابق یہ نامعلوم پاگل کوئی دو ڈھائی ماہ پہلے اس علاقے میں اچانک نمودار
ہوا تھا۔ وہ کسی سے بات نہیں کرتا تھا اور اکثر لانڈھی ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پڑا
رہتا تھا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگتا تھا۔ البتہ دن میں ایک بار اسٹیشن کے باہر ہوٹل کے
سامنے جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ ہوٹل والا اسے بچا کھچا کھانا دے دیتا تھا جسے وہ خاموشی سے کھا
لیتا تھا۔ اس نے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا تھا اور نہ ہی کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا۔ وہ
اکثر بیٹھا ہوا خود بخود منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا رہتا تھا لیکن کسی نے کبھی یہ سننے کی
ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ وہ کیا کہتا ہے اور کس زبان میں بڑبڑا رہا ہے۔

سعدیہ کے صدمات کا نقطہ عروج پر آن پہنچا تھا۔ آج وہ دردناک کہانی اپنے انجام کو
پہنچ گئی تھی جس کا آغاز 22 دسمبر 1978ء کی اس منحوس سہ پہر کو ہوا تھا۔ 22 دسمبر
1978ء سے لے کر آج تقریباً پانچ ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد مشرف علی کی کتاب زندگی،
وہ باب، وہ آخری باب بند ہو گیا تھا جس کی کسی بھی سطر کی تحریر سے مشرف علی خود واقف
نہیں ہو سکا تھا۔

"بیٹی اس کا مر جانا ہی اچھا ہوا۔" بوڑھے زاہد علی نے کانپتی ہوئی، آنسوؤں میں
گندھی ہوئی آواز میں، سعدیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "وہ زندہ رہتا تو اور زیادہ
دکھ سہتا رہتا اور اس غریب کو تو اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں تھا۔ بس اب خدا سے

اس کی مغفرت کی دعا کرو۔ اللہ تعالیٰ اس کی روح کو سکون بخشے۔"

سعدیہ نے بہت چاہا کہ اسے آخری بار اس کے شوہر کا چہرہ دکھا دیا جائے لیکن اسے
سختی سے روک لیا گیا۔ اشرف اور رئیس نے اسے سمجھایا کہ مشرف کا چہرہ دیکھنے کے قابل
نہیں رہا ہے۔ انہیں خدشہ تھا کہ سعدیہ نے اگر اس کے چہرے کو دیکھا تو وہ شدت غم سے
بے ہوش ہو جائے گی۔ ہڈیوں کے ان ٹوٹے ہوئے خون آلود ٹکڑوں میں جن پر جا بجا کٹا
پھٹا گوشت چپکا ہوا تھا، وہ ایک ناقابل برداشت اذیت کے علاوہ اور کچھ نہیں تلاش کر سکتی
تھی۔ مظفر کو بھی اپنے مردہ باپ کا چہرہ نہیں دیکھنے دیا گیا اور اسی سہ پہر کو مشرف علی کو سخی
حسن کے قبرستان میں دفن کر دیا گیا۔

مشرف، سعدیہ کا صرف شوہر اور اس کے بیٹے کا باپ ہی نہیں تھا۔ وہ اس کا سب
سے زیادہ گہرا دوست، اس کا قریب ترین رفیق، زندگی کی سب سے عزیز ہستی بھی تھا۔
سعدیہ نے مشرف کو ٹوٹ کر چاہا تھا۔ اس کی ذرا سی تکلیف پر وہ پریشان ہو جاتی تھی اور
اس کی ہمیشہ یہ شعوری کوشش ہوتی تھی کہ مشرف کو زیادہ سے زیادہ آرام و سکون اور
راحت حاصل ہو۔ ان دونوں کے درمیان مثالی مفاہمت تھی۔ سعدیہ اکثر سوچتی تھی کہ
شاید مشرف کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا دوسرا مرد موجود نہیں ہے جس کے ساتھ اس کی
اس قدر گہری مفاہمت اور ہم آہنگی ہو سکے۔ ان دونوں کے مزاجوں اور رویوں میں تو
تقریباً سب ہی کچھ مشترک تھا۔ مشرف کی موت سعدیہ کے لئے صرف شوہر کی موت نہیں
تھی، سعدیہ اسے خود اپنی موت محسوس کر رہی تھی۔

مگر زندہ تو پھر بھی رہنا پڑتا ہے۔ اس محشر حیات میں کتنے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو
اپنے سینوں میں عرصہ محشر لئے ہوئے زندہ رہتے ہیں اور سعدیہ بھی انہی میں سے ایک
تھی۔ اب اسے زندہ رہنا تھا تو مظفر کے لئے، مشرف کے یتیم بیٹے کے لئے۔ مظفر کو اب
اسے صرف ماں کا پیار ہی نہیں باپ کی شفقت بھی دینی تھی۔

چنانچہ بتدریج ایک ٹھہراؤ کی سی کیفیت پیدا ہوئی۔ چڑھی ہوئی ندی آہستہ آہستہ
اتری اور فکر رفتہ، غم امروز اور امید فردا پر مشتمل سلسلہ سود و زیاں میں جکڑی ہوئی زندگی
آگے بڑھنے لگی۔

اس روز مشرف علی کی پہلی برسی تھی جب رقیہ کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔
پہلی برسی کے موقع پر سارے لوگ مشرف علی مرحوم کے گھر پر جمع تھے۔ مرد
قبرستان سے فاتحہ پڑھ کے ابھی ابھی لوٹے تھے اور مغرب کی اذان سے پہلے کھانے پر فاتحہ

دی جا رہی تھی۔ رقیہ اس وقت ان عورتوں میں شامل تھی جو ایک کمرے میں بچھی ہوئی
چاندنی پر بیٹھی ہوئی سپارے پڑھ رہی تھیں۔ سعدیہ اس کے برابر بیٹھی ہوئی پڑھ رہی تھی
کہ اچانک رقیہ نے اپنے سینے کو دونوں ہاتھوں سے دبالیا اور اس کے چہرے پر سخت اذیت
کے آثار نمودار ہوئے وہ ایک طرف کو ڈھلکی جا رہی تھی۔

سعدیہ نے اس میں اچانک رونما ہونے والی اس تبدیلی کو دیکھا اور جلدی سے پارہ
رکھ کر اس کو سنبھالنے لگی۔ رقیہ کا جسم پسینے میں ڈوب رہا تھا اور اس کا سانس زور زور
سے چل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا سانس اکھڑ رہا ہو۔

سعدیہ نے جلدی سے اسے فرش پر لٹا دیا اور اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ رقیہ
زبان سے کچھ نہیں کہہ پا رہی تھی لیکن سعدیہ بخوبی محسوس کر سکتی تھی کہ اس کے سینے
میں شدید درد اٹھ رہا ہے اور یہ دل کے دورے کی علامت ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد رقیہ کو امراضِ قلب کے ہسپتال میں پہنچا دیا گیا جہاں اسے فوری
طور پر انتہائی نگہداشت کے شعبے میں رکھا گیا۔ وہ ایک ہفتے تک زندگی اور موت کی کشمکش
میں مبتلا رہنے کے بعد آخر ختم ہو گئی۔ اس روز جب وہ سعدیہ کے گھر میں بے ہوش ہوئی
تھی تو پھر اس کے بعد سے اسے ہوش نہیں آیا۔ ڈاکٹروں نے بہت کوشش کی لیکن کوئی
کوشش کارگر نہ ہوئی۔

اشرف علی کی نظروں میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ گزشتہ ایک سال کے دوران یہ دوسرا
بھیانک صدمہ تھا جو اسے برداشت کرنا پڑا تھا۔ ابھی تو مشرف علی کی المناک موت
صدمہ بھی کم نہیں ہونے پایا تھا کہ یکبارگی یہ ستم کا نیا پہاڑ ٹوٹ پڑا اور یہ رنج والم کا ایک
ایسا طوفان تھا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ وہ اپنے آپ کو بالکل تنہا محسوس کرتا
تھا اور یہ تنہائی ایسی تھی جس کا کوئی مداوا بھی نہیں تھا۔ یہ ایک ایسی طویل اور غم ناک
شب فرقت کا آغاز تھا جس کی کوئی صبح نہیں تھی۔ مرنے والی مرگئی تھی۔ وہ خاک کا پیوند
ہو گئی تھی اور اب کبھی واپس نہیں آسکتی تھی۔

رقیہ اپنے پیچھے دو بچے چھوڑ کر مری تھی۔ بڑی بیٹی کی عمر اس وقت کوئی بارہ سال
تھی اور اس کا نام فردوس تھا۔ اس سے چھوٹا بیٹا سہیل کوئی دس سال کا تھا اور مشرف اور
سعدیہ کے بیٹے مظفر کا ہم عمر تھا۔ دونوں بچوں کو ماں کی اچانک جدائی کے غم نے جیسے پاگل
کر کے رکھ دیا تھا۔ امی اتنی جلدی روٹھ کر چلی جائیں گی' انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں
تھا۔

رقیہ کی موت کے بعد یہ طے پایا کہ سلمیٰ اب رقیہ کے بچوں کے ساتھ اشرف کے
گھر میں رہے گی اور زاہد علی بدستور سعدیہ اور مظفر کے ساتھ رہتا رہے گا۔ اب تو اشرف
کے بچوں کو بھی کسی دیکھ بھال کرنے والے کی ضرورت تھی۔

سب سے پہلے یہ خیال رئیس احمد کے دماغ میں آیا تھا اور جب اس نے اپنی بیوی
سائرہ سے اس کا اظہار کیا تو سائرہ چونک پڑی۔ اس نے اس معاملے کو اس انداز سے کبھی
نہیں دیکھا تھا۔

"نہیں یہ ناممکن ہے۔" اس نے اپنے شوہر کی بات کو رد کرتے ہوئے کہا۔ "ایسا
نہیں ہو سکتا۔ نہ تو اشرف اس کے لئے تیار ہوں گے اور نہ سعدیہ۔ آخر رشتوں کا اپنا
ایک تقدس ہوتا ہے۔"

"اس سے رشتوں کا تقدس مجروح نہیں ہو گا۔" رئیس احمد نے کہا۔ "میں جو کچھ
کہہ رہا ہوں وہ ان دونوں کے اور ان کے بچوں کے مفاد میں ہے۔ اس شادی کا مقصد کوئی
نیا گھر بسانا نہیں ہے بلکہ دو ٹوٹے ہوئے گھروں کو جوڑنا ہے۔ یہ کوئی عیش کوشی نہیں ہے
بلکہ ایک فطری ضرورت ہے۔ دیکھو' انسان کی عمر جیسے جیسے بڑھتی ہے ویسے ویسے اس کی
رفاقت کی ضرورت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جوانی میں رفیقِ زندگی کی کمی اتنی محسوس
نہیں ہوتی جتنی کہ اولڈ ایج میں۔ تب یہ ایک لازمی ضرورت بن جاتی ہے۔ تم ذرا جذبات
سے ہٹ کر سوچو' اس میں حرج ہی کیا ہے؟ ان دونوں کی زندگیاں بہتر ہو جائیں گی اور
بچوں کے حق میں تو بہت اچھا ہو گا۔"

"بچوں کے حق میں بہت برا بھی تو ہو سکتا ہے۔ سائرہ نے کہا۔ "سوتیلی ماں ....
اور سوتیلا باپ.........."

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہو گا۔" رئیس احمد نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے
کہا۔ "وہ دونوں ایک دوسرے کے بچوں کے سوتیلے ماں باپ نہیں ہوں گے بلکہ وہ ان
کے سگے تایا اور سگی چچی ہوں گے اور یہ مضبوط رشتہ تو پہلے سے موجود ہے۔"

سائرہ نے جب غیر جذباتی انداز میں اور ٹھنڈے دل سے اپنے شوہر کی اس تجویز پر
غور کیا تو اسے اس میں کوئی خرابی نظر نہیں آئی۔ واقعی یہ ایک بہتری کی صورت ہو سکتی
تھی اور اس کے نتیجے میں دونوں خاندان کے منتشر اجزا یکجا ہو سکتے تھے۔

لیکن اصل سوال یہی تھا کہ کیا اشرف اور سعدیہ اس کے لئے تیار ہو جائیں گے؟
سائرہ کا خیال تھا کہ اشرف تو شاید تیار ہو بھی جائے لیکن سعدیہ اس پر آمادہ نہیں ہو گی۔

سعدیہ جیسی عورت کو جس نے اپنے شوہر کو زندگی بھر اپنا آئیڈیل سمجھا تھا' دوسری شا
پر آمادہ کرنا آسان نہیں تھا۔ تاہم اس نے سوچا کہ وہ اپنی طرف سے کوشش ضرور کر
گی۔

اس نے سب سے پہلے تو چپکے چپکے اپنے والدین سے بات کی اور سلمیٰ نے تو فوراً
کہا کہ وہ خود بھی یہی سوچتی رہی ہے لیکن اپنی زبان پر ایسی بات لانے کی ہمت نہیں
رہی تھی۔

"پہلے اشرف سے بات کر لیتے ہیں۔" سائرہ نے کہا۔ "اگر اشرف تیار ہو جائیں
پھر سعدیہ سے بات کر کے دیکھیں گے۔ ویسے سب مل کر سعدیہ کو سمجھائیں گے تو شاید
یہ بات مان بھی لے۔ آدمی سب کچھ اپنی خوشی کے لئے نہیں کرتا بہت سے کام وہ ضرو
بھی کرتا ہے۔"

سائرہ نے اپنے والدین کی موجودگی میں اشرف کے سامنے جب یہ ذکر چھیڑا
اشرف بھونچکا سا رہ گیا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو آپا؟" اس نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ "سعدیہ مشرف کی بیو
ہے' میری بھاوج ہے۔ بہن ہے چھوٹی' یہ کس طرح ہو سکتا ہے اور میں .... میں
دوسری شادی کروں گا؟"

"سعدیہ مشرف کی بیوی تھی' مگر اب نہیں ہے بیٹا!" زاہد علی نے کہا۔ "مشرف
چکا ہے اور مرنے والے واپس لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔ تم اگر سعدیہ کا ہاتھ تھام لو گے
تم دونوں کے بچوں کے حق میں بہتر ہو گا۔ سعدیہ کے بیٹے کو باپ مل جائے گا اور تمہار
بچوں کو ماں مل جائے گی۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو۔"

کئی دن کے اصرار اور دلائل کے بعد سائرہ اشرف کو راضی کرنے میں کامیاب
گئی لیکن اس نے اشرف کو بتا دیا تھا کہ اس نے ابھی سعدیہ سے بات نہیں کی ہے اور ا
سارے معاملے میں آخری فیصلے کا دار و مدار سعدیہ کے رویے پر ہے۔

سعدیہ نے جب سائرہ کی زبان سے یہ تجویز سنی تو وہ بری طرح بھڑک اٹھی اور ا
نے فوراً ہی اسے مسترد کر دیا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ اس کی زندگی میں مشرف کی ج
اب کوئی نہیں لے سکتا۔

لیکن سائرہ نے اسے آہستہ آہستہ سمجھایا۔ وہ تنہا عورت تھی' ابھی جوان تھی' ا
کے سامنے ساری زندگی پڑی تھی' مظفر کو کسی مرد سرپرست کی ضرورت تھی' بے

سائل تھے' ایک تنہا عورت کے لئے ان سارے مسائل سے نمٹنا آسان نہیں تھا' اس
اج میں تو عورت کو قدم قدم پر مرد کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے اس کے بغیر زندگی
ی گاڑی کھینچنا کتنا دشوار تھا۔

سعدیہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور وہ بہت دیر تک روتی رہی۔ اس نے
سائرہ کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"سوچو' اچھی طرح سوچو میری پیاری بہن!" سائرہ نے اس کے آنسو خشک کرتے
ہوئے کہا۔ "یہ شادی ویسی شادی نہیں ہو گی جیسی تمہاری مشرف کے ساتھ ہوئی تھی۔ یہ
تو ایک ارینج منٹ کی بات ہے' ایک ایسا ارینج منٹ جس میں تمہاری اور اشرف کی اور تم
دونوں کے بچوں کی بھلائی ہے۔"

سعدیہ شاید اس ارینج منٹ پر کبھی تیار نہ ہوتی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ مظفر پر اس
کا بہت خراب نفسیاتی اثر پڑے گا۔ اس کی عمر اب گیارہ سال کے قریب تھی اور وہ بہت
سمجھدار لڑکا تھا۔ ساتھ ہی بہت حساس بھی اور ویسے بھی بچے ان معاملات میں بہت حساس
ہوتے ہیں لیکن اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس رات مظفر نے اس سے
کہا۔ "ممی! آپ تایا جان سے شادی کر لیجئے۔"

"کیا بکتے ہو؟" سعدیہ نے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے فضا میں
گولی داغ دی ہو۔

"میں نے پھوپھی جان کی باتیں سن لی ہیں۔" اس نے کہا۔ "وہ آپ سے جو کچھ
کہہ رہی تھیں ٹھیک کہہ رہی تھیں۔ آپ بہت اکیلی رہ گئی ہیں اور مجھے .... مجھے تو
تایا جان بہت اچھے لگتے ہیں۔ ابو تو مر چکے ہیں ممی! اب وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔"

سعدیہ سناٹے میں آ گئی۔ مظفر تو بالکل بالغوں کی طرح بات کر رہا تھا۔

"یہ کتنی غلط حرکت ہے تمہاری۔" اس نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "چھپ کر
اپنے بڑوں کی باتیں سننا' بہت ہی بری حرکت ہے۔ کیوں سنیں تم نے ہم لوگوں کی
باتیں؟"

"آپ رو رہی تھیں اور پھوپھی جان آپ کو سمجھا رہی تھیں۔" مظفر نے پرسکون
انداز میں جواب دیا۔ "بس اس لئے میں دروازے پر رک گیا اور آپ دونوں کی باتیں سننے
لگا۔ پھوپھی جان تو بہت اچھی ہیں ممی وہ کبھی غلط بات نہیں کرتیں۔ آپ ان کی بات مان
کیوں نہیں لیتیں؟"

سعدیہ کو محسوس ہوا جیسے وہ ایک بالغ اور سمجھدار آدمی سے مخاطب ہے جس سے وہ زندگی کے ٹھوس اور سنجیدہ مسائل پر بات چیت کر سکتی ہے۔ اس نے اس بات چیت کو آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا۔

"تم جانتے ہو ان ساری باتوں کا کیا مطلب ہے؟" اس نے کہا۔ "کیا تم تایا جان کو اپنے ابو کی جگہ قبول کر سکتے ہو؟"

"ابو تو ابو تھے ممی!" اس نے سادگی سے جواب دیا۔ "جو آدمی مر جائے اس کی جگہ کون لے سکتا ہے؟ مگر تایا جان بہت اچھے ہیں۔ ابو تو اب زندہ نہیں ہیں مگر تایا جان تو موجود ہیں۔"

سعدیہ نے پُر نم آنکھوں سے مظفر کی طرف دیکھا اور پیار سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔

رقیہ کی پہلی برسی کے چند ماہ بعد اشرف اور سعدیہ کی شادی ہو گئی۔ یہ شادی بہت ہی سادگی کے ساتھ ہوئی تھی اور کسی بھی اہتمام کے بغیر۔ سادہ طریقے سے نکاح پڑھا دیا گیا تھا۔ کوئی تقریب منعقد نہیں ہوئی تھی اور صرف بہت ہی قریبی لوگ اس موقع پر شریک ہوئے تھے۔

اشرف کا گھر کافی بڑا تھا۔ سعدیہ اور مظفر اسی گھر میں منتقل ہو گئے اور مشرف مرحوم کے مکان کو فی الحال کرائے پر اٹھا دیا گیا۔ اشرف نے اپنے ہی بینک کے ایک ملازم کو وہ مکان کرائے پر دے دیا۔ اس میں آئندہ کسی جھگڑے تنازعے کا امکان نہیں تھا اور جب بھی ضرورت ہوتی اس مکان کو بآسانی خالی کرایا جا سکتا تھا۔

سعدیہ شروع شروع میں بہت خوفزدہ تھی۔ اسے نہ صرف مظفر کی طرف سے ڈر لگتا تھا بلکہ وہ فردوس اور سہیل کی طرف سے بھی خائف تھی۔ وہ دونوں بڑی عمر کے بچے تھے۔ معلوم نہیں وہ اس کی جانب کیا رویہ اختیار کریں۔ وہ اس سے نفرت بھی تو کر سکتے تھے کیونکہ وہ ان کی مرحوم ماں کی جگہ لے رہی تھی۔

اگر وہ ان بچوں کے لئے بالکل اجنبی ہوتی اور اگر اشرف مظفر کے لئے بالکل اجنبی ہوتا تو یہ سارے خدشات درست بھی ثابت ہو سکتے تھے لیکن سب لوگ ایک دوسرے سے پہلے سے اچھی طرح واقف تھے۔ آپس میں گہرے دوستانہ مراسم تھے اس لئے کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہیں ہوئی۔

سعدیہ نے موجودہ صورت حال کو ضرورت اور حالات کا تقاضا سمجھ کر قبول کر لیا تھا

لیکن رفتہ رفتہ اس نئی زندگی نے اپنے حسن کو نکھارنا اور سنوارنا شروع کر دیا۔ اشرف اب اس کا شوہر تھا۔ اس نے اشرف کے ساتھ ایک نئی ازدواجی زندگی کا آغاز کر دیا تھا۔ ماضی کی درد انگیز پرچھائیاں آہستہ آہستہ سکڑتی سمٹتی اور چھوٹی ہوتی جا رہی تھیں۔ بالکل غیر محسوس طریقے پر چپکے چپکے اور اتنی ہی آہستگی کے ساتھ' اتنے ہی غیر محسوس طریقے پر وہ نئی زندگی کی نشاط انگیزیوں اور مسرت میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ گھر تھا' بچے تھے' شوہر تھا' شوہر کی محبت تھی اور ان سب چیزوں نے اپنا ایک راستہ متعین کر لیا تھا۔

اشرف کے ساتھ شادی کے دو سال بعد سعدیہ کے ایک بیٹا پیدا ہوا جو ان دونوں کی مشترکہ خوشیوں میں اضافے کا زبردست محرک ثابت ہوا۔ اب ان کے درمیان بھی گہرے اشتراک کی ایک جیتی جاگتی علامت موجود تھی' ان کا بیٹا۔ اشرف اور سعدیہ کا بیٹا انہوں نے اس کا نام شہاب رکھا۔

سعدیہ اور اشرف کی شادی کو آٹھ سال کا عرصہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گیا۔ ان کی شادی 1980ء میں ہوئی تھی اور اب 1988ء کا سال چل رہا تھا۔

ان آٹھ برسوں کے دوران ان کے حالات بہت بہتر ہو گئے تھے۔ اشرف اب بینک کا وائس پریذیڈنٹ بن چکا تھا۔ بہت اچھی تنخواہ تھی اور دیگر سہولیات بھی بہت تھیں۔ سعدیہ بھی اب اسکول میں ہیڈ مسٹریس تھی اور اب وہ بہت سینئر ہو چکی تھی۔ اس کی تنخواہ بھی بہت اچھی تھی۔

دونوں بڈھے بڑھیا باری باری اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ پہلے بڑی بی سدھاریں اور اس کے کوئی سال بھر کے بعد بڑے میاں بھی اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ دونوں نے اچھی خاصی عمریں پائیں اور بھرپور زندگی گزاری تھی۔

سائرہ کی سب سے بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی تھی اور اس کا بیٹا اس سال انجینئرنگ کا امتحان پاس کرنے والا تھا۔

سائرہ رئیس اور اشرف سب کے سب اپنی عمروں کی نصف صدی کو پورا کر کے آگے بڑھ چکے تھے۔ سعدیہ نصف صدی کی جانب پیش قدمی کر رہی تھی۔ ان سب کے بالوں میں سفیدی آ چکی تھی اور چہروں پر گزرے ہوئے ماہ و سال کی گرد کی تہیں جم گئی تھیں۔

اشرف اپنے خاندان کے ساتھ اب بھی اسی گھر میں رہتا تھا۔ خاصہ بڑا مکان تھا اور ان لوگوں کی ضرورت کے لئے کافی تھا۔ ویسے اس دوران اس نے بینک سے قرضہ لے کر

ایک اور مکان کی تعمیر شروع کروا دی تھی لیکن اس کی تکمیل میں ابھی وقت تھا۔

جو روایات ایک طویل عرصے سے چلی آ رہی تھیں وہ آج بھی باقی تھیں۔ مشرف علی کے انتقال، نیز اس کے ایک سال بعد رقیہ کے انتقال کے بعد ان روایات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا لیکن رقیہ کی پہلی برسی کے بعد جب اشرف اور سعدیہ کی شادی ہو گئی اور زندگی نے ایک نئی کروٹ لے لی تو پھر ان گم گشتہ روایات کو ایک بار پھر شروع کر دیا گیا۔ عید اور بقر عید کے موقعوں پر اسی طرح اجتماعات ہوتے تھے اور بچوں کی سالگرہ کی تقریبات بھی منائی جاتی تھیں۔

وہ 22 دسمبر 1988ء کی تاریخ تھی۔

آج ہی کی تاریخ تھی۔ آج سے پورے دس سال پہلے 1978ء میں مشرف علی کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ وہ فردوس اور سہیل کی سالگرہ کا دن تھا۔ اشرف اور رقیہ کے گھر سالگرہ کی تقریب منعقد ہو رہی تھی۔ مشرف اور اس کی بیوی سعدیہ اور بیٹے مظفر کو اس تقریب میں شرکت کرنی تھی لیکن وہ لوگ شریک نہیں ہو سکے تھے۔ مشرف کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اور پھر اس کے بعد مشرف کبھی ہوش میں نہیں آیا تھا۔ وہ بچ گیا تھا لیکن دیوانگی کے عالم میں گھر سے نکل گیا اور تین ماہ کے بعد وہ لانڈھی ریلوے اسٹیشن کے قریب ٹرین سے کٹ کر ہلاک ہو گیا۔ دس سال ہو چکے تھے۔

یہی سالگرہ کا دن تھا، یہی موسم تھا۔ یہی دسمبر کا مہینہ تھا اور اب اس اندوہناک سانحے کو پورا دس سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔

آج پھر فردوس اور سہیل کی سالگرہ کا دن تھا۔ مشرف علی کا ایکسیڈنٹ اور اس کی موت اب ماضی کی داستان بن چکے تھے۔ سعدیہ نے اگر دوسری شادی نہ کر لی ہوتی تو شاید یہ درد کچھ زیادہ شدت کے ساتھ اس کے دل میں موجود رہتا لیکن ایک نئی زندگی میں ڈھل جانے کے بعد تو اب یہ سب کچھ ایک قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔

آج کی اس تقریب میں ایک نیا مہمان بھی شامل تھا اور وہ تھا رئیس احمد اور سائرہ کا داماد۔ سائرہ کی بیٹی کی شادی کو ابھی سال بھر نہیں ہوا تھا۔

سارے لوگ ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ کیک کاٹا جا چکا تھا۔ ڈرائنگ روم قہقہوں اور چہچہوں سے گونج رہا تھا۔ کچھ دوسرے مہمان بھی مدعو تھے جو سب کے سب ایک دوسرے سے بے تکلف تھے بڑی دوستانہ فضا اور خوشگوار ماحول تھا۔

کھانا تقریباً تیار تھا۔ میز لگائی جا چکی تھی اور سعدیہ جو باورچی خانے میں تھی، وہاں سے

نکل کر ڈرائنگ روم میں آئی تاکہ مہمانوں کو کھانے کے کمرے میں چلنے کے لئے مدعو کرے۔

لیکن ابھی اس نے ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک ہڑبونگ مچ گئی۔

لمبی سفید داڑھی والا، ایک دبلا پتلا مریل سا فقیر اچانک ہی ڈرائنگ روم میں اندر گھستا چلا آیا۔ اس کے بدن پر ایک بہت ہی اونچا اور میلا کرتہ اور ایک پاجامہ تھا۔ کرتے پر وہ ایک پرانا سوئٹر پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کندھے پر ایک پرانا سا کمبل پڑا ہوا تھا۔

وہ فقیر سیدھا بلا کسی روک ٹوک کے اندر آیا اور ڈرائنگ روم میں کھڑا ہو کر حیران حیران نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

"ارے .... ارے پاگل اندر گھس آیا۔" "ارے کون ہے تو! نکل باہر نکل۔"

"اندر کیسے گھس آیا؟ نکالو اسے باہر۔" "کیا گیٹ کھلا ہوا تھا؟ کیا مصیبت ہے؟ پاگل اندر گھستے چلے آ رہے ہیں۔" بہت سی آوازوں کا شور برپا تھا اور اسی وقت رئیس احمد جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھا، اس نے اُس قابلِ رحم دیوانے فقیر کا کمزور سا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور نرمی سے اس سے بولا۔ "جاؤ بابا! باہر جاؤ، تمہیں کھانا باہر ہی مل جائے گا۔"

☆======☆======☆

اس رات مشرف علی کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی تھی۔ نیند کیا ہے، بیداری کیا ہے، اسے اب اس بات کا کوئی علم نہیں تھا۔ زندگی کے بیشتر تصورات اس کے لئے ختم ہو چکے تھے۔ بس کچھ جبلی قوتیں باقی تھیں۔ وہ بھوک پیاس محسوس کر سکتا تھا۔ ضروریات کا احساس کر سکتا تھا اور اس کے آگے اس کا دماغ کام نہیں کرتا تھا۔

اب وہ کچھ بھی کرتا تھا، اس میں اس کے قصد، ارادے اور شعور کو کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ وہ شعور سے محروم ہو چکا تھا۔ اس رات بستر پر لیٹے لیٹے وہ اچانک اٹھ بیٹھا۔ اس نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولا، پھر کوریڈور کا دروازہ کھول کر برآمدے میں آیا اور وہاں سے گھر کے احاطے میں آ گیا۔

کچھ دیر تک تو وہ احاطے میں ٹہلتا رہا۔ پھر اس نے گیٹ کی کھڑکی کھولی اور باہر نکل گیا۔ اس نے کھڑکی کو اسی طرح کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے گرد و پیش سے، خود اپنے وجود سے، اپنے آپ سے بے نیاز، اس نے سڑک پر چلنا شروع کر دیا۔

مکمل خود فراموشی کی ایک رَو تھی جو اسے اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہی تھی۔ اگر

اس میں سوچنے کی قوت ہوتی تو اسے معلوم ہوتا کہ اس وقت رات کے ساڑھے بارہ بج
رہے ہیں اور وہ فیڈرل بی ایریا کی مین روڈ پر آ چکا ہے۔ سڑک پر اس وقت بھی اچھا خاصا ٹریفک
تھا اور راہ گیروں کی بھی کافی تعداد موجود تھی۔

اپنی بے خودی کے عالم میں چلتا چلتا وہ دس نمبر لالو کھیت اور پھر وہاں سے ڈاک
خانے تک پہنچ گیا۔ خاصہ لمبا راستہ طے کر کے آیا تھا۔ ڈاک خانے پر اس وقت بہت سی
خالی بسیں کھڑی ہوئی تھیں۔

وہ سب سے پیچھے والی بس میں داخل ہو گیا اور ایک سیٹ پر گٹھڑی کی طرح بن کر بیٹھ
گیا۔ بس کے اندر کوئی نہیں تھا۔ بس خالی تھی اور اس میں گہرا اندھیرا تھا۔ مگر مشرف علی
کے لئے اندھیرے اور اجالے کا اب کوئی مطلب نہیں تھا۔ اس کے لئے تو ہر طرف
صرف ایک بے نام خلا تھا۔

رات کے پچھلے پہر احمد حسن ڈرائیور نے بس اسٹارٹ کی۔ کنڈکٹر اس کے ساتھ تھا
لیکن وہ بھی گاڑی کے اگلے حصے میں بیٹھا ہوا تھا کیونکہ بس مسافروں کو لے کر نہیں جا رہی
تھی۔ بس اس وقت سیدھی کیماڑی جا رہی تھی اور وہاں سے علی الصباح اسے اپنا ٹرپ
شروع کرنا تھا۔ منوڑہ سے آنے والے مسافروں کی بڑی تعداد صبح تڑکے سے پہنچنا شروع
ہو جاتی تھی۔

مشرف علی کی آنکھ تھوڑی دیر بعد کھل گئی۔ بس اس وقت چل رہی تھی۔ وہ اسی
طرح گٹھڑی بنا پڑا رہا اور پھر بس کیماڑی کے آخری اسٹاپ جا کر رک گئی۔ مشرف علی بس
سے اتر گیا۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر نے اسے دیکھا تک نہیں۔

کون سی جگہ تھی، کیا وقت تھا، مشرف علی کے لئے ان ساری باتوں کے کوئی معنی
نہیں تھے۔ وہ زمان و مکاں سے، علم اور لاعلمی سے، ہونے اور نہ ہونے کے احساس سے
ہر چیز سے مکمل طور پر عاری ہو چکا تھا۔ بس کچھ غیر ارادی حرکات تھیں جو انجانے اور
نامعلوم محرکات کے ذریعے اس سے سرزد ہوتی تھیں۔

وہ خاموشی میں ڈوبے ہوئے نیم تاریک علاقے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگا۔ کس
نے اسے دیکھا، کسی نے نہیں دیکھا۔ بہرحال جانے کس طرح گارڈز اور سیکورٹی والوں کی
نام نہاد موجودگی کے باوجود وہ ایک برتھ کے پاس جا پہنچا۔

یہاں ایک مال بردار جہاز موجود تھا جس میں لوڈنگ اور ان لوڈنگ کا سارا کام تقریباً
ختم ہو چکا تھا۔ کچھ تھوڑا سا کام باقی رہ گیا تھا اور آج صبح کو جہاز کو یہاں سے روانہ ہونا

تھا۔ جہاز کی پہلی منزل بمبئی تھی۔

مشرف علی نے اپنے آپ کو کسی کی نظروں سے چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔
اس کا کوئی بھی قدم شعوری نہیں تھا۔ وہ تو کسی نامعلوم قوت محرکہ کے تحت اِدھر سے
اُدھر گھوم رہا تھا اور پھر وہ علی الصباح اس جہاز میں داخل ہو گیا جو تھوڑی دیر کے بعد لنگر
اٹھانے والا تھا۔

اسے کسی نے نہیں دیکھا اور کہیں بھی اسے چیک نہیں کیا گیا۔ وہ ممنوعہ علاقہ میں
داخل ہوا اور پھر جہاز کے اندر تک پہنچ گیا اور کہیں بھی وہ کسی کی نظروں میں نہیں آیا۔ وہ
کن کن راستوں سے گزرا، کہاں کہاں سے ہو کر آیا اسے یہ سب کچھ نہیں معلوم تھا اور
اب وہ کہاں ہے، کس جگہ ہے، کیوں ہے، اس سب سے بھی وہ بے بہرہ تھا۔

وہ جہاز میں جانے کے بعد سامان کے ایک ڈھیر کے پیچھے لیٹ گیا اور سو گیا۔ اس کی
دنیا میں تو اب بے خبری کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

اس روز دوپہر کے دو بجے کے بعد ہی جہاز پر ایک پُراسرار اجنبی کی خفیہ موجودگی کا
علم ہو سکا جب جہاز کراچی کی بندرگاہ کو بہت پیچھے چھوڑ کر بین الاقوامی سمندر میں سفر کر رہا
تھا۔

جہاز میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ پُراسرار مشتبہ اجنبی کو سب سے پہلے ایک خلاصی
نے دیکھا تھا جو اس طرف کسی کام سے گیا تھا۔ مشرف علی اس وقت ایک ڈرم سے ٹیک
لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ خلاصی نے اسے دیکھا اور حیران ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ اسے تعجب
تو اس بات پر ہو رہا تھا کہ اس شخص نے اسے دیکھنے کے بعد قطعی کسی ردعمل کا اظہار
نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ پر اسی طرح خاموشی سے بیٹھا رہا تھا اور خلاصی کو اپنی خالی خالی
آنکھوں سے دیکھتا رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" خلاصی نے اس سے چلا کر انگریزی میں سوال کیا لیکن مشرف نے
اس کو کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی بے خبری اور خودفراموشی اس سوال کے جواب کی
متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔

اسے فوراً ہی پکڑ لیا گیا۔ خلاصی نے کئی اور لوگوں کو بلا لیا تھا۔ مشرف علی نے قطعاً
کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اسے جہاز کے کپتان کے سامنے پیش کیا گیا جس کا تعلق تھائی لینڈ
سے تھا۔ جہاز پرتگال کی ایک کمپنی کا تھا اور اسے سوویت یونین کی بندرگاہ ولادی ووستک کا
ٹرپل سفر کرنا تھا۔

"اس کی تلاشی لو۔" کپتان نے مشرف علی کو گھورتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا
اور مشرف علی کا ننگا جھاڑا کیا گیا۔ اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں نکلا۔ حد تو یہ تھی کہ
اس کی جیبوں سے ایک پیسہ بھی برآمد نہیں ہوا۔

"کون ہو تم؟" کپتان نے اس سے انگریزی میں سوال کیا۔ "جاسوس، تخریب کار،
چور، تم جہاز کے اندر کیسے آ گئے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" مشرف علی نے آہستہ سے جواب دیا۔ اس کی خالی خالی
آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ کپتان اور دوسرے افسران جن میں جہاز کے ڈاکٹر بھی
شامل تھے، مشرف علی سے کوئی دو گھنٹے تک جرح کرتے رہے اور اس کے بعد وہ اس نتیجے
پر پہنچ گئے کہ یہ شخص پاگل ہے اور کسی نہ کسی طرح عملے کی غفلت کے باعث جہاز کے
اندر داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس شخص کا بے ضرر ہونا اس بات سے بھی
ثابت تھا کہ اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا تھا۔ اس کے کپڑے بھی میلے ہو رہے
تھے اور داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سوتے سے اٹھ کر چلا آیا ہو۔

کپتان کے حکم سے اسے ایک چھوٹے سے کیبن میں بند کر دیا گیا اور کپتان نے
اپنے دوسرے افسروں سے اس تازہ مصیبت کے بارے میں بات بھی کی۔

"وہ غیر قانونی طور پر ہمارے جہاز میں گھس آیا ہے۔" اس نے کہا۔ "وہ کراچی کی
بندرگاہ پر جہاز میں گھسا ہے اور ظاہر ہے کہ اب ہم اسے واپس کراچی چھوڑنے تو نہیں جا
سکتے اور ہم دنیا کی کسی بھی بندرگاہ پر اسے نہیں اتار سکتے۔ کوئی اسے قبول نہیں کرے گا۔
اس مصیبت کا ہم کیا کریں؟ بمبئی میں اسے ریڈ کراس کے حوالے کریں؟ یا کسی اور بین
الاقوامی تنظیم سے رابطہ قائم کریں؟"

"اس معاملے میں کوئی ہماری مدد نہیں کرے گا سر!" فرسٹ انجینئر نے کہا۔ "غلطی
تو ہماری ہے۔ ہمارے اسٹاف کی غفلت سے وہ جہاز کے اندر گھس آیا۔ کسی بھی ملک کا
امیگریشن کا عملہ اسے اپنی سرزمین پر قدم نہیں رکھنے دے گا۔ ہمیں اسے اپنے ساتھ
ساتھ لئے ہوئے پھرنا ہو گا۔"

"مگر یہ ناممکن ہے۔" کپتان نے کہا۔ "وہ ایک پاگل ہے۔ ہم اس کی کہاں تک
حفاظت کریں گے؟ وہ کوئی نقصان پہنچانے والی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ وہ ہم سب لوگوں
کے لئے اور جہاز کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہمیں اس کا کوئی علاج سوچنا
چاہئے۔"

"علاج تو موجود ہے، بشرطیکہ آپ اتفاق کریں۔" فرسٹ انجینئر نے معنی خیز انداز
میں کہا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" کپتان نے مشتبہ انداز میں کہا۔ "کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ
ہم اسے سمندر میں پھینک دیں؟"

"بالکل نہیں۔" فرسٹ انجینئر نے مسکرا کر کہا۔ "ہم قاتلوں میں شامل نہیں ہونا
چاہتے۔ ایک اور بھی ترکیب ہے۔ یہ غیر قانونی طور پر ہمارے جہاز میں داخل ہوا ہے۔ ہم
بھی غیر قانونی طور پر اسے نکال باہر کریں۔ اگر ہم اس کی قانونی منتقلی کے چکر میں پڑ گئے تو
بڑے مسائل پیدا ہوں گے۔ وہ خود تو پاگل ہے۔ اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ ہم
اسے خاموشی سے بمبئی کی بندرگاہ پر چھوڑ دیں۔ اس کے بعد وہ جانے اور بمبئی پورٹ کے
حکام۔ ہماری کیا ذمہ داری ہے؟ وہ خود تو یہ نہیں بتا سکے گا کہ وہ کس طرح بمبئی پہنچا اور
اگر بالفرض، اس نے ہمارے جہاز کے بارے میں بتایا بھی تو ہم صاف انکار کر دیں گے۔ کسی
کے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ ہمارے جہاز سے بمبئی آیا تھا؟"

"ہاں، تمہاری بات تو ٹھیک ہے۔" کپتان نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "اس بلا سے
نجات حاصل کرنے کا یہ ایک آسان راستہ ہے۔ ٹھیک ہے، ہم اسے بمبئی میں چپکے سے
چھوڑ دیں گے لیکن یہ سارا کام بہت احتیاط سے کرنا ہو گا۔ بمبئی کی بندرگاہ پر جہاز کے
برتھ پر لگتے ہی کسٹم والے آن پہنچیں گے۔ ہمیں ان کی نظروں سے اس کو بچانا ہو گا۔"

"تھوڑی دیر کی بات ہے۔" کسی اور نے کہا۔ "کوئی نہ کوئی بندوبست کر لیں گے اور
اگر کسٹم والوں نے اسے دیکھ بھی لیا تو پھر مجبوری ہے۔ پھر ہم اسے بمبئی میں، اتار نہیں
سکیں گے۔"

چنانچہ مشرف علی کو ایک کیبن میں بند کر دیا گیا اور اس کی سختی کے ساتھ نگرانی کی
جاتی رہی۔ بمبئی پہنچنے تک یہی صورت حال رہی۔ اسے کھانا پانی کیبن میں ہی دے دیا جاتا
لیکن مشرف علی نے خود بھی کبھی کیبن سے باہر آنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے جہاز
میں کوئی تشدد آمیز کارروائی نہیں کی اور سارا وقت بالکل پُرسکون رہا۔ اسے تو کچھ بھی خبر
نہیں تھی کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے، وہ کہاں ہے اور کہاں جا رہا ہے اور آگے کیا
ہونے والا ہے۔ اس کے لئے تو وقت، فاصلہ، مقام سب کچھ بے معنی ہو گیا تھا۔

جہاز بمبئی پہنچا تو پہلے ہی سے ضروری تیاریاں کر لی گئی تھیں۔ کسٹم کے عملے کی
نظروں سے کسی نہ کسی طرح اس پاگل آدمی کو بچایا گیا جو نہ جانے کس طرح کراچی کی

بندرگاہ سے جہاز میں گھس آیا تھا۔

کپتان نے عملے کو ضروری ہدایات دے دی تھیں اور عملے کے تمام لوگ کپتان کے ساتھ پورا پورا تعاون کر رہے تھے۔ کسٹم والے جب اپنی ضروری کارروائیاں کرنے کے بعد جہاز پر سے واپس چلے گئے تو کپتان نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس رات اس نامعلوم پاگل کو خاموشی سے جہاز سے باہر نکال دیا گیا۔ پاگل نے کوئی مزاحمت نہیں کی' نہ شور مچایا' نہ جہاز سے اترنے سے انکار کیا۔ اس نے تو زبان سے بھی کچھ نہیں کہا اور نہ یہ پوچھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ اس کو باہر نکال دینے کے بعد جہاز کا عملہ پوری طرح چوکس تھا اور اس کو واپس آنے سے روکنے کے لئے تیار تھا۔

لیکن نامعلوم پاگل واپس نہیں آیا۔ اس نے تو پلٹ کر جہاز کی طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور پھر بہت دور جانے کے بعد تاریکی میں گم ہو گیا۔

اسی رات کے پچھلے پہر بمبئی پورٹ کے حکام نے مشرف علی کو مشتبہ انداز میں ممنوعہ علاقے میں گھومتے ہوئے گرفتار کر لیا اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ اسے تھانے لے جایا گیا جہاں پولیس افسر رام دیال اور اس کے نائب گوری شنکر نے اس سے پوچھ گچھ کی۔

"پاکستانی ہو؟" پولیس افسران مشرف علی کو شلوار قمیض اور پاؤں میں پشاوری چپل کو دیکھ کر پہلے ہی بآسانی اس کی قومیت کا اندازہ لگا چکے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ شخص پاکستانی جاسوس ہے۔

مشرف علی نے اس کے سوال کا جوئی جواب نہیں دیا اور خالی خالی' پھیلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پولیس افسر رام دیال نے کئی بار اپنا سوال دہرایا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے مشرف علی اس کی بات سن ہی نہیں رہا ہے۔ وہ بے نیازی اور غائب دماغی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

"مجھے تو یہ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔" گوری شنکر نے کہا۔ "ذرا اس کی شکل تو دیکھئے۔"

"یہ بنا ہوا پاگل بھی ہو سکتا ہے۔" رام دیال نے کہا۔ "تخریب کاروں اور جاسوسوں کے لئے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرنا عام بات ہے۔ اس کی تلاشی کے دوران اس کے پاس سے کچھ بھی نہیں ملا۔ ایک کاغذ کی چٹ بھی نہیں اور ایک پیسہ بھی نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی ٹھکانہ موجود ہے۔ کوئی نہ کوئی رابطہ موجود

ہے۔ آخر آدمی بالکل خالی جیب تو نہیں نکل کھڑا ہو گا اور پھر یہ بالکل صاف پاکستانی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ بھی نہیں.........."

پولیس والوں نے ایک ہفتے تک مشرف علی کو اپنی تحویل میں رکھا اور اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ انہوں نے مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا۔ مشرف علی چیخ چیخ کر بڑے دردناک انداز میں رویا اس کی دل دہلا دینے والی' بے بس اور کرب میں ڈوبی ہوئی چیخوں سے انٹروگیشن سیل کے در و دیوار تھرا اٹھے لیکن پولیس والے اس سے کچھ بھی نہ معلوم کر سکے۔ مشرف علی کو اپنے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ نام' پتا' نشان' قومیت' خاندان کچھ نہیں' کچھ نہیں۔ اس کا ذہن بالکل خالی تھا۔

بالآخر اسے تفصیلی طبی معائنے کے لئے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کے حوالے کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنے کے بعد اسے مکمل طور پر پاگل قرار دے دیا۔

"حیرت ہے۔" پولیس افسر نے کہا۔ "اگر یہ پاگل ہے تو یہ بمبئی کیسے پہنچا ہے؟ اس کا لباس صاف بتا رہا ہے کہ یہ پاکستان سے آیا ہے۔ اس کا شلوار سوٹ بہترین امپورٹڈ کپڑے کا ہے۔ یہ کپڑا یہاں نہیں ملتا۔ اس کی قمیض میں اندر کی طرف درزی کی دکان کا اردو میں لکھا ہوا لیبل سلا ہوا ہے' علی برادرس ٹیلرز' اور اس پر چھ ہندسوں والا فون نمبر بھی درج ہے۔ یہ پاکستانی پاگل بمبئی کیسے آ گیا؟"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ شخص کراچی سے بمبئی آتے وقت پاگل نہ ہو۔" کسی اور نے کہا۔ "ویزا پر بمبئی آیا ہو اور یہاں آ کر اچانک پاگل ہو گیا ہو۔ اس صورت میں اس کے لواحقین ضرور اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔"

مشرف علی کو فی الحال جیل بھیج دیا گیا۔ اس پر غیر قانونی طور پر ہندوستان آنے کا الزام تو بہرحال تھا ہی۔ اگر اس کے لواحقین اس کی تلاش میں آتے تو پھر صورتِ حال کی وضاحت ہو سکتی تھی۔

لیکن بمبئی کے کسی تھانے میں پاکستان سے آنے والے کسی شخص کی گمشدگی کی رپورٹ درج نہیں کرائی گئی اور نہ ہی نامعلوم پاگل کے کسی عزیز کا کوئی پتا چل سکا۔ وہ بے یار و مددگار' بے آسرا' بے سہارا بمبئی کی ایک جیل کے پاگل وارڈ میں بند تھا۔

مشرف علی کے لئے وقت تھم گیا تھا لیکن وقت تو کسی کے لئے نہیں تھمتا۔ وقت کے شعور سے بے نیاز ہو جانے والا ذہن وقت کی گزران کو محسوس تو نہیں کرتا لیکن وقت تو بہرحال گزرتا ہے۔ گزرتا رہتا ہے' ہر وہ لمحہ جو گزر جاتا ہے' وہ ہمیشہ کے لئے مر جاتا ہے

اور آنے والے لمحات کے لئے جگہ خالی کر جاتا ہے۔

مشرف علی کو جیل کے پاگل وارڈ میں پانچ سال کا عرصہ گزر گیا۔ اس کا کوئی پُرسا حال نہیں تھا۔ کسی کو اس کا نام نہیں معلوم تھا۔ خود اسے بھی نہیں اور اس کی شناخت علامت صرف وہ نمبر تھا جو جیل میں اسے الاٹ کیا گیا تھا۔ نمبر انیس۔ مشرف علی اب ہر کیلئے صرف نمبر انیس تھا۔

اس کی عمر اس وقت 47 سال کے قریب تھی لیکن اس کے سر کے زیادہ تر با سفید ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر بھی داڑھی اُگی ہوئی تھی جس کے تقریباً سارے با سفید تھے اور ان میں کہیں کہیں کالے بالوں کی جھلک نظر آتی تھی۔

پھر ایک روز قیدیوں کی فلاح کے ایک ادارے کے کچھ اراکین نے جیل کا دورہ اور یہ لوگ پاگل وارڈ بھی آئے۔ انہوں نے یہاں بند قیدیوں کے انفرادی کوائف واقفیت حاصل کی اور مشرف علی کا پورا کیس بھی انہیں معلوم ہوا۔ اس نامعلوم شخص اس کے علاوہ اور کوئی الزام نہیں تھا کہ وہ بمبئی پورٹ کے ممنوعہ علاقے میں غیر قانونی ط پر داخل ہو کر مشتبہ انداز میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ اس کے بارے میں خیال تھا کہ پاکستانی ہے اور غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہوا ہے لیکن اس سلسلے میں ک ٹھوس ثبوت موجود نہیں تھا۔

ادارے کی سفارش سے کئی پاگل اور نیم پاگل قیدیوں کے کیسوں پر نظرثانی کی اور انہیں رہا کر دیا گیا۔ ان میں نمبر انیس بھی شامل تھا اور پھر نمبر انیس کو علاج کے پاگل خانے پہنچا دیا گیا۔

پاگل خانے کے ڈاکٹروں نے نمبر انیس کا تفصیلی معائنہ کیا۔ جدید ترین مشینوں ذریعے اس کے دماغ کا ٹیسٹ کیا گیا اور ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچے کہ اس کا علاج ممکن اگرچہ یہ ایک طویل علاج ہو گا۔

پاگل خانے میں آنے کے بعد مشرف علی کا نمبر بدل گیا۔ اب اس کا نمبر پچانو تھا۔ یہ ایک نئی شناختی علامت تھی جو یہاں اس کے حصے میں آئی تھی۔

میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر سریش ناتھ پاٹل اس پاگل خانے کا انچارج تھا۔ اس ساتھ دماغی امراض کے ماہرین کی ایک ٹیم تھی جو یہاں کام کرتی تھی۔ ڈاکٹر پاٹل ایک رسیدہ اور بہت تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔ میڈیسن میں گریجویشن کرنے کے فوراً بعد وہ باہر چلا تھا اور اس نے سائی کیٹری اور نیورولوجی کی اعلیٰ تعلیم بیرونی ممالک میں حاصل کرنے

علاوہ ایک طویل عرصے تک ملک سے باہر طبی خدمات بھی انجام دی تھیں اور اب گزشتہ پندرہ سال سے وہ اس جگہ کام کر رہا تھا۔ اس طویل مدت کے دوران بہت سے مریض اس کی ذراتی کوششوں سے شفایاب ہوئے۔

ڈاکٹر پاٹل کی ایک بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے مریضوں کے ساتھ ایک قسم کی ذاتی وابستگی پیدا کر لیتا تھا۔ وہ ہر کیس کو ایک چیلنج کیس سمجھ کر قبول کرتا تھا اور جب کوئی مریض اس کی بے لوث اور مخلصانہ پیشہ ورانہ مساعی کے نتیجے میں شفایاب ہو جاتا تھا تو ڈاکٹر پاٹل یہ محسوس کرتا تھا کہ دنیا میں اس کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی اور کوئی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر پاٹل نے نمبر پچانوے کی پوری فائل کا بغور مطالعہ کیا اور اسے یہ کیس بہت دلچسپ معلوم ہوا۔ "احمق' عقل سے پیدل پولیس والے۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ پاکستانی جاسوس ہوتا تو شلوار سوٹ میں وہاں گھوم رہا ہوتا؟ اسے تو دھوتی کُرتے میں' یا پھر پتلون قمیض میں ہونا چاہئے تھا۔ بھگوان جانے کون ہے .... اپنا نام تک نہیں جانتا۔"

اور پھر ڈاکٹر پاٹل اور اس کی ٹیم نے مشرف علی کا علاج شروع کر دیا۔ طویل' تکلیف دہ' اور صبر آزما علاج۔ نمبر پچانوے خطرناک قسم کا پاگل نہیں تھا اور وہ کبھی وائلنٹ نہیں ہوتا تھا۔ فرماں بردار تھا۔ بات مان لیتا تھا۔ مزاحمت نہیں کرتا تھا اور دوا بھی کھا لیتا تھا۔ اس کے علاج میں کسی بڑی دشواری کا سامنا نہیں تھا۔ کیونکہ وہ آسانی سے قابو میں آ جاتا تھا۔

دواؤں کے علاوہ اصل علاج تو الیکٹرک شاکس کے ذریعے ہو رہا تھا۔ نمبر پچانوے کے سوئے ہوئے' کھوئے ہوئے دماغ کو بیدار کرنے کے لئے اسے یہ جھٹکے دینے ضروری تھے۔

آج سے پانچ سال پہلے حادثے کا شکار ہونے کے بعد اب پہلی بار مشرف علی کو صحیح علاج میسر آیا تھا۔ کراچی کے ڈاکٹر تو اس کے پاگل پن کا علاج شروع بھی نہیں کر پائے تھے کہ وہ گھر سے نکل بھاگا اور تقدیر کے طوفانی تھپیڑوں نے اسے حیرت انگیز طور پر بمبئی پہنچا دیا جہاں اس کی زندگی کے پورے پانچ سال جیل میں گزر گئے۔

لیکن اسے تو کچھ بھی نہیں معلوم تھا۔ کیا تھا؟ کیا ہے؟ کیا ہو گا؟ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ زمان و مکاں اس کے لئے ایک بے معنی لاشیئت (Nothingness)

کے سوا کچھ نہیں تھے۔

ایک سال گزرا، دوسرا سال گزرا، تیسرا سال گزرا، چوتھا سال گزر رہا تھا اور اب نمبر پچانوے کو پاگل خانے میں پانچواں سال شروع ہونے والا تھا۔

ڈاکٹر پاٹل اور اس کے رفقائے کار کی کوششیں جاری تھیں۔ ڈاکٹر پاٹل بہت پُرامید تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مریض معالجوں کے ساتھ کو آپریٹ کرتا تھا۔ وائلنٹ نہیں ہوتا تھا۔ اسے دوائیں انجکشن، شاکس، سب کچھ دینا آسان تھا اور اس طرح نمبر پچانوے کا علاج جاری رہا۔

اپنے گھر سے نکلے ہوئے مشرف علی کو تقریباً نو سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس عرصے کے دوران اس کی حالت بالکل بدل کر رہ گئی تھی۔ اس کا جسم جو آج سے نو سال پہلے ایک خوبصورت، تندرست و توانا اور زندگی کی حرارت سے بھرپور جسم تھا اب سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ سارے بال سفید ہو گئے تھے۔ چہرے اور پیشانی پر گہری جھریاں نمودار ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور سر کے بہت سے بال جھڑ گئے تھے۔ دیکھنے والا اب مشرف علی کو پہچان بھی نہیں سکتا تھا، وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔

اس روز پاگل خانے میں دو پاگل آپس میں لڑ پڑے۔ نمبر پچانوے کا اس لڑائی سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے وہ ان کے بیچ میں آ گیا۔ ایک پاگل نے اسے زور سے دھکا دے دیا اور نمبر پچانوے اس طرح زمین پر گرا کہ اس کا سر ایک گملے سے جا ٹکرایا۔ اس کے بہت زور کی چوٹ لگی اور سر میں سے خون بہنے لگا۔ نمبر پچانوے بے ہوش ہو گیا۔

اسے فوراً وہاں سے لے جایا گیا اور اس کی دیکھ بھال شروع کر دی گئی۔ ڈاکٹر پاٹل خود بھی اس وقت وہاں موجود تھا۔ اس نے مریض کے سر کی چوٹ کا معائنہ کیا۔ خاصہ گہرا زخم تھا لیکن خطرناک نہیں تھا۔ مریض کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کوئی دو گھنٹے تک بے ہوش رہنے کے بعد نمبر پچانوے کو ہوش آ گیا۔

مشرف علی کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو ہسپتال کے ایک کمرے میں پایا۔ وہ بستر پر پڑا ہوا تھا اور اسے اپنے سر میں تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔

اس نے ایک نرس کو دیکھا جو سامنے ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ مشرف علی رسالے کے سرورق کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس پر جو نام لکھا ہوا تھا وہ کسی ایسی زبان میں تھا جس کے رسم الخط سے مشرف علی بالکل واقف نہیں تھا۔ یہ پاکستان کی کسی

بھی زبان کا رسم الخط نہیں تھا۔ گجراتی کا بھی نہیں اور نرس سفید شلوار قمیض کے بجائے سفید اسکرٹ اور بلاؤز پہنے ہوئے تھی اور نہ جانے وہ کون سے ہسپتال میں تھا۔

"اف میرے خدا، یہ کیا ہو گیا؟" اس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ "نہ جانے میں کتنی دیر سے زخمی اور بے ہوش پڑا ہوا ہوں۔ خدا جانے گھر والوں کو بھی اطلاع مل گئی یا نہیں۔ میں نے تو سعدیہ سے پانچ بجے تک واپس آ جانے کو کہا تھا۔ آج بھائی جان کے بچوں کی سالگرہ ہے۔ وہاں سب لوگ جمع ہوں گے۔ ستیاناس ہو جائے اس منحوس ڈرائیور کا۔ اندھا کم بخت سؤر کی اولاد۔ اس نے تو میرے اوپر بس چڑھا دی۔ ہاں مگر میں زندہ ہوں۔ میں زندہ تو ہوں، بچ گیا، شاید بہت زیادہ چوٹ نہیں آئی۔"

خیالات کی رو تیزی سے اس کے دماغ میں دوڑ رہی تھی۔

"جانے کیا بج گیا ہو گا؟" اس نے سوچا۔ "کوئی گھر والا نظر نہیں آ رہا۔ شاید .... باہر کوئی .... سسٹر۔" اس نے آہستہ سے نرس کو آواز دی اور نرس فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ گہری سانولی رنگت اور تیکھے نقوش والی ایک عورت تھی۔

"ہاں .... بولو۔" نرس نے بڑی نرمی سے اس سے کہا۔

"کیا میرے لواحقین میں سے کوئی یہاں موجود ہے؟" اس نے صاف واضح اور ٹھہری ہوئی آواز اور لب و لہجے میں پوچھا۔

"کیا؟" اجنبی اور نامانوس زبان کا رسالہ نرس کے ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ "کون موجود ہے؟" اس نے نمبر پچانوے کو آج تک اتنے صاف لب و لہجے میں اور ایسی زبان بولتے ہوئے نہیں سنا تھا۔

"میرا مطلب ہے سسٹر کیا میرے گھر والوں میں سے کوئی یہاں موجود ہے؟" اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔ "کیا میرے گھر والوں کو میرے ایکسیڈنٹ کی اطلاع ہے؟ مجھے یہاں کون لایا تھا؟"

حیرت زدہ نرس اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھی اور اس پر ایک ہیجانی کیفیت طاری ہو رہی تھی۔

"تم کہاں رہتے ہو؟ تمہارا گھر کہاں ہے؟ نام کیا ہے تمہارا؟" نرس نے نرمی سے پوچھا اور مشرف علی کو اس کا اندازِ تخاطب بہت بُرا لگا۔ بڑی بدتمیز نرس تھی۔ "آپ" کے بجائے "تم" کر کے بات کر رہی تھی اور اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے خود اس سے الٹے سیدھے سوال کر رہی تھی۔ تاہم اس نے اپنے غصے کو ضبط کیا۔

"مشرف علی میرا نام ہے۔" اس نے کہا۔ "فیڈرل بی ایریا میں رہتا ہوں۔ گرومندر پر میرا بس سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا.......... پلیز.......... ذرا معلوم کر کے بتایئے کہ میرے گھر والوں کو میرے بارے میں اطلاع ہو سکی ہے یا نہیں۔"

"ڈاکٹر پاٹل۔" نرس اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے اضطرابی کیفیت میں چلائی اور چلاتی ہوئی کمرے سے اٹھ کر بھاگی۔ "ڈاکٹر' نمبر پچانوے ٹھیک ہو گیا۔ اس کی میموری واپس آ گئی" اور وہ آناً فاناً کمرے سے باہر نکل گئی۔

مشرف علی گھبرا کر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ "یہ کیا پاگل پن تھا' کون تھی یہ نرس' یہ کس قسم کی باتیں کر رہی تھی؟ نمبر پچانوے.........."

اچانک اس کی نظر سامنے والی دیوار پر پڑی جس پر ایک کیلنڈر لٹکا ہوا تھا۔ فاصلہ زیادہ ہونے کے باعث وہ کیلنڈر کے ہندسوں کو تو صاف طور پر نہیں دیکھ سکا لیکن کیلنڈر میں ایک چیز بہت نمایاں تھی جسے اس کی نگاہوں نے دیکھا اور وہ مزید حیران ہو گیا۔ اس کیلنڈر پر مہاتما گاندھی کی بڑی سی تصویر چھپی ہوئی تھی۔

"مہاتما گاندھی کی تصویر کا کیلنڈر اور کراچی کے ہسپتال میں؟" اس نے حیران ہو کر سوچا اور ابھی وہ اپنی اس حیرت کے حصار میں گم ہی تھا کہ اچانک اس کو اپنے چہرے پر کسی داڑھی کا احساس ہوا۔

اس نے گھبرا کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور پھر اس کا ہاتھ ٹھوڑی سے نیچے پھیلتا ہوا چلا گیا۔ اس کی مٹھی میں داڑھی کے سخت بال تھے۔

"یا میرے خدا! یہ کیا طلسمات ہے؟ یہ میں کس شیطانی چکر میں پھنس گیا ہوں؟ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" وہ وحشت' دہشت اور گھبراہٹ کے عالم میں کانپنے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پاگل ہوا جا رہا ہے۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ کیا یہ اس کے ہاتھ تھے؟ اس قدر دبلے' سوکھے' سیاہ' مریل؟ نہیں' اس کے ہاتھ تو ایسے نہیں تھے۔ تو کیا اس ایکسیڈنٹ نے راتوں رات یہ سب کچھ بدل کر رکھ دیا؟

نہیں' وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔ اف توبہ یہ سب کچھ تو خواب تھا۔ بعض خواب ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ ان کو دیکھتے وقت انسان کو یہ ہلکا ہلکا احساس رہتا ہے کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے اور پھر بعد میں جب انسان پورے طور پر بیدار ہو جاتا ہے تو خواب کی ہولناکی کا وہ سارا تاثر کچھ دیر تک قائم رہنے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ خواب .... خواب .... ہاں' یہ خواب ہے۔ خواب ہے مگر کیسا خواب تھا؟ نہیں وہ تو بیدار تھا۔

اپنے سر میں چوٹ کی کسک محسوس کر رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھو سکتا تھا۔ یا میرے مولا! یہ سب کچھ کیا ہے؟ یہ میں کہاں ہوں۔

بدحواسی' سراسیمگی' خوف' دہشت اور وحشت کے عالم میں وہ تیزی سے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا لیکن پھر فوراً ہی رک گیا۔ سامنے سے کئی لوگ دروازے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں ایک معمر ڈاکٹر بھی تھا' جس کا سفید لمبا کوٹ اس کے ڈاکٹر ہونے کی علامت تھا۔ باقی لوگ بھی میڈیکل اسٹاف کے ہی معلوم ہوتے تھے' کیونکہ ان سب کے لباس سفید تھے۔ معمر ڈاکٹر کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو رہا تھا اور اس کے دانت باہر نکلے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کے ساتھ وہ نرس بھی تھی۔

"بیٹھ جاؤ .... بیٹھ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ جاؤ نمبر پچانوے۔" اس نے مشرف علی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے کہا اور اسے واپس بستر کی طرف لے جانے لگا۔

"م .... م .... معاف کیجئے .... ڈاکٹر صاحب .... یہ سب کیا چکر ہے؟ میں کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔ آئی .... آئی ڈونٹ انڈرسٹینڈ.........."

"پلیز' سٹ ڈاؤن۔" ڈاکٹر نے انگریزی میں کہا۔ "میں تمہیں سب کچھ بتاؤں گا۔ تم تعلیم یافتہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ذرا جلدی سے بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟" ڈاکٹر اس سے انگریزی میں بول رہا تھا۔

مشرف علی دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کو دیکھتے ہوئے انگریزی میں بولا۔ "میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا ڈاکٹر صاحب! لیکن آپ لوگوں کو تو یہ بات معلوم ہو گی۔ میں تو بے ہوش ہو گیا تھا۔ پھر مجھے یہاں کوئی لایا ہو گا؟"

"بولو .... بولو۔" ڈاکٹر پاٹل نے کہا۔ "سوچو مت' کچھ سوچو مت بولو۔ سب بتاؤ' کہاں ایکسیڈنٹ ہوا تھا' کب ہوا تھا؟"

"گرومندر کے بس اسٹاپ پر.........."

"گرومندر؟" ڈاکٹر پاٹل نے اس کی بات کاٹی۔ "یہ جگہ کہاں ہے' کس شہر میں ہے؟"

"کس شہر میں! کراچی میں اور کہاں؟" حیران و ششدر مشرف علی نے جواب دیا اور ڈاکٹر پاٹل کے چہرے پر ایک رنگ آ کر اڑ گیا۔

"اچھا .... تو تمہارا ایکسیڈنٹ کراچی میں ہوا تھا؟" ڈاکٹر پاٹل نے گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ "پھر اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد مجھے کچھ نہیں معلوم۔" مشرف علی نے جواب دیا۔ "مجھے تو بس یاد ہے کہ میں گرو مندر کے اسٹاپ کے قریب کھڑا ہوا تھا کہ بس نے مجھے ٹکر ماری اور میں اچھل کر دور جا گرا۔ اس کے بعد کچھ ہوش نہیں رہا .... مجھے تو اب یہاں اس کمرے میں ہوش آیا ہے۔"

مشرف علی خاموش ہو گیا اور ڈاکٹر پاٹل کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں اسے ایک عجیب کیفیت نظر آئی۔ ڈاکٹر پاٹل کا چہرہ جیسے دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اس کے چہرے کے بوڑھے نقوش ایک دم سے بہت گہرے ہو گئے تھے اور ان میں ایک بوجھل اداسی گھل گئی تھی۔ مشرف علی منتظر تھا کہ ڈاکٹر پاٹل کچھ اور کہے گا لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔

"لیکن .... میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے' ڈاکٹر صاحب! میں کہاں ہوں اور یہ سب کچھ .... اس قدر بدلا ہوا کیوں ہے؟ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟" مشرف علی کی آواز بھرا رہی تھی۔

"پریشان مت ہو۔" ڈاکٹر پاٹل نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔ "اب تم ٹھیک ہو۔ کچھ دن کے اندر اندر بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ نام کیا ہے تمہارا؟" مشرف علی نے اسے اپنا نام بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ وہ فلاں دوا ساز کمپنی میں کام کرتا ہے جس کا دفتر ویسٹ وہارف میں ہے۔

"اوہ۔" ڈاکٹر نے ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "پھر تو تم دواؤں اور بیماریوں وغیرہ کے بارے میں کافی کچھ جانتے ہو گے؟ اچھا یہ بتاؤ تمہیں کچھ یاد ہے' تمہارا ایکسیڈنٹ کس تاریخ کو ہوا تھا؟"

مشرف علی کی وحشت میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو وقت کے ایک ایسے حیرت کدے میں قید پا رہا تھا جہاں ہر چیز اس کے دل و دماغ سے بغاوت کرتی معلوم ہوتی تھی۔

"بھلا اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے؟" اس نے کہا۔ "22 دسمبر' شام کو کوئی ساڑھے تین بجے کے قریب..........."

"بائیس دسمبر' لیکن سن؟" ڈاکٹر پاٹل نے پوچھا اور حیرتوں کے سمندر میں ڈوبتے اور ابھرتے ہوئے مشرف علی نے فوراً جواب دیا۔ "1978ء"

ڈاکٹر پاٹل نے ایک لمبی اور گہری سانس لی۔ "جانتے ہو دوست!" اس نے بہت آہستہ سے اس طرح کہا جیسے وہ خواب میں بول رہا ہو۔ "تمہارے ایکسیڈنٹ کو کافی وقت

گزر چکا ہے۔"

"کافی وقت گزر چکا ہے .... کتنا وقت ڈاکٹر صاحب!" مشرف خوف و دہشت کے عالم میں تھرا کر بولا۔ "لیکن میرے سر کی چوٹ تو ابھی بھی تازہ ہے۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے اور پٹی بھی بندھی ہوئی ہے۔"

"بس' اس وقت کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔" ڈاکٹر پاٹل نے کہا۔ "اب تم سو جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ سسٹر تمہیں انجکشن دے گی اور پھر جب تم دوبارہ اٹھو گے تو ہم اطمینان سے باتیں کریں گے۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میرے دوست!" اور اس نے نرس کو اشارہ کیا۔ نرس نیند کا انجکشن تیار کرنے لگی اور مشرف علی نے انجکشن لگوانے میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔

"ہم اسے فوری طور پر سب کچھ بتا کر اسے شدید ذہنی صدمے سے دوچار نہیں کر سکتے تھے۔" ڈاکٹر پاٹل نے مشرف علی کے سو جانے کے بعد کہا۔ "دیکھا تم نے ڈاکٹر راؤ!" وہ اپنے اسسٹنٹ کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "انسانی زندگی کیسے کیسے المیوں سے بھری پڑی ہے۔ کراچی میں ایکسیڈنٹ کا شکار ہونے والا آدمی کہاں پہنچا؟ بمبئی کے پاگل خانے میں اور اس بے چارے کو کچھ نہیں معلوم کہ یہ نو سال کا عرصہ کہاں اور کیسے گزرا۔ معلوم نہیں وہ کس طرح کراچی سے بمبئی آ گیا۔ واہ بھگوان واہ' یہ کیسی دنیا بنائی ہے تو نے!"

"اور اسے کبھی بھی یاد نہیں آ سکے گا کہ وہ بمبئی کیسے آ گیا۔" ڈاکٹر راؤ نے کہا۔ "لیکن سر! اب اس کا کیا ہو گا؟"

"اس بارے میں بعد میں سوچیں گے۔" ڈاکٹر پاٹل نے کہا۔ "شاید اس کا کوئی عزیز بمبئی میں یا ہندوستان کے کسی دوسرے شہر میں موجود ہو' کچھ نہ کچھ تو کریں گے۔ میرے لئے تو سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ ہم نے اور اس نے مل کر بالآخر بیماری کو شکست دے دی ہے اور اب اسے دوبارہ نئی زندگی مل جائے گی۔"

"لیکن سر! اس کی زندگی سے جو یہ نو سال غائب ہو گئے انہیں وہ کہاں تلاش کرے گا؟" ڈاکٹر راؤ نے اداسی کے ساتھ کہا اور ڈاکٹر پاٹل ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گیا۔

چند گھنٹے کے بعد جب مشرف علی بیدار ہوا تو نرس' جو اس وقت اس کمرے میں موجود تھی' اسے سیدھی ڈاکٹر کے پاس لے گئی۔ مشرف علی کے دل و دماغ پر دھند سی چھا

رہی تھی اور یہ سارا گورکھ دھندا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ڈاکٹر کے الفاظ اس کے دماغ میں گونج رہے تھے۔ "تمہارے ایکسیڈنٹ کو کافی وقت گزر چکا ہے .... تمہارے ایکسیڈنٹ کو کافی وقت گزر چکا ہے .... تمہارے ایکسیڈنٹ کو کافی وقت گزر چکا ہے۔"

"آؤ دوست!" ڈاکٹر پاٹل نے دوستانہ انداز میں اس کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ "میرا نام ڈاکٹر سریش ناتھ پاٹل ہے اور میں اس ہسپتال کا میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ہوں .... بیٹھو مشرف علی!"

"تھینک یو ڈاکٹر صاحب!" مشرف علی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ میرے ایکسیڈنٹ کو کافی وقت..........."

"ہاں مشرف علی!" ڈاکٹر پاٹل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ وقت آ گیا تھا کہ اب وہ مشرف علی کو اس کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ "تمہارے ایکسیڈنٹ کو نو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت 1988ء چل رہا ہے۔ آج جنوری کی تین تاریخ ہے..........."

"نہیں .... نہیں .... نہیں .... نہیں۔" مشرف علی پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ڈاکٹر پاٹل اس کی حالت کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور کسی بھی قسم کی خرابی سے نمٹنے کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ "نو نو .... نو سال؟ ڈاکٹر صاحب! نو سال .... تو کیا میں نو سال تک بے ہوش رہا ہوں؟ مجھے نو سال کے بعد ہوش آیا ہے؟"

"تم بے ہوش نہیں تھے مشرف علی!" ڈاکٹر پاٹل نے نرمی سے کہا۔ "ایکسیڈنٹ کے نتیجے میں تمہارا دماغی توازن بگڑ گیا تھا اور ساتھ ہی تمہاری یادداشت بھی غائب ہو گئی تھی۔"

"اوہ .... بالفاظ دیگر میں پاگل ہو گیا تھا؟" مشرف علی نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ اس کے دماغ میں سناٹے گونج رہے تھے۔ اپنے چہرے پر آئی ہوئی لمبی سفید داڑھی اور اپنے ہاتھوں کے اس قدر کمزور اور پتلے ہو جانے کا سبب اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ اس کا دماغ 1978ء میں تھا لیکن وقت کا کارواں اس سے نو سال آگے جا چکا تھا۔ وہ ابھی تک گرو مندر کے بس اسٹاپ پر تھا، جبکہ وقت کے پیمانے پر وہ واقعہ نو برس پرانا ہو چکا تھا۔

اس کی آنکھوں سے ایک دم آنسو بہنے لگے۔ ڈاکٹر پاٹل نے اس کو نہیں روکا۔ اس نے اسے رونے دیا۔ مشرف علی اس قدر رویا کہ اس کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

"اچھا یہ بتاؤ مشرف علی! تمہیں اس بات کا علم ہے کہ تم کراچی سے بمبئی کس طرح پہنچے؟" کچھ دیر کے بعد، جب مشرف علی کے آنسوؤں کا ریلا کچھ تھما تو ڈاکٹر پاٹل نے اس سے پوچھا۔

"بمبئی...........!" مشرف علی کے دماغ کو ایک اور زوردار جھٹکا لگا۔ "بمبئی .... تو کیا میں بمبئی میں ہوں؟" کیلنڈر .... اس پر مہاتما گاندھی کی تصویر، اسکرٹ اور بلاؤز میں ملبوس نرس، نامعلوم زبان کا رسالہ .... ڈاکٹر سریش ناتھ پاٹل...........

"ہاں مشرف علی!" ڈاکٹر پاٹل نے کہا۔ "تم اس وقت بمبئی کے مینٹل ہاسپٹل میں ہو اور گزشتہ نو سال سے تم بمبئی میں ہو۔ تمہیں 1979ء کے اوائل میں بمبئی میں پورٹ کے ممنوعہ علاقے سے مشتبہ حالت میں گھومتے ہوئے گرفتار کیا گیا تھا۔ کیا تمہیں کچھ یاد ہے؟"

"نہیں۔" مشرف علی نے لرز کر جواب دیا۔ "مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ مجھے تو صرف 22 دسمبر 1978ء کی وہ سہ پہر یاد ہے جب گرو مندر کے بس اسٹاپ پر بس نے مجھے ٹکر ماری تھی۔ اس کے بعد سے آج مجھے ہوش آیا ہے..........."

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اب ہم کبھی یہ نہیں جان سکیں گے کہ تم بمبئی کیسے پہنچ گئے؟" ڈاکٹر پاٹل نے کہا۔ "اس کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ تمہارے عزیز وغیرہ تمہیں بمبئی لائے ہوں۔ تمہارا علاج تو کراچی اور لاہور میں بھی ہو سکتا تھا۔ کیا بمبئی میں یا ہندوستان کے کسی شہر میں تمہارا کوئی عزیز موجود ہے؟"

"جی نہیں، ڈاکٹر صاحب!" مشرف علی نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "کوئی نہیں ہے .... ہندوستان میں ہمارا کوئی نہیں ہے۔"

"شادی شدہ ہو، بچے ہیں؟" ڈاکٹر پاٹل نے آہستہ سے پوچھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب .... اگر یہ واقعی 1988ء کا سال ہے تو میرا بیٹا اب تقریباً اٹھارہ سال کا ہو گا۔ میرا جب ایکسیڈنٹ ہوا ہے تو اس وقت اس کی عمر نو سال کی تھی۔"

اور پھر وہ ڈاکٹر پاٹل کے سوالوں کے جواب میں اسے اپنے پورے خاندان کے بارے میں بتاتا رہا، سب لوگوں کے بارے میں اور اس نے یہ بھی بتایا کہ اس روز 22 دسمبر کو اس کے بڑے بھائی کے بچوں کی سالگرہ کی تقریب ہونے والی تھی، اور وہ اپنی بیوی سے یہ وعدہ کر کے آیا تھا کہ شام کے پانچ بجے تک ضرور واپس آ جائے گا۔

22 دسمبر 1978ء اور 3 جنوری 1988ء ان دونوں تاریخوں کے درمیان کیا تھا؟

صرف ایک گہرا' بے نام اور نامعلوم سناٹا۔ مشرف علی کی زندگی سے یہ نو سال کا عرصہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اس کی کتابِ زندگی کے یہ اوراق کہاں گم ہو گئے تھے؟ اور وہ ان گمشدہ اوراق کو دنیا کی کون سی لائبریری میں تلاش کر سکتا تھا؟ وہ تحریریں کہاں چلی گئی تھیں جنہیں اس نے کبھی پڑھا ہی نہیں تھا؟ معدوم اور نامعلوم تحریریں۔ کیا زندگی کے کسی ایک حصے کو کاٹ کر پھینک دینا' الگ کر دینا ممکن تھا؟ کیا زندگی سے وقت کے ایک حصے کو اس طرح الگ کر دینا ممکن تھا کہ انسان کو اس کی گزران کا احساس بھی نہ ہو؟ ہاں' یہ ممکن تھا اور مشرف علی کے ساتھ ایسا ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی کا نو سال کا عرصہ ایسا گزرا تھا جب وہ تھا بھی اور نہیں بھی تھا۔ اس ہونے اور نہ ہونے کے درمیان کیا تھا؟ ایک مکمل خود فراموشی اور بے خودی۔ دنیا میں ہر شے نو سال آگے نکل گئی تھی لیکن وہ تو وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک گرو مندر کے بس اسٹاپ پر کھڑا ہوا تھا' رکشہ کی تلاش میں۔ وہ رکشہ لے کر گھر جانا چاہتا تھا اور یہ 22 دسمبر 1978ء کی تاریخ تھی!

"تمہارے گھر والے بھگوان جانے کس حال میں ہوں گے!" وہ ڈاکٹر پاٹل کی آواز سن کر چونک پڑا۔ "نہ انہیں تمہاری کچھ خبر ہو گی اور نہ تمہیں ان کی کچھ خبر ہے۔ مگر اب وقت آ گیا ہے کہ تم ان سے رابطہ قائم کرو۔ تم اب ٹھیک ہو گئے ہو اور تمہیں اپنے گھر جانا چاہئے۔"

"جی .... جی ڈاکٹر صاحب!" مشرف علی نے کہا۔ "میں انہیں خود خط لکھتا ہوں۔ وہ میری واپسی کا کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکالیں گے۔"

"اگر تم قانونی طور پر ہندوستان آئے ہوتے تو تمہاری واپسی کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔" ڈاکٹر پاٹل نے کہا۔ "میں کل ہی تمہیں جہاز میں سوار کرا کے کراچی روانہ کر دیتا۔ کرائے کا بندوبست بھی ہو جاتا۔ مگر موجودہ صورتِ حال بہت پیچیدہ ہے۔ تمہارے پاس کوئی ڈاکومنٹ نہیں ہے۔ نہ پاسپورٹ نہ ویزا' نہ شناختی کارڈ۔ کچھ بھی نہیں۔ اس صورت میں تم پاکستان کیسے جا سکتے ہو؟ اس کے لئے تو سفارتی سطح پر کوششیں کرنی ہوں گی۔ بہرحال تم اپنے گھر والوں کو خط لکھو اور میں کچھ ذمہ دار لوگوں سے بات کرتا ہوں۔"

اس رات جب مشرف علی نے پورے نو برس کے بعد قلم اپنے ہاتھوں میں پکڑی تو اس کی انگلیاں بری طرح کانپ رہی تھیں۔ قلم پر اس کی گرفت بہت سخت تھی جس طرح کوئی بچہ جو نیا نیا لکھنا سیکھتا ہے' قلم کو خوب کس کے مٹھی میں دبا لیتا ہے' اسی طرح مشرف علی نے بھی قلم کو کس کے پکڑ رکھا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے قلم اور اپنی انگلیوں کے

درمیان توازن قائم کر سکا اور پورے چار کاغذ ضائع کرنے کے بعد ہی لکھنے کے قابل ہو سکا۔

نو سال کے بعد وہ اپنوں سے مخاطب ہو رہا تھا لیکن لکھنے کو بہت زیادہ تو نہیں تھا۔ وہ تو نو سال تک ہونے اور نہ ہونے کے درمیان گہرے اور نامعلوم سناٹوں میں بھٹکتا رہا تھا۔ اسے ان برسوں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔

اس نے سعدیہ کو مخاطب کر کے ایک مختصر سی تحریر لکھی جس میں اپنے زندہ ہونے اور بمبئی کے مینٹل ہاسپٹل میں موجود ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا کہ وہ اب بالکل ٹھیک ہو چکا ہے اور اس کی کراچی واپسی کا کوئی بندوبست کیا جائے۔ اس نے بھائی جان' رقیہ اور بھابی' آپا اور رئیس بھائی کو سلام لکھا۔ مظفر اور سب بچوں کو پیار لکھا۔

مشرف علی کا بھیجا ہوا خط کوئی ہفتے دس دن کے بعد کراچی پہنچ گیا لیکن وہ خط سعدیہ کے ہاتھوں میں کبھی نہ جا سکا۔

اشرف علی سے شادی کے بعد سعدیہ نے اپنا مکان کرائے پر دے دیا تھا۔ اس کے کوئی پانچ سال کے بعد وہ سارا علاقہ کمرشل ہو گیا اور وہاں کی زمین اور سڑک کے کنارے واقع مکانوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ اشرف علی اور سعدیہ نے اس مکان کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت اچھے پیسے مل رہے تھے اور ان پیسوں سے اس سے کہیں زیادہ اچھا اور بڑا' دوسرا مکان خریدا جا سکتا تھا۔ چنانچہ ان لوگوں نے وہ ایک کنسٹرکشن کمپنی کے ہاتھ بیچ دیا اور اب وہاں ایک زبردست پلازہ بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پرانے طرز کے مکان کو منہدم کیا جا چکا تھا اور اس میں سے دوبارہ استعمال کے لائق میٹریل کو نکال کر باقی ملبے کو پھنکوا دیا گیا تھا۔

ڈاکیہ جب مشرف علی کے خط کو لے کر اس پتے پر پہنچا تو وہاں کوئی مکان نہیں تھا وہ تو ایک خالی پلاٹ تھا جہاں مزدور اور مشینیں گہری کھدائی میں مصروف تھے۔ چوکیداروں نے ڈاکیے کو بتایا کہ یہاں کوئی عورت نہیں رہتی۔ ڈاکیہ خط واپس لے گیا اور اس نے اسے ڈیڈ لیٹر آفس میں پھینک دیا۔

مشرف علی نے ایک ہفتے کے بعد ہی سعدیہ کے جواب کا انتظار شروع کر دیا تھا لیکن پورا ایک مہینہ گزر گیا اور کوئی جواب نہیں آیا۔ "خدا معلوم انہیں میرا خط ملا بھی یا نہیں۔" وہ مایوسی کے ساتھ سوچتا۔ "ہندوستان اور پاکستان کے درمیان بہت سے خطوط تو غائب ہی ہو جاتے ہیں۔ یا شاید .... شاید سعدیہ اب وہاں نہ رہ رہی ہو۔ کون جانے کیا

خبر، میرے بعد کیا حالات پیش آئے؟"

اس دوران ڈاکٹر پاٹل نے اپنے طور پر کوششوں کا آغاز کر دیا تھا۔ اس نے ہندوستانی وزارتِ خارجہ کو ایک خط کے ذریعے مشرف علی کے پورے کیس سے آگاہ کرتے ہوئے یہ درخواست کی تھی کہ پاکستانی سفارت خانے کے تعاون سے مشرف علی کو پاکستان واپس بھیجے کا بندوبست کر دیا جائے اور اس کے خط کا جواب بھی موصول ہو گیا تھا۔ وزارت نے لکھا تھا کہ اس معاملے کو پاکستانی سفارت خانے کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اور توقع ہے کہ جلد ہی اس کا کوئی حل نکل آئے گا۔

ڈاکٹر پاٹل نے مشرف علی کو یہ خوشخبری سنائی اور اس سے کہا کہ اب اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ عنقریب اس کی واپسی کا سرکاری سطح پر بندوبست ہو جائے گا۔

تین مہینے گزر گئے اور کسی طرف سے کوئی مزید جواب نہیں آیا۔ ڈاکٹر پاٹل نے وزارت خارجہ کو دوبارہ یاددہانی کا خط لکھا اور اسے مطلع کیا گیا کہ معاملہ پاکستانی سفارت خانے کے حکام کے حوالے کر دیا گیا ہے اور جیسے ہی ان کی طرف سے کوئی جواب ملے گا۔ ڈاکٹر پاٹل کو مطلع کر دیا جائے گا۔ ڈاکٹر پاٹل قدرے مطمئن ہو گیا اور اس نے مشرف علی کو بھی یہ بات بتا دی۔

مشرف علی نے دوبارہ کراچی کوئی خط نہیں لکھا۔ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ اسے عنقریب کراچی بھیج دیا جائے گا اور پھر وہ اچانک سب لوگوں کے سامنے نمودار ہو کر انہیں ششدر کر دے گا، وہ ان لوگوں کو زبردست سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

مزید تین مہینے گزرنے کے بعد بھی جب ڈاکٹر پاٹل کو کوئی اطلاع نہیں ملی تو اس نے براہِ راست پاکستانی سفارت خانے کو خط لکھا اور ہندوستانی وزارتِ خارجہ کے ساتھ اپنی مراسلت کے حوالے سے انسانیت کے نام پر اپیل کی کہ اس پاکستانی شہری کی جلد از جلد پاکستان منتقلی کا بندوبست کیا جائے جو بے یار و مددگار اور بے آسرا مینٹل ہاسپٹل میں پڑا ہوا ہے جبکہ وہ بالکل ٹھیک ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر پاٹل کو اپنے خط کا جواب کوئی مہینہ بھر کے بعد ملا۔ سفارت خانے کی جانب سے اسے یہ اطلاع دی گئی تھی کہ مشرف علی کا کیس ضروری "پروسیس" میں ہے اور عنقریب اس سلسلے میں کچھ طے کر لیا جائے گا اور ہندوستانی دفتر خارجہ کو اس سے آگاہ کر دیا جائے گا۔

دن پر دن گزرتے گئے۔ مشرف علی ہر روز کسی نئی خبر کا انتظار کرتا لیکن اس کے لئے دونوں حکومتوں کی طرف سے بے خبری کے تحفے کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

1988ء کا سال ختم ہونے کو آ گیا تھا۔ دسمبر کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ مشرف علی ٹھیک ہو جانے کے باوجود بھی اب تک مینٹل ہاسپٹل میں پڑا ہوا تھا۔ کیونکہ اس کے پاس جانے کے لئے کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ کہاں جا سکتا تھا؟ ڈاکٹر پاٹل نے اسے مصروف رکھنے کے لئے ہسپتال کے رضاکار اسٹاف میں شامل کر لیا تھا۔ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ بہت سے کام کر سکتا تھا۔

اس رات کو مشرف علی ڈاکٹر پاٹل کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ "میں اس عذاب سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔ ڈاکٹر صاحب!" اس نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ میں کبھی کراچی واپس نہیں جا سکوں گا۔ ایک سال ہو گیا، ڈاکٹر صاحب! کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ میں کس سے مدد مانگوں، کہاں جاؤں، کیا کروں؟"

ڈاکٹر پاٹل کا دل بھر آیا۔ مشرف علی کا پورا کیس اس کے سامنے تھا۔ یہ انسانی زندگی کی ایک ایسی پُر پیچ اور المناک داستان تھی کہ کوئی بھی دردمند دل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ ڈاکٹر پاٹل نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں پاگلوں کے بہت سے کیس دیکھے تھے۔ ہر پاگل کی کہانی کے پیچھے کوئی نہ کوئی المیہ چھپا ہوا ہوتا تھا لیکن مشرف علی کا کیس ان سب سے الگ تھا۔ ڈاکٹر پاٹل کو اپنی زندگی میں کبھی بھی اس درجہ المناک کیس سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

"تم فکر مت کرو مشرف علی!" اس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں کوئی نہ کوئی راستہ نکالوں گا۔ ضرور نکالوں گا۔ میں تمہیں کراچی ضرور پہنچواؤں گا۔" مگر کیسے؟ اس سوال کا جواب تو خود ڈاکٹر پاٹل کے پاس بھی نہیں تھا۔

اتفاق سے اس رات ڈاکٹر پاٹل کے پاس شانتی لال کا فون آیا۔ اس کی بیوی ایک ذہنی مریضہ تھی اور اس کو دورے پڑتے تھے۔ اس رات پھر اس پر دورہ پڑا تھا اور شانتی لال نے ڈاکٹر پاٹل سے درخواست کی تھی کہ وہ کسی کو بھیج دے یا خود آ جائے۔ وہ ڈاکٹر پاٹل کے ہی زیر علاج تھی اور شانتی لال ڈاکٹر پاٹل کے نیازمندوں میں سے ایک تھا۔ شانتی لال بمبئی کا ایک ارب پتی تاجر تھا اور اس کے بارے میں یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ اس کا تعلق اسمگلروں سے ہے اور اس کے پاس لانچوں کا اپنا بیڑہ ہے۔

شانتی لال کا فون آتے ہی ڈاکٹر پاٹل کے دل میں عجیب خیال آیا۔ "قانون کی ایسی

تیسی۔" اس نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ "ایک مرتے ہوئے انسان کو اس کے گھر والوں سے ملانے سے زیادہ قابل قدر قانون اور کون سا ہو گا؟" اس رات وہ خود شانتی لال کے گھر گیا اور اس نے شانتی لال سے ایک نیکی کے کام میں مدد طلب کی۔ اس نے مشرف علی کا پورا کیس اسے بتاتے ہوئے اس سے درخواست کی کہ وہ اسے اپنی کسی لانچ کے ذریعے کراچی پہنچانے کا بندوبست کر دے۔ شانتی لال مشرف علی کی داستان سن کر دم بخود رہ گیا۔ "اپن کو یہ کام کر کے شاید اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی حاصل ہو گی ڈاکٹر صاحب!" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد شانتی لال نے سارا بندوبست کر دیا۔

لانچ خیریت کے ساتھ کراچی کے ساحلی علاقے میں پہنچ گئی۔ اس وقت خوب سردی ہو رہی تھی اور مشرف علی ایک پرانے سے کمبل میں لپٹا ہوا تھا۔

اندھیری رات تھی جب لانچ کسی نامعلوم جگہ پر رک گئی اور لانچ کے ناخدا کالو نے مشرف علی کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "آؤ بابا جی! اترو ڈرنا نہیں۔ بس ذرا کمر کمر تک پانی ہے۔ اس سے زیادہ نہیں ہے۔ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے رہنا۔"

مشرف علی کمر کمر تک پانی سے گزرتا ہوا تاریکی میں ڈوبی ہوئی خشکی تک آ گیا۔ کالو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سہارا دیتا رہا۔

"تم اس وقت کراچی کے علاقے میں ہو بابا جی!" کالو نے اس سے کہا۔ "ایک گھنٹے بعد صبح ہو جائے گی اور اجالا پھیل جائے گا۔ پھر شاید تم اس علاقے کو پہچان سکو اور نہ بھی پہچان سکو تو پرواہ نہیں سمندر کی طرف منہ کر کے کھڑے ہونا اور پھر اپنے الٹے ہاتھ پر چل پڑنا۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد تم ٹھیک ہاکس بے پہنچ جاؤ گے۔ ہاکس بے کو تو پہچان لو گے نا! یہاں تو آتے رہے ہو گے؟"

"ہاں پہچان لوں گا۔" مشرف علی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ضرور پہچان لوں گا۔"

"اچھا یہ رکھ لو۔" کالو نے اس کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔ "یہ پچاس روپے والے بیس نوٹ ہیں۔ ایک ہزار روپے پاکستانی کرنسی ہے۔ اب تم آرام سے اپنے گھر پہنچ جاؤ گے۔"

"یہ تو بہت ہیں بھائی!" مشرف علی نے جذبات سے بوجھل آواز میں کہا۔ "بس پچاس روپے دے دو۔"

"رکھ لو بابا جی!" کالو نے کہا۔ "کام آئیں گے۔ بس اتنا کرنا کہ نماز پڑھنے کے بعد اپنے اللہ میاں سے دعا مانگنا تو ساتھ ہی یہ دعا بھی ضرور مانگ لینا کہ اللہ میاں کالو کے گناہ معاف کرے۔"

کالو نے آخری بار مشرف علی کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور تاریکی میں غائب ہو گیا۔ مشرف علی کی آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے چاروں طرف گہرا سناٹا اور تاریکی تھی اور اس سناٹے میں واحد آواز جو گونج رہی تھی وہ سمندر کے تھپیڑوں کی آواز تھی۔ گرجتے ہوئے سمندر کی موجیں جب اوپر کو اٹھتی تھیں تو رات کی تاریکی کے باوجود ان میں ایک چمک پیدا ہو جاتی تھی۔

وہ ایک ابھرے ہوئے ریتلے ٹیلے پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے جھک کر تھوڑی سی ٹھنڈی ریت اٹھائی اور اسے بے تحاشہ اپنے چہرے پر اور اپنی بند آنکھوں سے ملنے لگا۔ اس نے اس مٹی کو چوما' اسے اپنے ہونٹوں سے لگایا۔ یہ اس کے وطن کی مٹی تھی۔ اس کے اپنے شہر کراچی کی مٹی تھی۔ "کراچی! میری جان' کرچی! میرا اپنا شہر.......... میرے اپنوں کا شہر۔" اس کی آنکھوں کے گدلے گدلے بادلوں سے پھر بارش شروع ہو گئی تھی۔ اس نے پرانے کمبل کو اپنے جسم کے گرد مضبوطی سے لپیٹ لیا۔

جب صبح کی پہلی کرن پھوٹی تو مشرف علی نے اپنے آپ کو ایک بالکل ویران اور اجاڑ ساحلی علاقے میں پایا جہاں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس نے کالو کی ہدایت پر عمل کیا اور سمندر کی طرف رخ کر کے اپنی بائیں سمت کا تعین کیا اور اسی طرف چل پڑا۔ صبح کا اجالا پھیلتا جا رہا تھا اور مناظر زیادہ واضح ہوتے جا رہے تھے اور پھر دور بہت دور' اسے ہاکس بے پر بنے ہوئے کاٹیجز کے ہلکے ہلکے نقوش دکھائی دینے لگے۔

اس کی ٹانگوں میں اچانک جیسے نئی قوت پیدا ہو گئی اور اس نے ایک سرشاری کے عالم میں چلنا شروع کر دیا۔

جب وہ فیڈرل بی ایریا کے علاقے میں پہنچا تو اس وقت دوپہر کے دو بجے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر ایسے وقت پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا جب سعدیہ بھی اسکول سے آ چکی ہو اور منظر بھی کالج سے .... ہاں کالج سے .... واپس آ چکا ہو۔ "اب تو وہ کالج میں پڑھ رہا ہو گا۔" اس نے ایک ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ سوچا۔

لیکن فیڈرل بی ایریا میں اپنے گھر کے علاقے میں پہنچ کر وہ بالکل بھٹک گیا۔ دس سال کے عرصے میں سارے کا سارا علاقہ ہی بدل گیا تھا جہاں کبھی خالی میدان

اور خالی پلاٹ ہوا کرتے تھے وہاں طرح طرح کے مکان اور بلند عمارتیں سر اٹھائے کھڑی ہوئی تھیں۔ جہاں صرف کیکر کی جھاڑیاں ہوا کرتی تھیں وہاں پورے کے پورے بازار نظر آ رہے تھے' جن میں لوگوں کے ہجوم تھے۔

وہ رکشہ سے اتر گیا تھا اور پیدل اپنا گھر تلاش کر رہا تھا لیکن اسے اپنا گھر مل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کئی بار اس جگہ کے پاس سے گزرا جہاں اس کے خیال کے مطابق اس کا گھر ہونا چاہئے تھا لیکن وہاں اس کا گھر نہیں تھا۔ آس پاس کے کچھ اور گھر بھی غائب تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ دس سال کے اندر جیسے دنیا ہی بدل کر رہ گئی تھی۔ علاقہ پہچاننے میں نہیں آ رہا تھا۔

"کہیں میں اپنے گھر کا راستہ تو نہیں بھول گیا ہوں؟" اس نے خوفزدہ ہو کر سوچا۔ "شاید دماغ ابھی .... نہیں نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرا دماغ تو بالکل ٹھیک کام کر رہا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر مین روڈ کی طرف سے چلنا شروع کیا۔ یہاں شناخت کی علامتیں واضح تھیں اور وہ دوبارہ ٹھیک جگہ پر پہنچ گیا لیکن اس کا مکان وہاں نہیں تھا۔ اس وقت یکبارگی اسے احساس ہوا کہ جس پلاٹ پر اس کا مکان ہوا کرتا تھا' وہاں تو ایک کثیرالمنزلہ عمارت بن رہی ہے جس کا ڈھانچہ تیار ہو چکا ہے۔

شام کے پانچ بج چکے تھے اور وہ بھاگتے بھاگتے' چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ایک پیالی چائے تک نہیں پی تھی۔ وہ ایک ہوٹل میں چلا گیا .... وہاں جا کر اس نے کھانا کھایا' چائے پی اور کافی دیر تک بیٹھا رہا۔ شام کے ساڑھے چھ بج چکے تھے۔

اچانک اسے خیال آیا کہ آج دسمبر کی بائیس تاریخ ہے۔ آج تو فردوس اور سہیل کی سالگرہ ہو گی۔ وہ بڑے ٹھیک موقع سے بھائی جان کے گھر پہنچ جائے گا۔ ویسے بھی اپنے گھر کو گم کر دینے کے بعد وہ اشرف کے ہی گھر جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔

آٹھ بجے کے قریب وہ ناظم آباد کے علاقے میں تھا۔ فیڈرل بی ایریا سے اسے رکشہ بہت دیر میں ملا اور تقریباً آدھا گھنٹہ اشرف کے مکان کو تلاش کرنے میں لگ گیا۔ سب کچھ کس قدر بدل گیا تھا۔ راستے پہچانے ہی نہیں جا رہے تھے۔

اشرف کے مکان کے دروازے پر لگی ہوئی نام کی تختی دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک کمزور مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بالآخر وہ اپنوں میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے ہاتھ ڈال کر

گیٹ کی کنڈی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔

اس کی توقع کے عین مطابق سالگرہ کے اجتماع کے موقع پر سب لوگ جمع تھے۔

☆======☆======☆

مشرف علی کی زبان گنگ تھی۔ شدید ترین جذباتی ہیجان اور اعصابی دباؤ کے عالم میں اس کی زبان سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا۔ وہ ان چہروں کو دیکھ رہا تھا جو اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ اس نے اشرف کو' رئیس احمد کو' سعدیہ کو' سائرہ کو' سب کو پہچان لیا تھا۔ اس نے فردوس اور سہیل کو بھی پہچان لیا تھا' جو اب جوان ہو گئے تھے اور اس نے اپنے بیٹے مظفر کو بھی پہچان لیا تھا جو کراہت کے ساتھ اس بدتمیز پاگل فقیر کو گھور رہا تھا جو زبردستی گھر کے اندر گھستا چلا آیا تھا۔

"آپ لوگوں نے مجھے پہچانا نہیں رئیس بھائی۔" اس نے رئیس کے بھاری بھرکم اور توانا ہاتھ سے اپنے مریل اور سوکھے ہوئے ہاتھ کو چھڑانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میں .... میں فقیر نہیں ہوں۔"

"ارے .... یہ تو مشرف معلوم ہوتے ہیں!" اچانک سائرہ بدحواسی کے عالم میں چیخی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس "بوڑھے" شخص کو دیکھنے لگی جس کے چہرے کے کھنڈروں میں تو شناخت کی کوئی علامت بمشکل ہی باقی تھی لیکن جس کی آواز آج بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ آج سے دس سال پہلے لیکن مشرف .... کیسے .... ممکن!

"دیکھا .... دیکھا .... آپا نے مجھے سب سے پہلے پہچان لیا۔" مشرف علی بڑی مسرت میں گلا پھاڑ کر چیخا اور رئیس احمد کے سینے سے لپٹ کر دھاروں رونے

اور اس کے بعد پھر وہاں ایک ایسا منظر دیکھنے میں آیا جو رُوئے زمین پر کم ہی لوگوں نے دیکھا ہو گا۔

مشرف اور رئیس اور اشرف' تینوں آپس میں لپٹے ہوئے سسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب رواں تھا' یہ ساری فضا اچانک ایک انتہائی المناک کیفیت میں ڈوب گئی تھی۔

"ابو .... میرے ابو .... میرے ابو!" انیس سالہ مظفر دراز قد' خوبصورت بھرے بھرے جسم والا نوجوان' ایک کمزور "بوڑھے" باریش اور ناتواں جسم سے لپٹ کر

ہذیانی انداز میں چلا رہا تھا۔ "میرے ابو .... میرے ابو! آپ کہاں چلے گئے تھے؟" اور وہ دیوانہ وار اس جھریوں بھرے میلے کچیلے چہرے کو چومنے لگا جس پر ہاکس بے کی ریت کے ذرات ابھی تک موجود تھے۔ مظفر کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

اور جب اچانک پھٹ پڑنے والے تند و تیز جذباتی طوفان کا یہ منہ زور ریلا تھما تو دماغوں میں نئی وحشتیں اور دلوں میں نئی ٹیسیں جاگ اٹھیں۔

سعدیہ کے وجود پر لرزہ طاری تھا! یہ کیسی خوشی تھی جو موت کی طرح قاتل بن گئی تھی!

اشرف کے ہاتھ پیروں میں ایک مرگ آفریں سنسنی دوڑ رہی تھی وقت نے اسے کیسی خوفناک اور مہلک آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ اب وہ کیا کرے گا!

سائرہ اور رئیس کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ان دونوں کی حالت ایسے مجرموں کی طرح ہو رہی تھی جنہیں کشاں کشاں پھانسی کے تختے کی جانب لے جایا جا رہا ہو اور جلاد ان کی گردنوں میں پھندا ڈالنے کا منتظر ہو۔

"مشرف!" آخر کچھ دیر کے بعد رئیس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "تم زندہ ہو مشرف؟ تو پھر.......... وہ کون .... میرا مطلب ہے، تم تھے کہاں؟" اس نے جلدی سے بات بدلی۔

"میں مختصراً بتاتا ہوں۔" مشرف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "آج ہی کی تاریخ 1978ء میں گرومندر پر میرا ایکسیڈنٹ ہوا تھا اور میں بے ہوش ہو گیا تھا اور پھر جب دوبارہ اپنے حواس میں آیا ہوں تو وہ 3 جنوری 1988ء کا دن تھا۔ میں بمبئی کے ایک ہاسپٹل میں تھا۔"

"بمبئی؟" ایک ساتھ کئی زبانوں سے شدید حیرت کے عالم میں یہ لفظ ادا ہوا۔

"اف میرے خدا! تم بمبئی پہنچ گئے تھے؟" اشرف نے کہا۔ "مگر کیسے، تم بمبئی جا پہنچے؟"

"مجھے کچھ نہیں معلوم بھائی جان!" مشرف نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "3 جنوری 1988ء کو جب مجھے ہوش آیا تو ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میں پانچ سال تک جیل میں تھا۔ پھر مجھے علاج کے لئے مینٹل ہاسپٹل بھیج دیا گیا۔ وہاں چار سال تک علاج ہوا اور پھر میں ٹھیک ہو گیا۔ میری یادداشت واپس آ گئی لیکن اس درمیانی عرصے کی کوئی بات مجھے یاد نہیں ہے۔"

مشرف کی نگاہیں سعدیہ کے چہرے کی طرف اٹھ گئیں جو درد کی دھند میں لپٹا ہوا دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ اگر مشرف علی اس وقت اس کے دل کے اندر جھانک سکتا تو اسے وہاں پچھتاوے اور اذیت کا ایک ایسا خوفناک طوفان امنڈتا ہوا نظر آتا جس کی شدت پہاڑوں کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتی تھی۔

"سعدیہ! ہمارا گھر کہاں چلا گیا؟" مشرف نے پہلی بار سعدیہ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "میں دو ڈھائی گھنٹے تک وہاں پریشان ہوتا رہا۔ مجھے گھر ہی نہیں ملا۔ وہاں تو کوئی بلڈنگ بن رہی ہے.........."

"تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا مشرف!" رئیس نے جلدی سے بات کو سنبھالا۔ "پیسے اچھے مل رہے تھے۔ ہم نے سعدیہ سے کہا کہ وہ مکان بیچ دیں۔ اب یہ یہیں رہتی ہیں۔"

"اچھا .... اچھا۔" مشرف علی نے بڑی سادگی کے ساتھ کہا۔ اس کے بڑے بھائی نے اس کی بیوی اور بچے کا کتنا خیال رکھا تھا۔

"اور .... اور رقیہ بھابی کہاں ہیں؟" مشرف علی نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑاتے ہوئے۔ "وہ نظر نہیں آ رہی ہیں۔"

چند لمحوں تک گہری خاموشی طاری رہی۔ اس کے بعد رئیس احمد نے آہستہ سے جواب دیا۔ "ان کا تو بہت عرصہ ہوا' انتقال ہو گیا۔ ان کا بھی اور اماں اور ابا کا بھی۔ وہ سب لوگ چلے گئے۔"

"ہائے۔" مشرف کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "ان سب لوگوں کا انتقال ہو گیا؟ انا للہ وانا الیہ راجعون.......... اف' کس قدر تبدیلیاں ہو گئیں۔ آپ لوگوں پر کیسے کیسے صدمے گزر گئے اور میں پاگل دیوانہ ہر بات سے بے خبر رہا لیکن رقیہ بھابی کو کیا ہو گیا تھا؟" رئیس نے اسے رقیہ کے بارے میں بتایا۔

لیکن سب سے زیادہ اذیت ناک بات کا تو اسے ابھی تک علم ہی نہیں ہوا تھا۔

مشرف علی کو کسی نے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ یہاں تو اس کی تجہیز و تکفین ہو چکی تھی اور گزشتہ نو سال سے اس کی برسی کی فاتحہ بھی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔ رئیس احمد نے آئندہ پیش آنے والے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اسے اس بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ مشرف علی کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔

"تو گویا آپ لوگوں کے لئے میں مر چکا تھا۔" اس نے کمزور آواز میں کہا اور پھر

آہستہ سے مسکرایا۔ بے جان اور پژمردہ انداز میں۔

"ہاں مشرف!" رئیس احمد نے کہا۔ "اس نامعلوم شخص کی لاش کو ہم نے .... تمہاری جگہ سمجھ لیا۔ اس رات کو تم ایسے غائب ہوئے کہ تمہارا کوئی پتا ہی نہیں چل سکا۔ ہم نے کہاں کہاں تمہیں نہیں تلاش کیا۔"

"کاش کوئی مجھے یہ بتانے والا ہوتا کہ میں بمبئی کس طرح پہنچ گیا۔" مشرف علی نے شکستہ آواز میں کہا۔ "لیکن کون بتا سکتا ہے؟ اگر کسی کو معلوم ہوتا تو مجھے روک ہی نہ لیتا۔ میں سٹری سودائی ہو کر کہاں سے کہاں نکل گیا۔"

اس وقت تقریباً چھ سالہ ایک بچہ کسی طرف سے دوڑتا ہوا آیا اور وہ سعدیہ کے دامن سے لپٹ گیا۔ "امی .... امی .... یہ بڈھے بابا کون ہیں؟" معصوم بچے نے مشرف علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"امی؟" مشرف علی کے دماغ میں چنگاری سی بھڑکی۔ یہ کون بچہ تھا؟ کس کا بچہ تھا؟ یہ سعدیہ کو امی کیوں کہہ رہا تھا؟

"یہ .... یہ کس کا بیٹا ہے؟" اس نے شہاب کو غور سے دیکھتے ہوئے سعدیہ سے پوچھا۔ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔

اور مشرف علی کے اس سوال پر ساری محفل پر سکتہ طاری ہو گیا۔ کس نے سوچا تھا کہ مردے بھی زندہ ہو سکتے ہیں اور ایک دن مشرف علی اپنی "بیوہ" سے اس کی اولاد کے بارے میں پوچھ سکے گا؟

"اپنا ہی ہے۔" رئیس احمد نے اس ناگوار سکوت کو توڑتے ہوئے جلدی سے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔ "گھر ہی کا بچہ ہے۔ تمہارا تو اب بہت سے لوگوں سے نئے سرے سے تعارف کرانا ہو گا۔ اچھا جاؤ، تم ہاتھ منہ دھو لو بلکہ نہا لو۔ غسل خانے میں گیزر لگا ہے۔ گرم پانی ملے گا۔ فردوس بیٹی!" وہ فردوس کی طرف مڑا۔ "چچا کو اپنے ابو کا شلوار سوٹ نکال کر دو۔ آؤ .... آؤ مشرف!" اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے غسل خانے کی طرف لے گیا۔ فردوس نے اسے اشرف کا ایک شلوار سوٹ نکال کر دے دیا۔ مشرف علی غسل خانے میں بند ہو گیا۔

"کوئی انہیں ابھی کچھ نہ بتائے۔" رئیس احمد نے کمرے میں آ کر کہا۔ "میں انہیں بتاؤں گا اور بات کو سنبھالنے کی کوشش کروں گا۔ یہ ہم سب کے لئے بڑی آزمائش کا وقت ہے لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مشرف بہت سمجھدار آدمی ہے۔

حالات کو ضرور سمجھیں گے۔"

سعدیہ کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ اس کے جسم سے جیسے کسی نے سارا خون نچوڑ لیا تھا۔ کاش .... کاش وہ مر جاتی۔ کاش رقیہ کے بجائے اسے موت آ گئی ہوتی تو آج .... آج اس خون آلود ندامت کے بوجھ سے اس کی پلکیں جھکی ہوئی نہ ہوتیں۔

مشرف علی کے غسل خانے سے نکلتے ہی مہمانوں کو کھانے کی میز پر لے جایا گیا اور کھانا شروع کرا دیا گیا۔ رئیس احمد مشرف کو بتا رہا تھا کہ اس رات وہ کس طرح گھر سے نکل گیا تھا اور پھر اسے کہاں کہاں تلاش کیا گیا۔

"ابا بے چارے کے پیروں میں تو پیدل چلتے چلتے چھالے پڑ گئے تھے۔" سعدیہ نے آنکھیں جھکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "وہ بے چارے کس طرح بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے تھے۔" مشرف علی نے گہری نظروں سے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"اور تم؟" اس نے کھوکھلی آواز میں کہا۔ "تم بھی تو بہت روئی ہو گی سعدیہ مجھے معلوم ہے، تم بھی بہت روئی ہو گی۔"

"ہم سب بہت روئے تھے مشرف!" سائرہ نے فوراً جواب دیا۔ "تمہارے اس طرح اچانک لاپتہ ہو جانے سے ہم سب پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔"

"اور پھر رہی سہی کسر اس نامعلوم شخص کی لاش نے پوری کر دی۔" رئیس احمد نے کہا۔ "اس کا لباس، اس کی چپلیں، اس کا قد و قامت، اس کا جسم، اس کی ٹھوڑی پر وہ کالا مسہ ہم دھوکا کھا گئے، مشرف! اصل میں اس کا چہرہ بہت زیادہ کچلا ہوا تھا اور پھر اس کے کوائف کے بارے میں جو کچھ پولیس والوں سے اور خود وہاں کے لوگوں سے معلوم ہوا.........."

"چلئے اس بہانے کسی لاوارث لاش کو کچھ لوگوں نے کندھا تو دے دیا اور اس کی فاتحہ تو کر دی۔" مشرف علی نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں نہ سہی، میرا کوئی اور بھائی بند سہی، تھا تو کوئی میرے ہی قبیلے کا .... دیوانہ سودائی۔"

"میری آنکھوں کو اب تک جیسے یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم زندہ سلامت ہو۔" سائرہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "ہائے .... کیا کیا نہ ہو گیا۔ کیسے کیسے انقلابات آ گئے۔ اماں چلی گئیں، ابا چلے گئے۔ رقیہ چلی گئیں.........."

"اور میں آدھے راستے سے لوٹ آیا۔" مشرف نے آہستہ سے ہنستے ہوئے کہا۔ سائرہ نے گفتگو کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کی لیکن اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو

سکی۔ محفل میں کوئی ہنس نہیں رہا تھا۔

باتوں کا سلسلہ رات بارہ بجے تک جاری رہا۔ مشرف علی اپنا احوال سنا رہا تھا اور ا
یہاں کے حالات سنائے جا رہے تھے لیکن اس گفتگو میں سعدیہ بہت کم شریک تھی۔
زیادہ تر تو سنتی رہی تھی اور اس کی آنکھیں بار بار چھلک پڑتی تھیں۔ شہاب کو اس
چپکے سے سلا دیا تھا۔

بارہ بجے تک سارے مہمان رخصت ہو گئے اور صرف گھر والے رہ گئے۔ مشر
علی نے سعدیہ کی طرف دیکھا اور ہولے سے ایک درد بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "
سب لوگوں نے بہت دکھ اٹھائے سعدیہ! بہت دکھ اٹھائے، بہت دکھ اٹھائے۔"

"سب سے زیادہ دکھ تو آپ نے اٹھائے۔" سعدیہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"آؤ مشرف!" اُسی وقت رئیس احمد نے وہاں آ کر اس سے کہا۔ "ہم دونوں
ادھر چل کر بیٹھتے ہیں، دوسرے کمرے میں، تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

مشرف خاموشی سے اٹھ کھڑا ہوا اور رئیس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلا
مشرف اور رئیس وہاں بالکل اکیلے تھے۔

"دیکھو مشرف!" رئیس نے سنبھل کر بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "جیسا
تمہیں معلوم ہو چکا ہے، ہم لوگوں نے غلطی سے تمہیں یہاں مردہ سمجھ لیا تھا اور اس
کوئی سال بھر کے بعد رقیہ کا بھی انتقال ہو گیا.........."

"اور پھر بھائی جان اور سعدیہ کی شادی ہو گئی۔" مشرف علی نے بہت آہستہ
اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا اور رئیس ایک دم چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھ
میں حیرت تھی۔

"تمہیں.......... تمہیں کس نے بتایا؟" رئیس نے گھبرا کر پوچھا۔

"اس معصوم بچے نے جس نے سعدیہ کو امی کہہ کر مخاطب کیا تھا۔" مشرف
خود اپنی آواز کسی گہرے کنویں میں سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ "اور اس گریز
آپ سب لوگوں نے میرے اس سوال کے جواب میں اختیار کیا تھا کہ یہ بچہ کس کا
میں اسی وقت سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ رئیس بھائی! سب کچھ سمجھ گیا تھا۔" اس کی آ
طرح بھرانے لگی۔

"دیکھو مشرف! حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔" رئیس احمد نے کہا۔ "یقین
اس میں اشرف اور سعدیہ کی مرضی کا قطعاً کوئی دخل نہیں تھا۔ یہ شادی تو میرے

ے اور تمہارے مرحوم والدین کے اصرار پر ہوئی تھی۔ ہم سب لوگوں نے ان دونوں پر
ت زیادہ زور دیا تھا۔"

"آپ لوگوں نے ٹھیک کیا تھا، رئیس بھائی!" مشرف علی نے اس کی بات کاٹتے
وئے کہا۔ "آپ لوگوں نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ ان حالات میں اس سے زیادہ بہتر اور
قبول صورت کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔"

"تو اب تم.......... میرا مطلب ہے.......... معاملے کو.........."

"کچھ نہیں رئیس بھائی، کچھ نہیں۔" مشرف علی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے
ہا۔ "جو ہونا تھا سو ہو چکا اور جیسا ہے، ویسا ہی ٹھیک ہے۔ میں اس گھر کے سکون کو برباد
یں کرنا چاہتا۔ سعدیہ اب میری بھابی ہیں، میرے لئے لائق احترام ہیں، بالکل اسی طرح
ں طرح رقیہ بھابی میرے لئے لائق احترام تھیں۔"

"مشرف علی!" رئیس احمد نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "تقدیر نے ہم سب
وں کے ساتھ بڑا خوفناک مذاق کیا ہے۔ ہم کیا کریں مشرف علی! تم بتاؤ؟ ہم کیا کریں؟
ر تم چاہو تو اشرف اور سعدیہ کی طلاق۔"

"خدا کے لئے۔" مشرف نے اپنا کمزور، سوکھا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کر اسے مزید
لئے سے منع کر دیا۔ "ایسی بات زبان پر بھی مت لایئے رئیس بھائی! یہ کبھی بھی نہیں ہو
۔ ہماری زندگیوں کے ساتھ بہت مذاق ہو چکا۔ اب مزید مذاق کی گنجائش نہیں ہے اور
.... میں تو محض ایک سایہ ہوں۔ بیتے ہوئے دنوں کی ایک پرچھائیں ہوں۔
یہ اور بھائی جان کی زندگی جس طرح گزر رہی ہے اسے اسی طرح گزرنے دیجئے۔ میں
یں بالکل دخل دینا نہیں چاہتا۔ آخر وہ دونوں بھی تو میرے اپنے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ
ے لئے بہت کچھ کیا۔"

"اچھا تو پھر ہم یہ کرتے ہیں مشرف علی! کہ تم یہاں سے چلو اور میرے گھر رہو۔"
ں احمد نے تجویز پیش کی۔ "میرے گھر میں بہت گنجائش ہے۔ ویسے بھی ہماری بڑی
ی شادی کے بعد گھر اب سُونا سُونا لگتا ہے۔ تم آ جاؤ گے تو ذرا رونق ہو جائے گی۔"

"جیسی آپ کی مرضی رئیس بھائی!" اس نے آہستگی سے کہا۔ "میں تیار ہوں۔"

وہ رات سعدیہ کے لئے قیامت کی رات تھی۔ وہ شدت غم سے نڈھال ہو ہو جاتی
اس پر نیم بے ہوشی کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور سائرہ بار بار اس کو تسلی دینے کی
ش کرتی تھی۔

"سب ٹھیک ہو گیا ہے سعدیہ!" سائرہ اس سے کہتی۔ "مشرف نے حالات کو قبول کر لیا ہے۔ کل صبح ہم انہیں اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ وہ ہم لوگوں کے ساتھ رہیں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ تم اور اشرف ایک ساتھ رہو اور یہی ٹھیک بھی ہے۔ سعدیہ اب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب بار بار........."

لیکن سعدیہ کے لئے اس صورتِ حال کو جوں کا توں قبول کر لینا کوئی آسان نہیں تھا اور سائرہ بھی اس بات سے بخوبی واقف تھی۔ سعدیہ اب ایک ایسی عورت تھی جسے حالات کی ستم ظریفی نے بیک وقت دو سگے بھائیوں کی بیوی بنا دیا تھا۔ وہ دونوں کے بچوں کی ماں تھی۔ اب وہ کیا کرے؟ اس کا جی چاہتا تھا کہ دوڑ کر جائے، مشرف کے قدموں میں اپنا سر رکھ دے اور رو رو کر اس کے پیروں کو اپنے آنسوؤں سے تر کر دے، اس سے کہے کہ اس نے بے وفائی نہیں کی۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے .... وہ ہمیشہ اس سے محبت کرتی لیکن آخر ایک مردہ شخص سے کہاں تک اور کب تک محبت کی جا سکتی تھی؟ زندہ رہنے والوں کی زندگی کے تقاضوں کو مُردے تو پورا نہیں کر سکتے! مگر سعدیہ یہ سب کس طرح کر سکتی تھی؟ اب اس کا کیا رشتہ تھا؟ دیور کا؟ مگر کیا سماجی رکاوٹیں دلوں کے دروازوں پر بھی تالے ڈال سکتی ہیں؟

اگلے روز مشرف علی وہاں سے چلا گیا۔ رئیس احمد اور سائرہ اسے ساتھ لے گئے۔ یہ لوگ بھی ناظم آباد کے ہی ایک دوسرے علاقے میں رہتے تھے۔ مشرف علی نے جاتے وقت سعدیہ کو خاص طور سے خدا حافظ کہا۔

رئیس احمد اور سائرہ کے گھر مشرف علی کو ایک علیحدہ کمرہ دے دیا گیا اور ان دونوں میاں بیوی نے اس کے آرام کا بہت خیال رکھا لیکن مشرف علی روز بروز بہت زیادہ ڈیپریشن کا شکار ہوتا گیا۔

وہ گھنٹوں بیٹھا یہ سوچا کرتا کہ اس نے یہاں آ کر سخت غلطی کی۔ کاش اسے کسی طرح معلوم ہو جاتا کہ رقیہ مر چکی ہے اور سعدیہ اور اشرف نے شادی کر لی ہے تو وہ بھی یہاں نہ آتا۔ اسے سعدیہ سے آج بھی اتنی ہی محبت تھی اور اشرف کو بھی وہ عزیز رکھتا تھا۔ دونوں اس کے اپنے تھے اور انہوں نے جو کچھ کیا تھا وہ وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔ مشرف علی کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔

اسے اگر شکایت تھی تو اپنے آپ سے، آخر وہ زندہ کیوں ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تو دوسروں کے لئے عذاب بن کر رہ گیا ہے، خود اپنے لئے بھی اور

دوسروں کے لئے بھی عذاب۔ یہاں سب لوگ آرام اور سکون سے رہ رہے تھے۔ اس کی موت پر ہر شخص نے اپنے اپنے حصے کا ماتم کر لیا تھا اور اب اسے فراموش کر دیا گیا تھا۔ ماضی کے تہہ خانوں میں دفن کر دیا گیا تھا لیکن وہ پھر کسی بن بلائے مہمان کی طرح کسی بدروح کی طرح نمودار ہو گیا اور اس نے ان سب لوگوں کے لئے جن سے اسے محبت تھی، ایک عذاب مہیا کر دیا۔ وہ ان سب لوگوں کے لئے فقط باعثِ آزار تھا۔ اس نے ان سب کے سکون کو غارت کر کے رکھ دیا تھا۔

"نہیں .... میری زندگی کسی کام کی نہیں ہے، خود میرے کام کی بھی نہیں ہے۔" اس نے شدید ڈیپریشن کی ابھرتی ہوئی تیز و تند موجوں کے نیچے ڈوبتے ہوئے سوچا۔ "میں جب تک جیوں گا، خود بھی اس خوفناک آگ میں جلتا رہوں گا اور دوسروں کو بھی جلاتا رہوں گا۔ جب تک بھی زندہ ہوں، تب تک نہ سعدیہ چین سے رہ سکے گی، نہ اشرف، نہ میرا بیٹا مظفر......... نہ دوسرے لوگ۔ میرا وجود ان سب لوگوں کے درمیان فاصلے بڑھائے گا اور کدورتوں کو ہوا دے گا اور میں خود......... کیا میں سعدیہ کے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں؟ یہ کیسی زندگی ہے کہ سعدیہ موجود ہے مگر وہ میری نہیں ہے؟ نہیں، مجھے ایسی زندگی نہیں چاہئے۔ میں اس نامراد اور مہمل زندگی کا کیا کروں گا؟ شمع جاں کو گل کر دو۔ شمع جاں کو گل کر دو۔"

20 جنوری 1989ء کی شام کو مشرف علی نے اپنی دواؤں میں سے، جو ڈاکٹر پاٹل نے اسے لکھ کر دی تھیں اور جنہیں وہ اب بھی استعمال کرتا تھا، خواب آور گولیوں سے بھری ہوئی شیشی میں سے ساری گولیاں نکال کر ایک کاغذ کی پڑیا میں باندھ لیں۔ اس نے اپنے کندھے پر وہ کمبل ڈالا جو اسے لانچ میں کالو نے دیا تھا اور خاموشی سے گھر سے باہر نکل گیا۔ اس نے ایک کاغذ پر اپنا نام، رئیس کے گھر کا پتہ اور فون نمبر لکھ کر جیب میں رکھ لیا تھا۔

گھر سے کافی دور جا کر وہ ایک ہوٹل میں داخل ہوا اور اس نے گلاس بھر کر پانی لیا۔ پھر ساری گولیاں یکبارگی حلق میں انڈیل کر اس نے اوپر سے پورا گلاس پانی پی لیا۔ پھر ایک گلاس پانی اور پیا اور ہوٹل سے باہر نکل گیا۔ بہت تیز تیز چلتا ہوا۔

ہوٹل سے کچھ دور پہنچتے ہی اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ فٹ پاتھ پر لیٹ گیا اور اس نے سر سے پیر تک کمبل اوڑھ لیا۔

"اب کوئی فوری طور پر میرے قریب نہیں آئے گا اور مجھے فٹ پاتھ پر سونے والا

کوئی فقیر سمجھ کر نظرانداز کر دیا جائے گا۔" وہ پہلے ہی سب کچھ سوچ چکا تھا۔ "کسی بھی طبی امداد ملنے سے پہلے میں ختم ہو چکا ہوں گا۔ میری جیب میں کاغذ موجود ہے جس پر نام پتہ لکھا ہوا ہے۔ میری لاش شناخت کرنے میں اور میرے لواحقین کو اطلاع دینے میں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔"

لیکن مشرف علی کو یہ بات نہیں معلوم تھی کہ جب اس نے ہوٹل میں گہرے ہیجان و اضطراب اور شدید ڈیپریشن کے عالم میں گولیوں کی پڑیا اپنی جیب سے نکالی تھی' تو اس کے ساتھ ہی وہ کاغذ بھی نکل کر فرش پر گر گیا تھا اور اسے خبر بھی نہیں ہوئی تھی۔

مشرف علی کی فٹ پاتھ پر پڑی ہوئی سردی سے اکڑی ہوئی لاش کو سب سے پہلے سڑک پر جھاڑو لگانے والے جمعدار نے علی الصباح دریافت کیا اور پولیس کو اطلاع دی۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد "نامعلوم" لاش کو مردہ خانے بھجوا دیا۔

مشرف علی کے ورثا اس روز رات گئے اس کی لاش کو تلاش کر سکے اور اگلے دن ضروری کارروائی کے بعد لاش تدفین کے لئے ان کے حوالے کر دی گئی۔ 22 جنوری کے اخبارات میں ناظم آباد کے فٹ پاتھ سے ایک نامعلوم شخص کی لاش کے ملنے کی خبر اخبارات میں شائع ہو چکی تھی۔

اور یوں مشرف علی کی زندگی کی المیہ داستان اپنے اختتام کو پہنچی۔

جب مشرف علی لوگوں کے کندھوں پر سوار اپنی آخری اور ابدی آرام گاہ کی طرف جا رہا تھا تو جنازے میں بہت سے لوگ شامل تھے اور جلوسِ جنازہ نے سڑک کے خاصے بڑے حصے کو گھیر رکھا تھا۔

جنازے کے پیچھے آنے والا ٹریفک تقریباً رک گیا تھا اور بعض گاڑیاں اِدھر اُدھر کی گلیوں میں مڑ گئی تھیں۔

کے ٹو (K-2) کی ایک بس بہت تیز رفتاری کے ساتھ پیچھے سے آئی لیکن راستے میں جنازے کی وجہ سے سڑک کو بند دیکھ کر ڈرائیور نے بس کی رفتار کم کر دی۔

"اوئے' یہ سالا جنازہ کدھر سے آ گیا۔" بس کا ڈرائیور کنڈکٹر پر بڑے زور سے چیخا۔ اس کے لہجے میں سخت جھلاہٹ اور بیزاری تھی۔ "پنجی اٹھ ونجا صبح سے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ سارے ٹرپ کا ستیاناس ہو جائے گا۔"

اور وہ زور زور سے سخت بھیانک آواز والے پریشر ہارن کو بجانے لگا!

☆======☆======☆

بائی پاس

اس نامعلوم چور کی کہانی جس نے اخبار میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق فرار کا راستہ نہ پا کر خودکشی کر لی۔ اس خبر کی تفصیلات کے مطابق کراچی میں بہار کالونی کی ایک عمارت فاطمہ منزل کے ایک فلیٹ میں ایک مسلح چور گھس گیا جس نے اپنے چہرے پر کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ تاہم پڑوسیوں نے شور کر کے عمارت اور فلیٹ کا دروازہ بند کر دیا اور پولیس کو اطلاع دے دی۔ اس دوران نامعلوم چور نے فرار کا راستہ نہ پا کر مبینہ طور پر اپنے ریوالور سے خود کو ہلاک کر لیا۔ پولیس نے لاش تحویل میں لے کر تفتیش شروع کر دی ہے۔

(20 جون 1989ء)

"کیا بات ہے، بہت تھکی ہوئی نظر آ رہی ہو؟" سلیم نے ناصرہ کے مضمحل چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ناصرہ بار بار منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائیاں لے رہی تھی اور اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایک اضمحلالی کیفیت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"ہاں یار!" ناصرہ نے ایک بار پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر منہ پھاڑ کر جماہی لی اور بوجھل آواز میں بولی۔ "نیند آ رہی ہے بڑی سخت، مَیں نے تو سوچا تھا کہ آج چھٹی کروں گی لیکن سب کی وجہ سے آنا پڑا۔ بس اب میں بھاگ رہی ہوں۔ اب جو جا کر سوؤں گی تو شام تک کی خبر لاؤں گی۔"

"رات بھر کیا جاگتی رہی تھیں؟" سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "کیا پہاڑی کے پتھر ڈھوتی رہی تھیں؟"

"پہاڑی کے پتھر نہیں ڈھوتی رہی تھی جناب!" ناصرہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "لیکن جاگتی ضرور رہی تھی۔ رات کو چار بجے گھر واپس آئی ہوں اور پھر صبح ساڑھے چھ بجے اٹھ گئی۔ یونیورسٹی آنا تھا۔"

"کسی پارٹی میں گئی ہوئی تھیں کیا؟" سلیم نے پوچھا۔

"ارے نہیں بھئی!" ناصرہ نے تقریباً چڑ کر کہا۔ "تمہیں تو کوئی بات یاد ہی نہیں رہتی۔ کل پانچ تاریخ تھی نا؟ میرا مطلب ہے، آج پانچ تاریخ ہے۔ کل رات کو ڈیڈی کی فلائٹ تھی۔ وہ ہوسٹن گئے ہیں، ہم سب لوگ انہیں چھوڑنے ایئرپورٹ گئے تھے۔ وہاں سے واپس آتے آتے رات کے چار بج گئے اور تب کہیں جا کر بستر پر لیٹنے کو ملا ہے..........."

"اوہ، ہاں یاد آیا.......... سوری!" سلیم نے جلدی سے کہا۔ "تم نے بتایا تھا.......... مجھے یاد آ گیا.......... تم نے بتایا تھا کہ تمہارے ڈیڈی بائی پاس کے لئے امریکہ جانے والے ہیں، پانچ تاریخ کو۔ اچھا تو وہ چلے گئے۔ وش یو گڈ لک۔"

"تھینک یو سلیم!" ناصرہ ایک دم سے اداس ہو گئی۔ "مجھے ڈیڈی کی بہت فکر ہے

خدا کرے وہ ٹھیک ٹھاک ہو کر واپس آ جائیں۔"

"اس میں فکر کی کیا بات ہے؟" سلیم نے آہستہ سے کہا۔ "آج کل تو ہزاروں لاکھوں لوگ بائی پاس کروا رہے ہیں اور زیادہ تر آپریشن کامیاب ہی ہوتے ہیں۔ خاص طور سے مغربی ممالک میں تو.........."

"زیادہ تر، لیکن سو فیصدی نہیں۔" ناصرہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "وہاں بھی ناکام آپریشن ہوتے ہیں۔ میں ڈیڈی کے بارے میں اس لئے زیادہ پریشان ہوں کہ ان کی حالت زیادہ بہتر نہیں ہے۔ یہاں کے ڈاکٹروں نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ ان سے جتنا علاج ہو سکتا تھا وہ کر چکے ہیں اور اب بائی پاس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ڈیڈی تو جانے کو تیار نہیں ہو رہے تھے لیکن ہم سب لوگوں نے انہیں مجبور کیا۔"

"لیکن وہ جانے پر کیوں تیار نہیں تھے؟" سلیم نے تعجب سے پوچھا۔ "جب ڈاکٹروں کے نزدیک بائی پاس ہی آخری علاج تھا تو پھر انہیں باہر جانے میں تکلف کیوں تھا؟"

"بڑا عجیب و غریب فلسفہ ہے ان کا بھی۔" ناصرہ نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "کہتے تھے کہ میں اپنے لوگوں کے سامنے مرنا چاہتا ہوں، سب کے درمیان رہ کر، سب لوگوں کی موجودگی میں اور اگر میں پردیس میں مر گیا تو کوئی بھی تو میرے پاس نہیں ہو گا، اکیلا چپ چاپ مر جاؤں گا اسی لئے ان کا کہنا تھا کہ یہیں رہ کر علاج کرواتے رہیں اور بائی پاس کے لئے باہر نہ جائیں لیکن ہم سب لوگوں نے انہیں بہت مجبور کیا۔ خاص طور سے بھائی جان نے، ممی نے اور میں نے۔ قادر انکل تو ہوسٹن سے بار بار فون کر رہے تھے اور ان کا اصرار تھا کہ ڈیڈی فوراً ہی آ جائیں۔ وہ اپنے تعلقات سے کام لے کر ان کے بائی پاس آپریشن کا بندوبست کرا دیں گے۔ آخر خدا خدا کر کے ڈیڈی کو راضی کیا۔"

"تم بھی ان کے ساتھ کیوں نہیں گئیں؟" سلیم نے ناصرہ سے پوچھا۔ "اس طرح تمہارا امریکہ کا چکر بھی ہو جاتا۔"

"ڈیڈی تو خود مجھے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔" ناصرہ نے اداسی کے ساتھ کہا۔ "بھائی جان تو جا نہیں سکتے تھے کیونکہ اب ڈیڈی کی عدم موجودگی میں سارے بزنس کی دیکھ بھال بھائی جان کو ہی کرنی ہے اور بزنس بھی کوئی چھوٹا موٹا تو ہے نہیں۔ کس قدر شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا تو بزنس ہے.......... ممی کے علاوہ میں ہی ڈیڈی کے ساتھ جا سکتی تھی لیکن ممی نے یہ کہا کہ میں یہیں رہوں ورنہ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ بھائی جان ہیں، فاخرہ ہے، مشرف ہے، اتنے سارے لوگ ہیں گھر میں۔"

"تو یوں کہو کہ اب تم اپنے گھر میں اپنی اماں کی قائم مقامی کر رہی ہو؟" سلیم نے ہنس کر کہا۔ "ایکٹنگ ہیڈ بنی ہوئی ہو؟"

ناصرہ نے اس کی بات کا ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ سامنے سے کچھ فاصلے پر محمود جاتا دکھائی دیا۔ حسب معمول اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا' جس میں سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کی مٹھی سی بنا کر سگریٹ کا ایک لمبا سا کش لیا' اتنا لمبا کش کہ ایک ہی کش میں سگریٹ تقریباً آدھے سے زیادہ ختم ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے منہ سے گہرا گاڑھا اور کثیف دھواں نکال کر فضا میں بکھیر دیا۔ ان دونوں نے محمود کو دیکھا اور محمود نے انہیں دیکھا۔

"ہائی۔" محمود نے سگریٹ والا ہاتھ بلند کر کے ان دونوں کی طرف دیکھ کر اپنی انگلیاں ہلائیں اور وہاں سے چلا گیا۔

"ہائی۔" ناصرہ اور سلیم نے بھی ہاتھ اٹھا کر اس کے "سلام" کا جواب دیا اور محمود جھومتا ہوا آگے نکل گیا۔

"بہت جلدی مر جائے گا بدنصیب۔" سلیم نے اس کی طرف رحم آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے ناصرہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "حالت دیکھ رہی ہو اس کی؟ کیا سے کیا ہو گیا ہے؟ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ .... بُری طرح تباہ ہو رہا ہے........."

"ایک محمود ہی کا کیا رونا ہے۔" ناصرہ نے ایک لمبی اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "کتنے لوگ ہیں' ہزاروں' بلکہ لاکھوں' جو اسی طرح نشے کی لت کا شکار ہو کر برباد ہو رہے ہیں۔ ان کا آخری انجام ایک دردناک موت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے........."

"کوئی بائی پاس کے ذریعے اپنا علاج کرواتا ہے' کوئی ہیروئن اور چرس کی پناہ میں اپنے آپ کو خود فراموشی کے زہر میں غرق کر دیتا ہے۔" سلیم نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ یہ بات ناصرہ کے سامنے بلند آواز میں نہ کہہ سکا۔

"اچھا بھئی ہم تو چلے۔" ناصرہ نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب بیٹھنے کی ہمت نہیں رہی۔ سخت نیند آ رہی ہے۔ بس گھر جا کر خوب لمبی تان کر سو جاؤں گی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اٹھی اور وہاں سے چل دی۔ سامنے کچھ فاصلے پر اس کی نئی ہنڈا سوک کھڑی ہوئی تھی جسے وہ خود ہی ڈرائیو کرتی تھی۔ وہ گاڑی میں بیٹھی اور اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے روانہ ہو گئی۔

سلیم اپنی جگہ بیٹھا ہوا سڑک پر پھسلتی ہوئی اس سفید چمکتی بے داغ اور خوب چمکتی

ہوئی گاڑی کو دیکھنے لگا جو آہستہ آہستہ اس کی نظروں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

ناصرہ کی ہنڈا سوک آہستہ آہستہ نظروں سے غائب ہو گئی اور سلیم اسی جگہ' کراچی یونیورسٹی کے عظیم الشان اور پُرشکوہ کیمپس میں ایک پتلی سی سڑک کے کنارے بنی ہوئی چھوٹی سی پلیا پر بیٹھا رہا۔ ابھی کچھ دیر پہلے یہاں اس پلیا پر اس کے ساتھ ناصرہ بھی بیٹھی ہوئی تھی' ایک کروڑ پتی' بلکہ کون جانے' شاید ارب پتی باپ کی بیٹی' جو سلیم کی کلاس فیلو تھی اور اس کے ساتھ ہی اکنامکس ڈیپارٹمنٹ میں ایم اے کی طالبہ تھی۔ اس کا شمار ڈیپارٹمنٹ کی سب سے زیادہ اسمارٹ اور خوبصورت لڑکیوں میں ہوتا تھا۔ وہ اسپورٹس میں بھی حصہ لیتی تھی' ڈرائیونگ کرتی تھی اور ہر طرح کے ہنگاموں اور تقریبات وغیرہ میں سے کافی دلچسپی لیتی تھی۔ ناصرہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ان لڑکیوں میں سے تھی جو لڑکوں میں سب سے زیادہ مقبول اور پسندیدہ تھیں۔ کانونٹ کی گریجویٹ' انگریزی مادری زبان کی طرح بولتی تھی اور جب بولتی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے کوئل کوک رہی ہو۔

سلیم وہاں سے اٹھنے ہی والا تھا کہ محمود ایک طرف سے پھر نمودار ہو گیا۔ وہ اپنا سگریٹ ختم کر چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تھے' چہرے پر ایک عجیب قسم کی زردی تھی' دھواں دھواں سی زردی اور اس کے ہونٹ بالکل خشک ہو رہے تھے۔ اس کا قد لمبا اور جسم بے حد دبلا پتلا تھا۔ اگر اس کی ہڈیوں پر کچھ زیادہ گوشت موجود ہوتا تو وہ ایک اچھی وجیہہ اور پسندیدہ شخصیت کا مالک ہوتا لیکن اس کے حد سے زیادہ بڑھے ہوئے دبلے پن نے اس کی شخصیت کو بھی بالکل کمزور کر دیا تھا۔ اس کی کمر میں ایک ہلکا سا خم بھی موجود تھا۔ گویا اس کا ضرورت سے زیادہ دبلا جسم درخت کی کسی کمزور اور لچکتی شاخ کی طرح جھک گیا ہو۔

"آؤ محمود!" سلیم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "کہاں گھومتے پھر رہے ہو؟"

"گئی......... چلی گئی؟" محمود نے سلیم کے پاس ہی پلیا پر بیٹھتے ہوئے بھاری اور کسی قدر لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں' چلی گئی........." سلیم نے سرسری انداز میں کہا۔ "لیکن تم نے یہ اپنا کیا حشر بنا رکھا ہے محمود! کیا جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا کوئی عقلمندی ہے؟ ذرا دیکھو' تم کیا تھے اور کیا ہو گئے ہو......... ڈرگ اڈکشن نے تمہیں کہیں کا نہیں رکھا۔"

"اس کے بغیر بھی میں کہیں کا نہیں تھا دوست!" محمود نے سلیم کے کندھے پر اپنا

پتلا، کمزور نحیف سا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اس کے بغیر بھی کیا تھا، کیا تھا میں .... کچھ تھا .... تم ہی بتاؤ؟" اس نے اپنے کمزور اور دبلے پتلے ہاتھ سے سلیم کے شانے پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" سلیم نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انسان اپنے آپ کو تباہ کر ڈالے۔ جان بوجھ کر موت کے منہ میں چلا جائے، آخر یہ کون سی دانشمندی ہے؟"

"میں نے یہ سب کچھ جان بوجھ کر تو شروع نہیں کیا سلیم!" محمود نے جیسے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بجائے اس کے کہ دوسرے مجھے مار دیں کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ میں خود اپنے آپ کو مار لوں؟ لیکن اس طرح کہ دنیا کے ہر دکھ سے، ذلت و خواری کے ہر احساس سے اور ناکامی اور محرومی کے ہر صدمے سے بے نیاز ہو کر رنگ و نور کی حسین اور پُر مسرت، وجدانی دنیاؤں میں پرواز کرتے ہوئے، ان لامحدود وسعتوں میں گم ہو جاؤں جہاں ایک سکون آمیز خود فراموشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے؟ میں دکھوں کا زہر کیوں پیؤں میری جان؟"

"بند کرو اپنا یہ مفلوج اور منحوس فلسفہ۔" سلیم نے برہمی کے ساتھ کہا۔ "اگر تمہیں فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے ہونے کے باوجود نوکری نہیں مل سکی اور اگر تمہارے غریب والدین کے وہ خواب بکھر گئے جو انہوں نے تمہارے لئے دیکھے تھے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے میرے بھائی کہ تم اپنے آپ کو ہیروئن کا عادی بنا کر تباہ کر لو۔ اس طرح تم کس سے انتقام لے رہے ہو، کس کو نقصان پہنچا رہے ہو؟"

"میں کسی سے انتقام نہیں لے رہا ہوں سلیم، میرے پیارے دوست!" محمود نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا۔ "میں کس کس سے انتقام لوں گا؟ دشمنوں کی تعداد تو بہت زیادہ ہے اور میری ایک جان ناتواں۔ میں بھلا انتقام کس طرح لے سکتا ہوں؟ میں تو کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا رہا ہوں، سوائے اپنے آپ کے۔ کسی کو بھی دکھ نہیں دے رہا ہوں، میرے بھائی!"

"تو پھر اس سے کیا فائدہ محمود!" سلیم نے قدرے نرم اور دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم آخر کو آپریٹ کیوں نہیں کرتے؟ میں تم کو اپنے ساتھ ڈاکٹر کے پاس لے چلوں گا۔ تمہارا علاج کرواؤں گا، تمہاری یہ عادت چھوٹ جائے گی۔"

"اچھا چلو چھوٹ گئی۔" محمود نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا۔ "پھر .... پھر کیا ہو

گا؟ پھر میں اپنی اس عظیم المرتبت شخصیت سے معاشرے کو کون سا فائدہ پہنچاؤں گا، کیا تیر مار لوں گا میں؟ نہیں سلیم! مجھے میرے حال پر ہی چھوڑ دو۔ میرے مسائل کا حل اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے۔"

سلیم نے بڑی اداسی کے ساتھ اسے دیکھا اور گردن جھکا لی۔

محمود کو پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کئے ہوئے دو سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنے زمانے میں اپنے شعبے کا بہترین طالب علم تھا۔ اس نے فائنل کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن لی تھی اور تب سے لے کر اب تک وہ اپنی ڈگریوں کی ردی کو سنبھالے ہوئے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹکتا پھرتا تھا۔ دھکے کھاتا پھرتا تھا اور کسی نے اس کو کہیں معمولی سی نوکری بھی نہیں دی تھی۔ وہ نچلے متوسط طبقے کے ایک گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اور بالکل معمولی سی حیثیت کے مالک اس کے باپ کے پاس کوئی سفارش نہ تھی جو وہ اپنے بیٹے کی ترقی کے لئے استعمال کر سکتا۔ اُس کے پاس اپنے لائق، عالم فاضل اور ہوشیار بیٹے کے لئے نیک خواہشات اور دلی دعاؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا لیکن نوکری کی مارکیٹ میں ان چیزوں کی دو کوڑی کی بھی قدر و قیمت نہیں تھی۔ نوکری کے لئے جو کچھ درکار تھا محمود کے غریب والدین کی دسترس میں نہیں تھا اور بہت جلد محمود کو اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ اس کے پاس فرسٹ کلاس ایم اے کی جو ڈگری اور اس سے پہلے کی جو ڈگریاں اور سرٹیفکیٹ موجود ہیں، ان کی اوقات ردی کے ٹکڑوں سے زیادہ کی نہیں ہے۔

محمود کے دو بھائی اور تھے جو دونوں، محمود سے بڑے تھے اور نیم خواندہ تھے۔ وہ دونوں کوئی نوکری نہیں کرتے تھے، کیونکہ ایک تو وہ تعلیم یافتہ نہیں تھے اور دوسرے انہیں نوکری کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بڑے بھائی کی لائنز ایریا میں ڈینٹنگ پینٹنگ کی دکان تھی اور وہ اچھے خاصے پیسے کما لیتا تھا۔ اس سے چھوٹا الیکٹریشن تھا اور ایک دکان پر بیٹھتا تھا۔ اس کی اپنی تو کوئی علیحدہ دکان نہیں تھی لیکن جس دکان پر وہ بیٹھتا تھا وہاں سے اسے اچھی خاصی آمدنی ہو جاتی تھی اور دکاندار کو اس کا معمولی سا کمیشن دے کر بھی وہ روزانہ ٹھیک ٹھاک پیسے بچا لیتا تھا۔ دکاندار کا تو اصرار نہیں تھا کہ وہ اسے کمیشن دے کیونکہ ایک اچھے الیکٹریشن کی دکان پر موجودگی سے اسے خود بھی فائدہ پہنچتا تھا لیکن محمود کا بھائی اسے خود ہی تھوڑا بہت کمیشن دے دیا کرتا تھا کہ اس کی دکان پر بیٹھنے کا سلسلہ جاری رہے۔

دونوں بڑے بھائیوں کے برخلاف جو نیم خواندہ تھے لیکن اپنے اپنے پیشے اور ہنر سے وابستہ رہ کر اپنی گزر اوقات کے لئے اچھے خاصے پیسے کما لیتے تھے، محمود کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا اور اس کے والدین اس کے اس شوق میں برابر کے شریک تھے۔ ان کے تین بیٹوں میں اگر ایک بیٹا بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو جائے تو یہ کتنی اچھی بات ہو گی چنانچہ محمود کے والد نے اپنے محدود وسائل کے باوجود محمود کی تعلیم پر پوری توجہ دی اور محمود تعلیم کے میدان میں غیر معمولی طور پر ذہین ثابت ہوا۔ اسکول میں اپنی کلاس میں فرسٹ آنے کا جو سلسلہ اس نے شروع کیا اسے اپنے سارے تعلیمی کیریئر میں جاری رکھا اور ایم اے بھی اس نے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔

اس کے والدین اور دونوں بڑے بھائیوں کو اس بات کا یقین تھا کہ اتنے اچھے نمبروں سے امتحان پاس کرتے ہی محمود کے سامنے نوکریاں قطار باندھے، دست بستہ کھڑی ہوں گی اور محمود کی مرضی ہو گی کہ ان میں سے جس نوکری کا چاہے انتخاب کر لے۔ خود محمود کو بھی یہ توقع تھی کہ اسے کوئی نہ کوئی اچھا جاب مل جائے گا۔

لیکن نوکریوں کی دست بستہ قطاریں کہیں بھی نمودار نہیں ہوئیں اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ محمود کی ناامیدی اور مایوسی میں اضافہ ہوتا گیا۔ معمولی درجے کی نوکریاں دینے سے اس لئے انکار کر دیا گیا کہ وہ نوکریاں اس کے تعلیمی معیار کے مقابلے میں بہت حقیر تھیں اور جو نوکریاں اس کے تعلیمی معیار کے مطابق تھیں وہ اس کی دسترس سے باہر تھیں کیونکہ وہ ان کے حصول کے لوازمات کا حامل نہیں تھا۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے اپنی ذات پر سے اس کا اعتماد کم ہوتا گیا۔ ایقان کی جس روشنی سے اس نے اپنے وجود کو ہمیشہ روشن رکھا تھا۔ وہ روشنی دھیرے دھیرے مدھم، زرد اور مریل ہوتی گئی۔ اس کے باطن میں ابھرنے والی وہ زندگی آمیز قوتیں جو اسے حرارت اور توانائی بخشتی تھیں رفتہ رفتہ سرد پڑنے لگیں۔ وہ اندر سے ٹوٹنے لگا تھا۔

ناامیدی اور مایوسی کے غلبے نے اس کی شخصیت کو مسخ کرنا شروع کر دیا اور جب اس کے وجود کی نفی کی گئی، اس کی انا کی توہین کی گئی اور اس کی ذہانت اور صلاحیت کو پیہم مسترد کیا گیا تو وہ ان جان لیوا صدموں سے نڈھال ہوتا گیا۔ اس کے دل میں یہ قاتل اور مہلک احساس بڑی شدت کے ساتھ جاگزیں ہوتا جا رہا تھا کہ اس کی کسی کو ضرورت نہیں ہے، وہ قطعی طور پر ایک غیر ضروری شے ہے، اپنے گھر میں بھی، خاندان میں بھی اور دنیا میں بھی۔

اور تب نہ جانے کس طرح، کس کے ایما پر اس نے اپنی زخمی روح کو، اپنے خون روتے ہوئے دل کو وقتی طور پر تسکین دینے کی غرض سے ہیروئن کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔

ہیروئن یونیورسٹی میں بھی بہت تھی اور یونیورسٹی کے باہر بھی، شہر میں جگہ جگہ بآسانی دستیاب تھی۔ 1979ء کے بعد سے پاکستانی معیشت اور پاکستانی کلچر میں جن چیزوں نے سب سے زیادہ فروغ پایا تھا اور ناقابلِ یقین حد تک ترقی کی تھی ان میں رشوت خوری کے علاوہ ہیروئن اور اسلحہ شامل تھے۔

اور اس طرح ہیروئن نے محمود کی صحت کو گھن کی طرح چاٹنا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا صحت مند، توانا اور نوجوان جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا۔ اس کی شکل اتنی زیادہ بدل گئی تھی کہ اسے پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔

لیکن اس کا خیال تھا کہ اس طرح اس نے اپنی روح کو ان ناقابلِ علاج صدمات کے بوجھ سے آزاد کر لیا ہے جو اس کے وجود کو کھائے جا رہے تھے۔

ہیروئن کا نشہ کرنے کے بعد وہ اپنے آپ کو دنیا کے ہر غم سے بالکل آزاد اور بہت ہلکا پھلکا پاتا تھا۔ اس طرح اس نے زندگی کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے بجائے اس سے فرار و گریز کا راستہ اختیار کر لیا تھا اور اب وہ اکثر اوقات یونیورسٹی کے کوریڈورز میں کسی بھوت کی طرح منڈلاتا ہوا نظر آتا تھا۔ یونیورسٹی میں ایسے طلبا کی کمی نہیں تھی جو یونیورسٹی کیمپس کے اندر ہی ہیروئن کے دم لگاتے تھے اور محمود بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ اگرچہ اب یونیورسٹی کا طالب علم نہیں تھا کیونکہ پولیٹیکل سائنس میں ایم اے کرنے کے بعد اس نے کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں داخلہ نہیں لیا تھا لیکن وہ اب بھی ہفتے میں دو ایک دن یونیورسٹی کا چکر ضرور لگاتا تھا۔ اپنے دوستوں سے ملتا تھا اور اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا رہتا تھا۔ اسے واپس جانے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی تھی۔ اسے تو کہیں بھی نہیں جانا ہوتا تھا۔

سلیم اور محمود پرانے دوست تھے، کالج کے زمانے میں جہاں محمود سلیم سے سینئر تھا لیکن پھر بھی ان دونوں میں گہری دوستی تھی اور دوستی کا یہ سلسلہ یونیورسٹی آنے کے بعد بھی باقی رہا اور آج بھی باقی تھا۔ محمود کی حالت دیکھ کر سلیم کا دل کڑھتا تھا اور اس نے اس کو سمجھانے کی اور اس کی مدد کرنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اسے کوئی کامیابی حاصل نہ ہو سکی تھی۔ محمود تو روز بروز زیادہ ہی نیچے گرتا جا رہا تھا۔ فرسٹریشن کا زہر اس کے رگ و پے میں اتر گیا تھا اور اس کے وجود کو چاٹ رہا تھا۔ چاٹ چاٹ کر اسے بالکل

کھوکھلا کر رہا تھا۔

سلیم نے محمود کے چہرے کی طرف دیکھا' اس کی آنکھیں ڈگر ڈگر کر رہی تھیں اور اچانک سلیم کو خوف محسوس ہوا۔ اسے یوں لگا جیسے یہ کسی زندہ آدمی کی آنکھیں نہ ہوں' یہ کسی مردہ آدمی کی آنکھیں ہوں۔ ان میں اسے موت کی زردی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

اور اگر یہ مردہ آدمی کی آنکھیں نہیں بھی تھیں' تو بھی یہ ایک مرتے ہوئے آدمی کی آنکھیں ضرور تھیں۔

"بری بات چھوڑو۔" محمود نے ایک کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے سلیم کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "میں جیسا بھی ہوں' بس ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ معاملہ کہاں تک پہنچا؟ کچھ بات بنی؟"

"کون سی بات یار!" سلیم نے تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ "آخر کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جو کچھ کہنا چاہتا ہوں' وہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔" محمود نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی اگر میری زبان سے صاف صاف سننے کا شوق ہے تو سن لو۔ میں تمہارے اور ناصرہ کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ معاملاتِ عشق کہاں تک پہنچے؟"

"نہ یہاں کوئی عشق ہے اور نہ کوئی معاملات ہیں۔" سلیم نے ایک نیم سنجیدہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "جو کچھ بھی ہے' وہ صرف تمہاری غلط فہمی ہے۔ بھلا کہاں وہ اور کہاں میں؟ ہمارے درمیان ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہو سکتی ہے۔"

"پرلے درجے کے احمق ہو تم۔" محمود نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ارے بھئی صاف ظاہر ہے کہ وہ تم سے محبت کرتی ہے' چاہتی ہے تمہیں اور تمہیں چاہئے کہ اس چاہت کی قدر کرو سلیم! یہ چاہت بہت قیمتی ہے۔ اگر ناصرہ جیسی لڑکی تمہیں پسند کر لے' تمہیں اپنا آئیڈیل بنا لے تو تمہاری قسمت ہی بدل جائے گی۔ سارے دلدر ہمیشہ کے لئے دور ہو جائیں گے۔ تم وہ سب کچھ حاصل کر لو گے جس کی تمہیں ضرورت ہے۔"

"نہیں محمود!" سلیم نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "میں اور ناصرہ صرف یونیورسٹی کی حد تک کے دوست ہیں اور بس۔ اس کے آگے کچھ نہیں۔ ساتھ پڑھنے والے لوگ ویسے بھی ایک دوسرے کے دوست ہی ہوتے ہیں' خواہ ان کی طبقاتی حیثیت کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ یہاں تو وہ لوگ بھی آپس میں دوست ہو سکتے ہیں اور ہوتے

ہیں جن کے والدین کے درمیان باہر کی دنیا میں آقا اور غلام کا رشتہ ہوتا ہے' مالک اور نوکر کا' ایمپلائر اور ایمپلائی کا' محمود اور ایاز کا رشتہ ہوتا ہے۔ میرے اور ناصرہ کے رشتے میں دو ساتھ پڑھنے والوں کے رشتے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ ایک ارب پتی باپ کی بیٹی ہے اور مجھے اپنی حیثیت کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے.........."

"وہ تمہاری طرف جھک رہی ہے سلیم!" محمود نے اس کے کان میں تقریباً سرگوشی میں کہا۔ "اس کے دل میں تمہارے لئے جگہ ہے۔ اس موقع کو ہاتھ سے مت جانے دو.......... ناصرہ جیسی لڑکیاں اتنی آسانی سے دستیاب نہیں ہو پاتیں۔"

سلیم آہستہ سے مسکرا دیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں بے وقوفوں کی جنت میں نہیں رہتا محمود اور نہ مجھے اپنے آپ کو دھوکہ دینے کا شوق ہے۔ میں تو عملی آدمی ہوں اور حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا عادی ہوں۔ چلو اب چلتے ہیں۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

"کیوں؟" محمود نے قدرے ناگواری کے ساتھ کہا۔ "کیا میں کوئی لنگڑا لولا ہوں؟ یا مجھے اپنے گھر کا راستہ نہیں معلوم؟ اور دوسرے یہ کہ ابھی میرا جانے کا ارادہ نہیں ہے۔ میں کچھ دیر اور ٹھہروں گا۔"

"تمہاری مرضی۔" سلیم نے کہا۔ "اچھا مجھے اجازت دو' میں چلتا ہوں۔" اور وہ وہاں سے چل دیا۔

☆======☆======☆

وسیم احمد نے جب اپنے کمرے میں داخل ہو کر سفاری سوٹ کی بش شرٹ اتاری تو وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی اور جگہ جگہ سے' جہاں پسینہ خشک ہو گیا تھا' وہاں اس میں سفید دھبے نمودار ہو گئے تھے۔

اس نے اس بش شرٹ کو اتارا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ سلائی کے دھاگے کا رنگ بہت پھیکا پڑ چکا تھا اور وہ تقریباً سفید ہو رہا تھا۔ خود سفاری سوٹ کے اپنے کپڑے کا رنگ بھی جگہ جگہ سے کچھ گھس گیا تھا اور ایک نظر دیکھنے میں ہی وہ اچھا خاصا پرانا معلوم ہوتا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ اگلے ماہ تم ایک سفاری سوٹ کا کپڑا لے آؤ اپنے لئے۔" اس کی بیوی صفیہ نے کہا' جو اس کے قریب ہی کمرے میں موجود تھی' یہ صفیہ کا روزمرہ کا طے شدہ معمول تھا' اس کا شوہر جیسے ہی شام کو ساڑھے چھ بجے کے قریب یا اس کے کچھ

دیر بعد گھر میں داخل ہوتا تو وہ اس کے ساتھ ہی گھر کے اس کمرے میں آ جاتی جو اس اور اس کے شوہر کا مشترکہ کمرہ تھا۔ وہ اپنے شوہر سے پہلے کمرے کے اندر داخل ہوتی اور فوراً ہی چھت کا پنکھا کھول دیتی۔ وسیم احمد کمرے میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے تو پسینے میں بھیگی ہوئی بش شرٹ یا قمیض اتارتا جس سے اسے سخت وحشت ہو رہی ہوتی اور پھر جوتے موزے اتارتا' پھر وہ باقی کپڑے تبدیل کرنے کے لئے اٹیچڈ باتھ روم میں چلا جاتا۔ جہاں سے وہ ہاتھ منہ دھو کر باہر آتا۔ اس اثنا میں صفیہ کمرے میں ہی موجود رہتی اور اس کے جوتوں موزوں اور بش شرٹ وغیرہ کو ٹھیک سے رکھ رہی ہوتی۔

"اگلے ماہ سفاری سوٹ کا کپڑا لے آؤ اور اس سے اگلے ماہ سلوا لینا۔" صفیہ نے قدرے توقف کے بعد اپنی بات جاری رکھی۔

"فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وسیم احمد نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کو ملا کر تین سفاری سوٹ ہیں میرے پاس۔ کئی بش شرٹیں اور قمیضیں بھی ہیں۔ ابھی تو سال دو سال تک بڑے آرام سے کام چلتا رہے گا۔ بے کار پیسے ضائع کرنے سے کیا فائدہ؟"

"اس میں پیسے ضائع کرنے کی کیا بات ہے؟" صفیہ نے قدرے اداسی کے ساتھ کہا۔ "یہ پیسے تو تمہاری ضرورت پر خرچ ہوں گے۔"

"مجھے فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے صفیہ!" وسیم احمد نے ہولے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جو کچھ میرے پاس ہے' وہ بہت کافی ہے۔ گزارہ ہی تو کرنا ہے کسی نہ کسی طرح۔ بس ہو رہا ہے گزارہ۔"

"مگر تمہیں روزانہ دفتر جانا ہوتا ہے۔" صفیہ نے کہا۔ "اتنے بہت سے لوگوں کے درمیان رہنا پڑتا ہے۔ آخر آدمی کو اپنا خیال تو رکھنا چاہئے۔"

"جن لوگوں کے درمیان میں رہتا اور کام کرتا ہوں ان سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ مجھے کتنی تنخواہ ملتی ہے۔" وسیم احمد نے مسکرا کر کہا۔ "وہ سب یہ بھی جانتے ہیں کہ میرے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں۔ اس لئے کوئی بھی میرے بارے میں کچھ بھی خیال نہیں کرے گا اور اب تم مہربانی کر کے میرے سفاری سوٹ کی فکر چھوڑ دو اور یہ بتاؤ کہ کیا تم شمسہ خالہ کی طرف گئی تھیں؟"

"ہاں گئی تھی۔" صفیہ نے آہستہ سے دبی زبان سے کہا۔ "میں نے ان سے بہت شکایت کی کہ انہوں نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی تھی۔"

"پھر' کیا کہنے لگیں وہ؟" وسیم احمد نے بے صبری کے ساتھ پوچھا۔

"بس کہنا کیا تھا۔" صفیہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "بہت چبا چبا کر باتیں کر رہی تھیں لیکن مطلب صاف ظاہر تھا اور وہ یہ کہ ان لوگوں کو لڑکی تو ضرور پسند ہے لیکن گھرانا وہ ذرا اور اونچا چاہتے ہیں۔ میں نے شمسہ خالہ سے کہا کہ یہ بات تو انہیں پہلے ہی ان لوگوں کو بتا دینی چاہئے تھی۔ ہماری جو حیثیت ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔ کسی سے ڈھکی چھپی تو نہیں ہے۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انہوں نے تو ان لوگوں کو سب کچھ تفصیل سے بتا دیا تھا لیکن پھر بھی ان لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ لڑکی کو دیکھیں گی' اس لئے وہ انہیں لے کر آ گئی تھیں۔"

"لعنت بھیجو۔" وسیم احمد نے قدرے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "ہمارا گھرانا جیسا بھی ہے' بس ایسا ہی رہے گا۔ ہم اسے بدل تو نہیں سکتے۔"

"بدل بھی سکتے ہیں۔" صفیہ نے قدرے نرمی کے ساتھ کہا۔ "ابھی نہ سہی تھوڑے عرصے کے بعد بدل سکتے ہیں۔ جب سلیم اکنامکس میں ایم اے کر لے گا اور اسے کوئی اچھی سی نوکری مل جائے گی۔"

"تو کیا ہو گا؟" وسیم احمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "سلیم کے پاس کوئی الٰہ دین کا چراغ تو نہیں آ جائے گا جو وہ دم کے دم میں سارے گھر کے حالات کو بدل کر رکھ دے؟ اور پھر........ یہ سب کچھ سلیم کی ذمہ داری نہیں ہے۔ یہ میری ذمہ داری ہے۔ سلیم کی اپنی زندگی ہے اور اسے اپنے انداز میں زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔ شاہدہ اور ماجدہ میری بیٹیاں ہیں' سلیم کی نہیں۔"

"لیکن وہ سلیم کی بہنیں تو ہیں۔" صفیہ نے اس سے جرح کرتے ہوئے کہا۔

"یہ محض اتفاق ہے کہ وہ اس کی بہنیں ہیں۔" وسیم احمد نے کہا۔ "لیکن انہیں اس دنیا میں لانے کا ذمہ دار وہ نہیں ہے۔ میں ہوں اور جو ذمہ داری میری ہے اسے میں خود پورا کروں گا۔"

"خیر' تم ضرور شوق سے پوری کرو۔" صفیہ نے کہا۔ "لیکن بھائیوں کی بھی اپنی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

وسیم احمد نے بیوی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور باتھ روم میں جا کر کپڑے بدلنے لگا۔ سارے کپڑے پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ اس نے شلوار قمیض پہن کر ہاتھ منہ دھویا اور پھر باہر نکل کر آرام سے بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ یہ بھی اس کے معمولات میں

شامل تھا۔ دفتر سے آنے کے بعد وہ کچھ دیر کے لئے بستر پر ضرور دراز رہتا تھا اور باقی کام اس کے بعد کرتا تھا۔

وسیم احمد ایک نیم سرکاری ادارے میں ہیڈ کلرک تھا اور گزشتہ تیس سال سے اسی ادارے میں کام کر رہا تھا۔ بعض لوگوں کے ساتھ بھی عجیب طرح کی ستم ظریفی ہوتی ہے۔ وہ ساری زندگی کسی ایک ہی ادارے میں اس طرح کام کرتے رہتے ہیں گویا وہ صرف اسی ادارے میں کام کرنے کے لئے پیدا ہوئے تھے۔ برسیں گزر جاتی ہیں' سینکڑوں لوگ وہاں آتے اور جاتے رہتے ہیں لیکن یہ لوگ کچھ اس طرح جم کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتے ہیں کہ ہلنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہوتے ہیں جو خود ہی حد سے زیادہ سہل انگار اور قناعت پسند ہونے کے باعث کسی ترقی کی' کوئی بہتر راستہ تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ وہ بس اپنی اسی نوکری اور اسی پوسٹ پر اللہ توکل کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور پھر خاموشی سے کام کرتے ہوئے پوری عمر گزار دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کا تقدیر ساتھ نہیں دیتی۔ وہ اپنے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کامیاب نہیں ہو پاتے۔

وسیم احمد بھی موخرالذکر قسم کے لوگوں میں سے تھا۔ اس میں جذبے اور امنگوں کی کمی نہیں تھی۔ آج سے تیس سال پہلے ایک نوجوان کی حیثیت سے وہ اس ادارے میں ایک دفتری بھرتی ہوا تھا' ایک نان میٹرک دفتری' اس نے صرف نویں جماعت تک تعلیم حاصل کی تھی اور پھر نامساعد گھریلو حالات کے باعث فوری طور پر نوکری کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ آج سے تیس سال پہلے ایک نان میٹرک کی حیثیت سے اس نے دفتری کے کام کا آغاز کیا اور اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اب وہ اپنی ساری عمر اسی دفتر میں کام کرتے ہوئے گزار دے گا۔ اس وقت تو اس نے صرف ایک عارضی بندوبست سمجھا تھا لیکن پھر اس بندوبست نے ایک مستقل صورت اختیار کر لی۔ اس میں وسیم احمد کوئی دخل نہیں تھا۔ اس نے تو کئی اور جگہوں پر ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کوئی بھی ملازمت اس سے زیادہ بہتر نہ مل سکی۔ جیسی کہ اس کی موجودہ ملازمت چنانچہ وہ اس کو چھوڑ نہ سکا۔

اسی اثنا میں اس نے ایک شام کے اسکول میں داخلہ لے کر میٹرک کی تیاری شروع کر دی۔ دفتر میں دفتری کی نوکری کرتے ہوئے اسے چار سال کا عرصہ گزر گیا تھا کہ اس نے میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ اس نے ایک پرائیویٹ امیدوار

حیثیت سے امتحان دیا تھا۔

میٹریکولیٹ ہو جانے کے بعد اس کی ترقی ہو گئی اور اسے دفتری سے کلرک بنا دیا گیا۔ برسہا برس تک وہ کلرک کے طور پر کام کرتا رہا اور پھر اسے ہیڈ کلرک کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

اور آج بھی وہ اسی ہیڈ کلرک کے عہدے پر فائز تھا اور اسی عہدے پر اسے ریٹائر بھی ہو جانا تھا۔ اب مزید ترقی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ترقی کا دور تو گزر گیا تھا۔ ترقی کی عمر بھی گزر گئی تھی۔ اب تو ریٹائرمنٹ میں محض تھوڑا سا عرصہ باقی تھا۔

جس جگہ کام کرتا تھا وہاں رشوت لینے کا کوئی امکان نہیں تھا اور وسیم احمد تمام لوگوں کے سامنے یہ بات بڑے فخر سے کہتا تھا کہ اس کی کمائی میں اور اس کے بال بچوں کی پرورش میں' ایک پائی بھی حرام کی شامل نہیں ہے اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہے جن کی اولادوں کی ہڈی بوٹی رشوت کی بنی ہوئی ہے۔

وسیم احمد کی بیوی صفیہ ایک بالکل معمولی پڑھی لکھی عورت تھی اور اس کا تعلق بھی ایک بہت غریب گھرانے سے تھا' وہ شادی سے پہلے بھی تنگ دستی اور عسرت کی زندگی گزار رہی تھی اور شادی کے بعد بھی ساری عمر ترس ترس کر زندگی کی گاڑی کھینچتی رہی۔

شادی ہونے کے فوراً ہی بعد اس نے اپنے شوہر کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ ایک مکان کے حصول کی کوشش شروع کر دے اور وسیم احمد اس پر بخوشی تیار ہو گیا۔ اپنا ذاتی مکان ہونا کتنی بڑی راحت اور سہولت کی بات تھی' سر پر اگر ایک مضبوط چھت موجود ہو' خواہ وہ چھوٹی سی ہی کیوں نہ ہو' تو آدمی اپنے آپ کو بہت مطمئن محسوس کرتا ہے۔ چنانچہ وسیم احمد نے نہایت محدود وسائل کے باوجود اس کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔

یہ وہ دور تھا جب بہت کم آمدنی والے لوگ بھی چھوٹے موٹے ذاتی مکان کا خواب دیکھ سکتے تھے اور کسی طرح کھینچ تان کر اس خواب کو پورا بھی کر سکتے تھے۔ دونوں میاں بیوی نے ایک ایک پائی بچانی اور جوڑنی شروع کر دی اور پھر کچھ نہ کچھ کر کے انہوں نے دستگیر سوسائٹی میں ایک سو بیس گز کا ایک پلاٹ حاصل کر لیا۔ کچھ پیسے صفیہ کے پاس تھے وہ اس نے شامل کئے اور اس طرح پلاٹ کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ اس کے بعد ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن میں قرضے کی درخواست دے کر قرضہ حاصل کیا اور اس طرح ایک

سادے، کم لاگت والے اور معمولی سے مکان کی تعمیر عمل میں آ گئی، جو خالصتاً وسیم احمد اور اس کی بیوی کی ملکیت تھا۔

اور وہ دن ان دونوں کی زندگی کا سب سے زیادہ پُرمسرت اور یادگار دن تھا جب وہ اپنے نئے مکان میں منتقل ہوئے تھے۔ وہ اس دن کو آج تک نہیں بھولے تھے کیونکہ ان کی زندگیوں میں اس سے زیادہ پُرمسرت اور کوئی دن اب تک نہیں آیا تھا۔

مکان تو بن گیا لیکن قرضے کی قسط ادا کرتے کرتے آدھی سے زیادہ عمر بیت گئی۔ تاہم اس بات کی خوشی تھی کہ سر چھپانے کا ایک ٹھکانہ تو موجود ہے۔ آج کے دور میں تو اس چھوٹے سے مکان کی قیمت کئی لاکھ روپے تھی اور اب اگر وسیم احمد کو ایسی ایسی چار پانچ زندگیاں بھی مل جاتیں اور وہ یہ ساری زندگیاں انہی تنخواہوں پر کام کرتے ہوئے گزارتا تو بھی وہ ایسا مکان نہیں بنوا سکتا تھا۔

وسیم احمد اور صفیہ کا سب سے بڑا بیٹا سلیم تھا، جو اس وقت یونیورسٹی میں اکنامکس میں ایم اے کے آخری سال میں تھا۔ اس سے دو سال چھوٹی شاہدہ تھی جو بی ایس سی کے آخری سال میں تھی اور سب سے چھوٹی ماجدہ تھی، جو فرسٹ ایئر سائنس میں تھی۔ دونوں لڑکیاں جوان تھیں، ان کی شادی کا بوجھ ماں باپ کے کندھوں پر تھا۔

وسیم احمد نے اپنی تینوں اولادوں کی پرورش ایک خاص انداز میں کی تھی اور ان کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی تھی۔ وہ ان روایتی باپوں سے بالکل مختلف تھا جو اولادوں سے طرح طرح کے مطالبات کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ زندگی بھر جن غلطیوں اور حماقتوں کا ارتکاب کرتے آئے ہیں ان کی اولاد ان کا بھگتان بھگتے اور بگڑے ہوئے معاملات کو درست کرے۔ وسیم احمد کا طرز عمل اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے اپنی اولادوں کی ضروریات کو اپنے مقدور بھر پورا کرنا ہمیشہ اپنا فرض سمجھا اور اس فرض کو نبھاتے نبھاتے اس کے سر کے بال وقت سے بہت پہلے سفید ہونا اور گرنا شروع ہو گئے تھے اور اب تو اس کا آدھے سے زیادہ سر گنجا ہو چکا تھا اور جو بال بچے بھی تھے وہ سارے کے سارے بالکل سفید تھے۔

وہ اپنے بیٹے سلیم پر بار بار یہ بات واضح کر چکا تھا کہ شاہدہ اور ماجدہ اپنے بھائی کی نہیں اپنے باپ کی ذمہ داری ہیں۔

سلیم جانتا تھا کہ اس کا باپ اسے گھر کی ہر فکر سے آزاد کرنا چاہتا ہے اور اس گھر کی ساری ذمہ داریوں کو وہ اپنی اور صرف اپنی ذمہ داریاں قرار دیتا ہے جن میں حصہ بٹانے کی

وہ اپنے بڑے اور واحد بیٹے سے کوئی آرزو نہیں رکھتا۔ وسیم احمد بہت مختلف قسم کا باپ تھا۔

لیکن سلیم گھر کی حالت سے، گھر میں جو کچھ موجود تھا، اس سے بخوبی واقف تھا، ایک ہیڈ کلرک کمانے والا اور گھر کے کل پانچ افراد کھانے والے اور صرف کھانے کا ہی خرچہ نہیں تھا، تین جوان اولادوں کی اعلیٰ تعلیم اور ان کے دیگر اخراجات کا بھی مسئلہ تھا۔

دونوں لڑکیاں تو سائنس کی طالبات تھیں اور یہ انتخاب انہوں نے خود اپنی مرضی سے کیا تھا۔ البتہ سلیم نے آرٹس کو ترجیح دی تھی اور اس کا ارادہ اکنامکس میں ایم اے کرنے کا تھا۔ میٹرک کے زمانے سے ہی اس کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ اکنامکس میں امکانات بہت ہیں اور اس مضمون کے ماسٹرز کو نوکریاں آسانی سے مل جاتی ہیں اور اچھی نوکریاں مل جاتی ہیں۔

سلیم سے اور دونوں لڑکیوں سے گھر کی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ خرچہ کسی نہ کسی طرح چل جاتا تھا کیونکہ سلیم اور شاہدہ دونوں نے میٹرک کے بعد سے ہی ٹیوشن شروع کر دیئے تھے اور وہ دونوں بہن بھائی ٹیوشنوں سے اتنی رقم کما کر لے آتے تھے کہ گھر کے اخراجات میں اچھی خاصی مدد مل جاتی تھی لیکن لڑکیوں کے جہیز کے نام پر گھر میں کوئی بھی قابل ذکر چیز نہیں تھی۔ جو کچھ تھا، وہ بہت معمولی، محض برائے نام تھا۔ وسیم احمد کے ریٹائرمنٹ میں ابھی چند برس باقی تھے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اچھی خاصی رقم مل جاتی اس رقم سے کسی ایک بیٹی کی شادی تو نشتم پشتم ہو سکتی تھی لیکن اس سے پہلے تو بس اللہ کا نام تھا۔ واحد صورت یہ ہو سکتی تھی کہ وسیم احمد اپنے دفتر سے اپنے فنڈ سے کچھ رقم قرض لے لے۔ اسی میں کھینچ تان کر کچھ کام چلایا جا سکتا تھا۔ غریبانہ قسم کی شادی ہو سکتی تھی۔

مہینوں گزر جاتے تھے اور گھر میں کوئی اچھا اور قیمتی کھانا نہیں پک پاتا تھا۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اخراجات، دیگر اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ کچھ بچانے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ روز بروز بڑھتی ہوئی مہنگائی نے بالکل خون چوس کر رکھ دیا تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مہنگائی، بدحالی اور غربت کی ایک خوفناک چکی ہے جو سارے محنت کش انسانوں کو بری طرح پیس کر ریزہ ریزہ کیے ڈال رہی ہے۔

اس روز رات کے کھانے پر جب ماجدہ نے آلو بینگن کی ترکاری اور روٹی کا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔ ”بکری کے گوشت کا اسٹو پکائے ہوئے بہت دن ہو گئے امی!“

تو سلیم کے دل پر جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

ماجدہ نے سچ ہی تو کہا تھا۔ وہ لوگ تو بکری کے گوشت کا جیسے ذائقہ ہی بھول گئے تھے۔ برسیں گزر گئی تھیں اور گھر میں بکری کا گوشت نہیں پکا تھا۔ پکتا بھی کیسے؟ گائے کا گوشت خریدنے کے لئے بھی پیسے نہیں بچ پاتے تھے' بکری کا گوشت کہاں سے آتا؟

"کچھ خبر بھی ہے کیا بھاؤ ہے آج کل بکری کا گوشت؟" شاہدہ نے اپنی چھوٹی بہن کو گھورتے ہوئے کہا۔ "پچاس روپے کلو .... کیا سمجھیں جناب! ایک کلو گوشت کی قیمت پچاس روپے۔ بھلا کچھ حد ہے اندھیر گردی کی' آدمی کیا کھائے اور کیا نہ کھائے؟"

"اور اس کے باوجود دکانوں پر خریداروں کا رش بھی دیکھ لو۔" ماجدہ بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چیزیں مفت میں تقسیم کی جا رہی ہیں۔"

"بات یہ ہے بیٹی کہ ایک طبقہ وہ ہے جس کے پاس' پیسے کی کوئی کمی نہیں ہے۔" وسیم احمد نے کہا۔ "حرام کی دولت کی جو گنگا اس وقت پاکستان میں بہہ رہی ہے اس کے سامنے ساری دنیا کے سمندروں کی وسعتیں بھی کم ہیں۔ اس گنگا میں ہاتھ دھونے کی سب کو اجازت ہے' بشرطیکہ اس میں اس کے لئے حوصلہ ہو اور وہ ان لوگوں کو ان کا مناسب حصہ دیتا رہے جو ریاستی مشینری کے کرتا دھرتا ہیں۔"

"تم اسٹو کی بات کر رہی تھیں ماجدہ!" صفیہ نے اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ "کل میں تمہارے لئے اسٹو پکا دوں گی' ضرور دوں گی۔ کچھ پیسے ہیں بچے ہوئے' کل ایک پاؤ گوشت منگوا لوں گی بکری کا۔ سلیم بیٹا! یونیورسٹی جانے سے پہلے گوشت لا کر دے جانا۔"

"نہیں امی!" سلیم نے جلدی سے کہا۔ "مجھے قصائی کی دکان پر جا کر ایک پاؤ گوشت خریدتے ہوئے بڑی شرم آئے گی۔"

"اس میں شرم کی کیا بات ہے؟" وسیم احمد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "مجھے صبح دفتر جانے کی جلدی ہوتی ہے اور وقت نہیں ہوتا' ورنہ میں خود لا کر دے جاتا۔ آدمی کو اپنے آپ کو وہی ظاہر کرنا چاہئے جیسا کہ وہ ہے۔"

سلیم نے اپنے باپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور کچھ دیر کے بعد کھانا ختم ہو گیا۔ سب لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ تینوں بھائی بہن پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے لئے یہی سب سے بڑی مصروفیت تھی۔ ایک سو بیس گز کے چھوٹے سے مکان میں ایک چھوٹا سا کمرہ اوپر بنا ہوا تھا۔ یہ صرف پڑھائی کے لئے تھا۔ نیچے کی مختصر

رہائش میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ رہائش اور مہمانداری کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی کی جاسکے۔ اس لئے چار دیواریں کھڑی کر کے ان پر سیمنٹ کی چادریں ڈالی گئی تھیں اور اس طرح ایک کمرہ بنا لیا گیا تھا۔ تینوں بھائی بہن اسی کمرے میں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے اور پھر سونے کے لئے دونوں بہنیں آ جاتی تھیں' سلیم زیادہ تر وہیں سو جاتا تھا۔

"یہ آج تمہیں اسٹو کی کیا سوجھی ماجدہ؟" شاہدہ نے اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔ "ابو اور امی کے سامنے تمہیں اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ہمیں ان کی مجبوریوں کا احساس کرنا چاہئے ماجدہ!"

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو آپا!" ماجدہ نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے بعد میں احساس ہوا کہ واقعی مجھے ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ امی بے چاری نے نہ جانے کس کام کے لئے پیسے رکھے ہوں گے' اب اچھے خاصے پیسے بلاوجہ ضائع ہو جائیں گے۔ ایک پاؤ گوشت ساڑھے بارہ روپے کا آئے گا اور کتنے وقت وہ ہانڈی چلے گی؟ بمشکل ایک وقت۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔" سلیم نے کہا۔ "گوشت کے پیسے ہم امی سے نہیں لیں گے۔ میں خود اپنے پاس سے گوشت لا دوں گا۔ ابھی کچھ بچے ہوئے پیسے میرے پاس موجود ہیں۔"

"مشکل تو یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹی خالی ہاتھ بھی تو نہیں جا سکتے۔" شاہدہ نے کہا۔ "کچھ نہ کچھ رقم تو پاس ہونا ہی چاہئے۔ کبھی نہ کبھی کسی کو چائے بھی پلانی پڑتی ہے۔ آخر ہم صرف دوسروں کی چائے پی کر ہی تو نہیں رہ سکتے۔"

"اسی لئے تو میں ٹیوشن کے پیسوں میں سے تقریباً سو روپے اپنے پاس اوپر کے خرچ کے لئے رکھتا ہوں۔" سلیم نے کہا۔ "لیکن وہ بھی مہینہ ختم ہونے سے بہت پہلے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ بہرحال' کل میں گوشت تو لا ہی دوں گا۔"

اگلے دن جب سلیم گوشت لینے کے لئے قصائی کی دکان پر پہنچا تو وہ بہت جھجک رہا تھا اور اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ قصائی سے کہے کہ وہ ایک پاؤ گوشت دے دے۔ لیکن اس وقت اس کا حوصلہ ایک دم بلند ہو گیا۔ جب ایک عورت نے قصائی سے آدھا پاؤ گوشت مانگا۔

"بکری کا آدھ پاؤ گوشت ...." قصائی نے جانے کہاں سے کچھ پتلا پتلا چھیچھڑوں بھرا گوشت کاٹا جس میں پسلیوں کی ہڈیاں بھی لگی ہوئی تھیں اور تول کر عورت کے

حوالے کر دیا۔ عورت نے پلاسٹک کی وہ ننھی سی تھیلی سنبھالی سوا چھ روپے قصائی کو دیئے اور وہاں سے چلی گئی۔ قصائی نے اسے گوشت کے نام پر جو چند پتلی پتلی پلپلی سی بوٹیاں دے دی تھیں ان کا خدا جانے یہ عورت کیا کرنے والی تھی' کیونکہ ان میں بھی تقریباً آدھی تو ہڈیاں بھری ہوئی تھیں۔

چار اور گاہک ایسے موجود تھے جنھوں نے آدھ آدھ پاؤ گوشت خریدا اور سلیم ان کے مقابلے میں اپنے آپ کو کافی "بہتر" محسوس کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک ایک پاؤ گوشت لینے والے بھی سلیم کے علاوہ کئی لوگ تھے۔

قصائی نے سینے کی کچھ بوٹیاں اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا گردن کا ڈال کر تول پوری کی اور ایک پاؤ بکری کا گوشت سلیم کے حوالے کر کے اس سے ساڑھے بارہ روپے وصول کر لئے۔ سلیم گوشت لے کر واپس گھر آ گیا اور جب اس نے وہ گوشت اپنی امی کے حوالے کیا اور صفیہ باورچی خانے میں اسے سنک میں ایک برتن میں ڈال کر دھو رہی تھی تو سلیم غور سے دیکھ رہا تھا کہ وہ ساڑھے بارہ روپے میں کیا چیز خرید کر لایا ہے اور قصائی نے اسے جو کچھ دیا ہے' اس میں سے کیا کھانے کے قابل ہے۔ کیا پسلیوں کی ان چند پتلی پتلی ہڈیوں کو جن پر تھوڑا سا پتلا پتلا گوشت بھی چپکا ہوا تھا' واقعی "گوشت" کہا جا سکتا تھا؟

"کس قدر خراب گوشت دیا ہے کم بخت نے۔" صفیہ نے گوشت میں پانی ڈال کر اسے دھوتے ہوئے کہا۔ "نری پسلیاں ہی پسلیاں بھر دی ہیں۔ بھلا اس میں رکھا ہی کیا ہے؟"

"بس ماجدہ کی خواہش پوری کرنے کے لئے ہے۔" سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا اب میں چلتا ہوں امی!" اور وہ یونیورسٹی جانے کے لئے روانہ ہو گیا۔

تو اس طرح وسیم احمد کے گھرانے کی زندگی بھی نچلے متوسط طبقے کے ان لاکھوں سفید پوش گھرانوں کی زندگی سے مختلف نہیں تھی جو اخراجات کے دہرے اور تہرے بوجھ کے تلے دبے ہونے کے باعث کھانے پر غالباً بہت کم رقم خرچ کر پاتے ہیں۔ اسی ماحول اور اسی فضا میں سلیم اور اس کی بہنیں پل کر جوان ہوئے تھے اور ان کے آنکھ کھولتے ہی غربت اور محرومی کے زہر نے ان کو چاٹنا شروع کر دیا تھا اور یہ زہر ان کے وجود کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور ان کے دماغوں میں نہ جانے کیسے کیسے عذاب سنسناتے رہتے اور سینوں میں کیسے کیسے جہنم دہکتے تھے اور ابلتے ہوئے عذابوں اور دہکتے ہوئے جہنم کا یہ سلسلہ صرف ان کے وجود تک ہی محدود نہیں تھا۔ لاکھوں کروڑوں وجود تھے جو اس کا

شکار تھے۔

☆======☆======☆

سلیم یونیورسٹی پہنچا تو اپنے ڈیپارٹمنٹ میں جا کر بالکل خاموشی سے ناصرہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ ناصرہ گزشتہ دو روز سے یونیورسٹی نہیں آ رہی تھی اور سلیم اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

اس روز محمود نے شاید نشے کے عالم میں ہی' نیم دیوانگی کے عالم میں ہی جو کچھ کہا تھا اس سے سلیم کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اور ناصرہ کلاس فیلو تھے اور دونوں کے درمیان دوستی اور تعلقات کی نوعیت وہی تھی جو ساتھ پڑھنے والے لڑکے لڑکیوں میں ہوتی ہے اور ناصرہ کے بارے میں سلیم نے کبھی کوئی خواب نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایسا کوئی خواب دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ناصرہ تو اس کی پہنچ سے بہت دور تھی۔ اتنی دور کہ اس کے ذہن میں ناصرہ کے لئے کسی ایسی خواہش کا پیدا ہونا سراسر حماقت کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار دیا جا سکتا تھا۔ بھلا کہاں سلیم کا گھرانا' جہاں مہینوں میں کبھی ایک بار ایک پاؤ بکری کے گوشت کا اسٹو پکانے کے لئے بھی کتنا سوچنا پڑتا تھا اور کہاں ناصرہ کا گھرانا جہاں پلے ہوئے صرف کتوں کے رات کا خرچہ ہی سلیم کے سارے گھرانے کے دن بھر کے باورچی خانے کے خرچ سے زیادہ ہوتا تھا۔

چنانچہ سلیم کے دل میں اس قسم کا کوئی خیال دور دور تک پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک حقیقت پسند انسان تھا اور اس قسم کی روایتی رومانویت پرستی سے کوسوں دور تھا۔ حقیقی زندگی فلموں میں پیش کئے جانے والے بے سر و پا احمقانہ واقعات سے بہت مختلف تھی۔

لیکن اس دن محمود نے جو کچھ کہا تھا' اس نے سلیم کو کافی مضطرب کر دیا تھا۔ یا شاید اس کے لاشعور میں دبی ہوئی کسی نامعلوم خواہش کی چنگاری کو بھڑکا دیا تھا۔ وہ اب زیادہ سے زیادہ ناصرہ کی قربت کے حصول کا متمنی رہتا اور اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا۔ ناصرہ اس سے اچھی طرح ملتی تھی۔ دوستوں کی طرح پیش آتی تھی اور سلیم اس کے رویے میں کوئی خاص بات تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی تک تو اسے بظاہر کوئی خاص بات نظر نہیں آئی تھی' لیکن چونکہ محمود کی باتوں کے نتیجے میں اس کے دل میں ایک بےکلی سی پیدا ہو گئی تھی' اس لئے وہ ناصرہ کے رویے کا بڑی گہری نظروں سے جائزہ لے رہا تھا۔

ناصرہ کے رویے میں شامل جن چھوٹی موٹی باتوں پر وہ پہلے کبھی توجہ نہیں دیتا تھا اب وہ بنظر غائر ان کا جائزہ لینے لگا۔ وہ آج مسکرائی تھی تو کس انداز سے .... اس نے آج یہ بات کہی تھی تو کیوں .... اس کی آنکھوں میں اس وقت کیسے رنگ سے ا... آئے تھے۔

ناصرہ کے دل میں کچھ ہو یا نہ ہو لیکن سلیم کے دل میں خوش گمانی اور خود فریبی کا عمل ضرور شروع ہو چکا تھا۔ اس نے خود تو کبھی ناصرہ سے محبت نہیں کی تھی اور نہ وہ ا... سے محبت کر سکتا تھا کیونکہ ان کے درمیان اس قدر طویل فاصلے حائل تھے کہ ان کو ... کرتے کرتے محبت کا نازک پیکر زخموں سے چور چور ہو جاتا لیکن اگر ناصرہ اس سے محبت کرتی ہے تو پھر وہ کیوں انکار کرے؟ گریز کا راستہ کیوں اختیار کرے؟ اگر اس کی طرف سے پیش قدمی ہوتی ہے تو وہ اس کی پذیرائی کرے گا۔ ضرور کرے گا۔

”وہ میرے خاندانی حالات سے کافی حد تک واقف ہے۔“ وہ دل میں سوچتا۔ ”ا... معلوم ہے کہ ہم لوگ بہت غریب ہیں اور میرے ابو ایک دفتر میں ہیڈ کلرک ہیں اور اسی پوسٹ پر ریٹائر بھی ہو جائیں گے۔ وہ یہ بھی جانتی ہے کہ میری دو نوجوان غیر شادی شدہ بہنیں ہیں جن کی شادی مجھے کرنی ہے۔ وہ سب کچھ جانتی ہے اور اگر اس کے باوجود بھی وہ مجھے پسند کرتی ہے اور میرے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہے تو بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟“

وہ اس خواب کو، اس بے ہودہ خیال کو، اپنے دل و دماغ سے نکالنے کی کوشش بھی کرتا تھا کیونکہ یہ سب کچھ اسے بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا لیکن اس خواب نے اپنی جڑیں کافی گہری کر لی تھیں اور یہ اس کے ذہن کے نہ جانے کون سے نہاں خانوں سے نکل کر سامنے آ گیا تھا اور اب اسے پریشان کر رہا تھا۔ اس کا دماغ اب خود بخود عجیب عجیب افسانوی طرز کے تانے بانے بننے میں لگا رہتا تھا اور اس کے نتیجے میں وہ اپنے اندر تبدیلیاں محسوس کرنے لگا تھا۔ اگرچہ یہ تبدیلیاں بالکل غیر محسوس طور پر رونما ہوئی تھیں لیکن بہرحال یہ تبدیلیاں اپنی جگہ پر موجود تھیں۔

سب سے پہلی اور اہم بات تو یہ تھی کہ اب اس کی آنکھیں ناصرہ کو تلاش کیا کرتی تھیں۔ اس سے پہلے ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ناصرہ کے علاوہ بھی ڈیپارٹمنٹ میں بہت سی لڑکیاں تھیں، اکنامکس ڈیپارٹمنٹ بہت بڑا تھا اور یہاں طلبا و طالبات کی کافی بڑی تعداد موجود رہتی تھی۔ سلیم ایک ذہین اور ہوشیار طالب علم تھا اور سب جانتے تھے کہ وہ

...کو ہے۔ سلیم کی دوستی بہت سے لوگوں سے تھی جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں اور ان لڑکیوں سے اور ناصرہ سے بھی، اسی طرح ملتا تھا جس طرح اسے ملنا چاہئے تھا۔ ...رہ کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں تھی لیکن اب تخصیص پیدا ہو گئی تھی خود بخود۔ اب ...ی کوشش ہوتی تھی کہ وہ اور ناصرہ تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کریں۔ اس کے علاوہ سلیم ...اپنے لباس اور جوتوں وغیرہ میں بھی ذرا زیادہ توجہ دینی شروع کر دی تھی۔ پہلے اکثر ...بھی ہوتا تھا کہ وہ صبح کو بغیر شیو کئے ہوئے ہی یونیورسٹی آ جاتا تھا لیکن اب وہ اس کا خاص طور سے خیال رکھتا تھا کہ بغیر شیو کئے ہوئے یونیورسٹی نہ جائے۔ وہ اپنی ...ن کے پیسوں میں سے کچھ پیسے بچا کر ایک آفٹر شیو لوشن بھی لے کر آیا تھا جس کی بھینی خوشبو سے اس کا چہرہ اس وقت خوب معطر ہوتا تھا جب وہ شیو کر چکا ہوتا تھا اور بعد میں بھی کافی دیر تک اس کے چہرے سے خوشبو اٹھتی رہتی۔ اس نے اپنی زندگی میں آج تک آفٹر شیو لوشن استعمال نہیں کیا تھا اور پہلی بار اس نے یہ خاصی مہنگی چیز خرید ڈالی تھی......... ناصرہ کی خاطر۔

”کیا بات ہے بھیا!“ ماجدہ نے اسے شیو کے بعد چہرے پر لوشن لگاتے ہوئے دیکھ کر تعجب سے پوچھا تھا۔ ”آج کل تم کچھ ضرورت سے زیادہ ہی بننے سنورنے لگے ہو۔ سب خیریت تو ہے نا؟“

سلیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ ”لوگ سمجھ رہے ہیں۔ لوگ جان رہے ہیں۔ مجھے محتاط رہنا ہو گا۔“ اس نے اپنے آپ کو خاموشی سے احتیاط کا مشورہ دیا۔

”کیوں بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو؟“ اس نے ہنس کر اپنی چھوٹی بہن سے کہا۔ ”شیو کرنے سے کھال جگہ جگہ سے کٹ جاتی ہے اور بعض اوقات تو اتنی تکلیف ہوتی ہے کہ دوسرے دن شیو کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لئے میں نے اب آفٹر شیو لوشن کا استعمال شروع کر دیا ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چہرے کے کٹے اور چھلے ہوئے حصے جلدی سے ٹھیک ہو جاتے ہیں.........“

ماجدہ جلدی میں تھی اور اس نے بس یوں ہی سرسری انداز میں ایک ریمارک پاس کر دیا تھا۔ اس نے سلیم کے جواب کو ٹھیک سے سنا بھی نہیں اور جلدی سے پرس ہلاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے کالج کو دیر ہو رہی تھی۔

اس دن سے سلیم ذرا کچھ محتاط ہو گیا تھا۔ وہ ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی موجودگی میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ وہ ناصرہ کی جانب زیادہ ملتفت

نظر نہ آئے۔ اسکینڈل بنتے دیر نہیں لگتی تھی اور وہ ایسے اسکینڈل کا شکار ہو کر سب
گنوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ ابھی تو اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ اس نے کچھ پایا بھی ہے
نہیں، جس کے گنوانے کا سوال پیدا ہو۔

اس کے دل و دماغ میں خود بخود طرح طرح کی عمارتوں کے نقشے بننے اور بگڑنے
شروع ہو گئے تھے۔ ان میں کسی بھی قسم کی غیر معمولی وارفتگی کے احساس کو دخل نہیں
اور نہ دل کی عمیق ترین گہرائیوں میں سے خود بخود ابھرنے والے نازک ترین جذبات
کارفرمائی شامل تھی اور یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ اس کو ناصرہ سے محبت نہیں تھی۔ اس
کے دل میں ناصرہ کے لئے وہ جذبات کبھی بھی پیدا نہیں ہوئے تھے جو انسان کی روح
سرشار کر دیتے ہیں اور اس کے رگ و پے میں ایک ایسا نشہ گھول دیتے ہیں جس کے زیر
اثر اسے ساری دنیا پھولوں کا ایک مہکتا ہوا حسین چمن معلوم ہونے لگتی ہے۔ ناصرہ کے
لئے اس کے دل و دماغ میں جو کچھ بھی تھا وہ محض ایک پُر آسائش اور خوش حال زندگی
کے حصول کی خواہش کا ایک شاخسانہ تھا اور سلیم کو خود بھی اس بات کا بخوبی علم تھا۔

"کاش جو کچھ محمود نے کہا ہے وہ سچ ہی ہو جائے۔" وہ اکثر اپنے آپ سے کہتا
"شاید میں نے اب تک ناصرہ کو ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ممکن ہے کہ
سچ مچ ہی مجھ سے محبت کرتی ہو.........." خود فریبی و خوش گمانی کا رنگ زیادہ سے زیادہ گہرا
ہوتا جا رہا تھا اور اس ابھرتے ہوئے رنگ نے بہت سی حقیقتوں کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔

چنانچہ اس روز بھی یونیورسٹی آنے اور اپنے ڈیپارٹمنٹ میں پہنچنے کے فوراً بعد اس
کی مضطرب نگاہوں نے ناصرہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور پھر وہ اسے نظر آ گئی۔ اس وقت
وہ کئی دوسرے لوگوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی اور بڑی خوش نظر آ رہی تھی۔ اس
گروپ میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی شامل تھے۔

وہ اگر چاہتا تو خود بھی وہاں جا کر اس گروہ میں شامل ہو سکتا تھا لیکن اس نے اس کے
بجائے مختلف راستہ اختیار کیا۔ وہ جان بوجھ کر وہاں سے دوسری طرف چلا گیا لیکن اس
دوران اس نے برابر ناصرہ کو اپنی نظروں میں رکھا اور اس کے تنہا ہونے کا انتظار کرتا رہا۔
کافی دیر کے بعد جب ناصرہ تنہا ہوئی تو وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر جیسے اچانک اس کے پاس آ
گیا۔

"السلام علیکم!" اس نے ناصرہ کو دیکھ کر خوشی سے چہچہاتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کیسے
حال ہیں؟"

"اوہ ہو.......... السلام علیکم!" ناصرہ نے جواباً ایک خوشگوار اور آسودہ مسکراہٹ
کے ساتھ کہا۔ "ٹھیک ہوں، ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ کیا ہو رہا ہے؟"

"تم پچھلے دو دن سے یونیورسٹی نہیں آئیں۔" سلیم نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟ میں
تمہاری کمی بڑی شدت کے ساتھ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کئی لوگوں سے تمہارے بارے
میں پوچھا لیکن کوئی نہیں بتا سکا۔ کسی کو کچھ معلوم ہی نہیں تھا.........."

"اوہ.......... بات یہ ہے سلیم کہ میں پچھلے دو دن سے بہت پریشان تھی۔" ناصرہ
نے کہا۔ "ممی ہوسٹن سے روزانہ فون کرتی ہیں اور ڈیڈی کے بارے میں تفصیل سے بات
کرتی ہیں۔ ہم سب لوگ روزانہ ہی ڈیڈی کی خیریت کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں لیکن
گزشتہ دو دن سے ممی نے فون ہی نہیں کیا تھا اور اسی لئے ہم لوگ پریشان تھے۔ مگر شکر
ہے کہ کل رات کو ان کا فون آ گیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"وہاں سے روزانہ فون کرنے پر تو خاصہ خرچہ ہوتا ہو گا۔" سلیم کی زبان سے بے
اختیار نکل گیا۔

"اتنا نہیں، جتنا یہاں سے وہاں فون کرنے پر خرچ ہوتا ہے۔" ناصرہ نے جواب دیا۔
"اور میں نے تو ممی سے یہی کہا تھا کہ میں خود روزانہ یہاں سے فون کر لیا کروں گی۔ اس
سے مجھے یہ آسانی ہوتی کہ ایک بار فون کر کے میں مطمئن ہو جاتی لیکن وہاں سے فون
آنے کی صورت میں مجھے مجسم انتظار بنا رہنا پڑتا ہے۔"

سینکڑوں، ہزاروں اور یہ صرف فون کا خرچہ .... اور ایک پاؤ بکری کا گوشت
.... ساڑھے بارہ روپے .... سلیم کے دماغ میں عجیب طرح کی اتھل پتھل ہو رہی
تھی۔

"پرسوں ڈیڈی کا آپریشن ہے سلیم!" ناصرہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ "بس
خدا کرے سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے۔"

"انشاء اللہ ٹھیک ہی رہے گا۔" سلیم نے فوراً کہا۔ "آخر اس قدر پیسہ تم لوگوں نے
خرچ کیا ہے۔ رائیگاں تو نہیں جانا چاہئے۔"

"سوال پیسے کا نہیں ہے سلیم!" ناصرہ نے بالکل سادگی کے ساتھ کہا۔ "پیسہ تو اس
سے بہت زیادہ بھی خرچ کیا جا سکتا ہے۔ اصل سوال ڈیڈی کی زندگی کا ہے۔ ان کے ہارٹ
کی حالت زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔ بس خدا کرے بائی پاس کا آپریشن ٹھیک ٹھاک ہو
جائے۔"

سلیم اس روز کافی دیر تک ناصرہ کے ساتھ رہا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ آج اس نے اس سے اس کے گھر والوں کے بارے میں' اس کے بیمار باپ کے بارے میں اور ان لوگوں کی ذاتی زندگی کے بارے میں کافی باتیں کر ڈالیں اور وہ یہ دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا کہ ناصرہ اس کی باتوں سے ذرا بھی بیزاری کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بات سے بہت زیادہ خوش ہے کہ سلیم اس سے اس کے گھر والوں کے بارے میں اور ان کے ذاتی معاملات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ کم از کم سلیم کو تو ایسا ہی محسوس ہوا۔

"محمود غلط نہیں کہتا تھا۔" اس نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا۔ "وہ واقعی مجھے چاہتی ہے' مجھ سے محبت کرتی ہے۔ کیوں؟ کیا وہ مجھ سے محبت نہیں کر سکتی؟ آخر کیا خرابی ہے مجھ میں؟ اتنی اچھی تو شکل و صورت ہے میری' پڑھائی میں بھی کتنا تیز ہوں اور اسپورٹس میں بھی کتنے میڈل جیت چکا ہوں اور غریب ہونا کوئی جرم تو نہیں۔"

اس کے بعد کے آنے والے دنوں میں اس نے ناصرہ سے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کی اور ناصرہ نے خود بھی اس کے ساتھ کافی وقت گزارا لیکن سلیم اپنی تمام تر خواہش اور کوشش کے باوجود ناصرہ کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ سن سکا جس سے صاف طور پر یہ ظاہر ہوتا ہو کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہاں ہے۔

لیکن اس کے مجموعی رویے میں سلیم کو یہ بات پنہاں محسوس ہوتی تھی اور اس کا اپنا خیال یہ تھا کہ شاید اب خود اسے ہی پیش قدمی کرنا چاہئے اور ناصرہ کو بتا دینا چاہئے کہ وہ اس سے "محبت" کرتا ہے لیکن یہ سب کچھ کہنے کے لئے جس ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی' وہ سلیم اپنے اندر ابھی تک پیدا نہیں کر سکا تھا۔

چند روز کے بعد سلیم کی محمود سے ملاقات ہو گئی۔ محمود پہلے کے مقابلے میں زیادہ کمزور اور دبلا پتلا نظر آ رہا تھا اور اس کے چہرے سے بہت زیادہ نقاہت کا اظہار ہو رہا تھا۔ سلیم کو اسے دیکھ کر بہت شدید دکھ ہوا وہ شخص کس بے دردی سے اپنے آپ کو تباہ کر رہا تھا۔ اس کا جوان اور صحت مند جسم اب سوکھ کر بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا۔ اس میں بالکل ہی جان باقی نہیں رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی وقت بھی اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

"اب بھی وقت ہے محمود!" سلیم نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی اور

اپنائیت کے انداز میں کہا۔ "خدا کے لئے اپنے اوپر ترس نہیں کھاتے تو اپنے گھر والوں پر ترس کھاؤ۔ تم نے ان کو کیوں اذیت میں مبتلا کر رکھا ہے؟"

"نہیں میری جان!" اس نے لڑکھڑاتے ہوئے انداز میں کہا۔ "میں نے کسی کو بھی اذیت میں مبتلا نہیں کیا ہے۔ حتیٰ کہ خود اپنے کو بھی اذیت میں مبتلا نہیں کیا ہے اور جہاں تک میرے گھر والوں کا تعلق ہے تو بھیا میرے' وہ تو پہلے ہی میرے اوپر فاتحہ پڑھ چکے ہیں۔" وہ کھوکھلی ہنسی ہنسا اور وہاں رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اس وقت بھی سگریٹ سلگ رہا تھا۔

اس واقعے کے چار دن بعد ہی محمود کی موت واقع ہو گئی۔

اور اس کی موت ایسے عجیب و غریب حالات میں ہوئی کہ سلیم کو اس سے اور بھی زیادہ دکھ ہوا۔

محمود اس وقت یونیورسٹی کیمپس میں ہی موجود تھا اور اس کی جیب بالکل خالی تھی۔ اسے چائے کی بڑی شدت کے ساتھ طلب ہو رہی تھی' اور تب اسے ایک پرانا دوست مل گیا جس نے اسے کینٹین چلنے کی دعوت دی جو محمود نے فوراً قبول کر لی اور وہ دونوں کینٹین میں آ بیٹھے۔ محمود کے دوست نے دونوں کے لئے چائے منگوائی اور ابھی محمود نے اپنی پیالی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا کہ وہ اچانک لڑکھڑا کر کرسی سے نیچے گرا اور فرش پر لمبا لمبا پھیل گیا۔ اس کے دوست باقر نے فوراً ہی نیچے بیٹھ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن محمود کا جسم جس انداز سے بے سدھ ہوا جا رہا تھا اس سے باقر پریشان اور تشویش میں مبتلا ہو گیا۔

اسی وقت کچھ اور لوگوں نے باقر کی مدد کی اور انہوں نے مل جل کر محمود کو اٹھا لیا۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے اسے ڈسپنسری پہنچا دیا جہاں یونیورسٹی کے ڈاکٹر نے اس کا تفصیلی معائنہ کر کے اسے مردہ قرار دے دیا اور اس کے ساتھ ہی پولیس کو اس کی اچانک موت کے بارے میں اطلاع دے دی گئی۔ پولیس آئی اور محمود کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے سول ہسپتال پہنچا دیا گیا۔

سلیم ان لوگوں میں سے ایک تھا جنہوں نے محمود کو اس وقت سہارا دینے کی کوشش کی تھی جب وہ ہر سہارے کی ضرورت سے بے نیاز ہو رہا تھا۔ سلیم اس وقت کینٹین میں موجود تھا اور جب اس نے محمود کو گرتے ہوئے دیکھا تو وہ جلدی سے اس کی طرف بھاگا تھا لیکن اس وقت اسے اس کا علم نہیں تھا کہ محمود مر چکا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاید بہت

زیادہ کمزوری کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گیا ہے لیکن جب ڈاکٹر نے معائنے کے بعد اسے مردہ قرار دے دیا تو سلیم پر جیسے بجلی گر پڑی۔

محمود کی موت یونیورسٹی کیمپس کے اندر واقع ہوئی تھی گو کہ اب وہ یونیورسٹی کے کسی بھی ڈیپارٹمنٹ کا طالب علم نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ ہفتے میں کئی بار یونیورسٹی کے چکر لگاتا تھا اور یہاں پرانے دوستوں وغیرہ سے ملاقات کرتا تھا۔ اسے جاننے والے یہ بھی جانتے تھے کہ وہ منشیات کا عادی تھا اور نشے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ سلیم کو یہ بات ذاتی طور پر معلوم تھی کہ یہ لعنت اسے یونیورسٹی سے ہی لگی تھی جہاں منشیات فروشوں کے بیسیوں کارندے اور متعدد خفیہ گروہ نہایت منظم طریقے سے اپنا کام کر رہے تھے اور یونیورسٹی کے طلبا اور طالبات کو نشے کا عادی بنا رہے تھے۔ جو شخص ایک بار ان کے چنگل میں پھنس جاتا تھا وہ پھر مر کر ہی اس عذاب سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔

یونیورسٹی میں محمود کی موت کا چرچا کئی دن تک رہا اور پھر آہستہ آہستہ لوگ اسے بھولتے گئے' یہاں تک کہ ایک ہفتے کے بعد ہی پوری یونیورسٹی میں کوئی اس کا نام لینے والا نہیں تھا۔ خود اس کے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں نے جہاں سے اس نے فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا تھا اسے بالکل فراموش کر دیا۔ اب کوئی اس کا ذکر کبھی نہیں کرتا تھا۔ محمود اب ایک بھولی بسری داستان بن چکا تھا۔

معاشی اور معاشرتی تشدد منشیات کی شکل اختیار کر کے سینکڑوں ہزاروں نوجوانوں کی طرح ایک اور نوجوان کو نگل چکا تھا جو زندہ رہنے کی صورت میں سماج کا ایک قابل قدر اثاثہ ثابت ہو سکتا تھا۔

محمود کی موت کو دو ماہ گزر چکے تھے اور سلیم اب تک ناصرہ سے اپنے دل کی بات نہیں کہہ سکا تھا۔ وہ ابھی تک اسی امید میں تھا کہ ابتدا ناصرہ کی طرف سے ہو گی لیکن اس محاذ پر تو ناصرہ بالکل خاموش تھی۔ اس نے سلیم سے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی اور سلیم خود بھی ابھی تک اس معاملے میں خاموش تھا لیکن اب اگلے چند روز میں وہ ناصرہ سے بات کر ہی لینا چاہتا تھا۔

اس سے اگلے روز جب ناصرہ یونیورسٹی آئی تو وہ بے حد خوش نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اور آنکھیں جیسے روشن ستاروں کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ جیسے ہی وہ اپنی شاندار چمچماتی ہوئی گاڑی سے اتری اتفاق سے ویسے ہی اس کی ملاقات سلیم سے ہو گئی جو اس وقت وہیں موجود تھا اور گزر کر کسی اور طرف جا رہا تھا۔

ناصرہ کی گاڑی دیکھ کر وہ رک گیا تھا۔ اف یہ کس قدر شاندار قیمتی کار تھی ناصرہ کی۔ سلیم کو خود تو گاڑیوں کی اچھائی برائی یا ان کی قیمتوں کے بارے میں ٹھیک سے کچھ بھی نہیں معلوم تھا کیونکہ اس نے یا اس کے خاندان میں کسی نے کبھی گاڑی نہیں لی تھی اور گاڑیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ مگر محمود مرحوم نے اسے ناصرہ کی گاڑی کے بارے میں بتایا تھا اور یہ بات تو اسے خود ناصرہ نے بتائی تھی اس کے گھر میں پانچ گاڑیاں ہیں اور سب کی سب جدید ترین ماڈلوں کی ہیں۔ ان پانچ گاڑیوں میں سے ایک گاڑی ہمیشہ ناصرہ کے پاس رہتی تھی اور صرف وہی اس کو چلاتی تھی۔ اسی گاڑی پر وہ یونیورسٹی آتی جاتی تھی۔ خود چلاتی تھی لیکن کبھی کبھی کسی ڈرائیور کو بھی ساتھ لے آتی تھی۔ ایسا وہ اس وقت کرتی تھی جب بقول اس کے اس کا گاڑی چلانے کا موڈ نہیں ہوتا تھا۔

ناصرہ اپنی گاڑی میں سے اتری اور اس نے اس کا دروازہ لاک کرتے ہوئے سلیم کی طرف دیکھا۔ سلیم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور وہ رک گیا تھا۔

"ہیلو ناصرہ۔" سلیم نے اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا حال ہیں' کافی خوش نظر آ رہی ہو؟"

"ہاں سلیم!" ناصرہ نے جواب دیا۔ "میں واقعی بہت خوش ہوں۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ خوش تو میں واقعی بہت زیادہ ہوں۔ ڈیڈی کل رات واپس آ گئے ہیں۔"

"اچھا!" سلیم نے تعجب سے پوچھا۔ "لیکن تم نے پہلے نہیں بتایا کہ وہ واپس آنے والے ہیں؟"

"مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔" ناصرہ نے جواب دیا۔ "کل اور پرسوں بھی وہاں سے کوئی فون نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ آج میں خود فون کر کے ممی سے احوال معلوم کروں گی لیکن کل رات کو وہ لوگ خود ہی آ گئے۔ بغیر کسی پیشگی اطلاع کے۔ ممی اور ڈیڈی کا کہنا ہے کہ وہ ہم سب لوگوں کو سرپرائز دینا چاہتے تھے۔"

"اوہ.......... تو یہ بات ہے۔" سلیم نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "انکل.......... میرا مطلب ہے تمہارے ڈیڈی.......... یقیناً ٹھیک ہو گئے ہوں گے؟"

"ہاں سلیم!" ناصرہ کی آواز میں خوشی کی جھلک تھی۔ "وہ بالکل ٹھیک ہو گئے ہیں۔ ان کا آپریشن قطعی طور سے کامیاب رہا اور اب انہیں دل کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ البتہ یہ ہے کہ سال چھ مہینے بعد ہوسٹن کا چکر لگا کر اپنا چیک اپ کرواتے رہنا ہو گا۔ ویسے تو وہاں سے رپورٹیں بھی بھیج سکتے ہیں لیکن زیادہ بہتر یہی ہے کہ خود چلے جائیں اور اس میں

مشکل بھی کون سی ہے؟ اب اگلے سال جب وہ چیک اَپ کے لئے جائیں گے تو ان کے ساتھ میں جاؤں گی' یہ بات طے ہو چکی ہے۔"

"ہوسٹن .... امریکہ .... ہزارہا ڈالر .... لاکھوں روپے .... اور ایک پاؤ بکری کا گوشت' زندگی ہمیشہ کچھ لوگوں کے لئے اس قدر بے رحم کیوں ہوتی ہے؟"

"بہت خوب۔" سلیم نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تو تم نے پہلے سے ہی طے کر لیا کہ اگلے سال تم..........."

"بالکل طے کر لیا۔" ناصرہ نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "اور ڈیڈی اس بات سے پوری طرح خوش اور مطمئن ہیں۔ میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔ اس وقت ہمارے فائنل کے امتحان بھی ختم ہو چکے ہوں گے اور میں بالکل فری ہوں گی۔"

"میں بھی بالکل فری ہوں گا۔" الفاظ سلیم کی زبان تک آتے آتے رہ گئے۔ "کیا میں بھی تمہارے ساتھ..........."

"اور ہاں۔" قدرے توقف کے بعد ناصرہ نے جیسے چونک کر کہا۔ "ایک اور بات سن لو سلیم! اگلی جمعرات کو ہمارے گھر ایک پارٹی ہے۔ یہ پارٹی ہم لوگ ڈیڈی کے اچھے ہونے کی خوشی میں دے رہے ہیں اور میں نے اس میں کچھ خاص خاص ساتھیوں کو انوائٹ کیا ہے جن میں تم بھی شامل ہو۔ دیکھو تمہیں آنا ہے' ضرور آنا!"

سلیم اس بات کو سن کر جیسے ہواؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اس کا دماغ کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے سینکڑوں مناظر اس کی نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ جن میں ایک بے حد مالدار' امیر کبیر اور تعلیم یافتہ لڑکی اپنے والدین سے ایک غریب لیکن لائق اور ذہین نوجوان کا تعارف کراتے ہوئے اعلان کرتی ہے کہ اس نے اس نوجوان کو اپنے جیون ساتھی کے طور پر منتخب کر لیا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں اور ایک ساتھ جیون بتانے کے بارے میں فیصلہ کر چکے ہیں۔

شاید اس قسم کی ڈرامائی صورت حال پیدا ہونے کا تو امکان نہیں تھا۔ تاہم اس بات کا امکان تو لازمی تھا کہ ناصرہ اپنے والد سے سلیم کا تعارف کراتی اور وہ دونوں کم از کم ایک دوسرے سے واقف تو ہو جاتے۔

"تھینک یو ناصرہ! تھینک یو ویری مچ۔" سلیم نے بے حد متاثر ہوتے ہوئے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے کہا۔ "اور کس کس کو بلا رہی ہو؟ یقیناً تم نے ڈیپارٹمنٹ سے بہت سے لوگوں کو بلایا ہو گا۔" سلیم یہ جاننے کے لئے بے چین تھا کہ

ے کیا حیثیت دی گئی ہے۔

"نہیں۔" ناصرہ نے جواب دیا۔ "اتنے زیادہ لوگوں کو نہیں بلایا ہے۔ ڈیپارٹمنٹ تو ت بڑا ہے اور میری واقفیت بھی اتنے زیادہ لڑکوں اور لڑکیوں سے ہے۔ سب کو نہیں بلا لی تھی۔ صرف چند مختصر سے لوگوں کو بلایا ہے۔ مرد تو کم ہی ہیں' لڑکیاں زیادہ ہیں۔"

اور ان کم لڑکوں میں سلیم بھی شامل تھا۔ اس اعلیٰ ترین اعزاز میں وہ خود بھی شریک ا۔ بھلا اس سے زیادہ اچھی بات اور کیا ہو سکتی تھی۔ وہ تو سر کے بل چلتا ہوا اس دعوت ں جائے گا۔

"رات کا کھانا ہے اور ہلکی پھلکی موسیقی کی ایک محفل۔" ناصرہ نے اس سے کہا۔ بات یہ ہے کہ یہ صرف نوجوانوں کی پارٹی نہیں ہے ورنہ اس میں اس طرح کی محفل سیقی نہ ہوتی بلکہ میوزک کا پروگرام دوسرے اسٹائل کا ہوتا لیکن اس پارٹی میں سبھی روں کے لوگ شامل ہیں' اس لئے ایک ایسی محفل کا بندوبست کیا گیا ہے جس سے سب لوگ لطف اندوز ہو سکیں۔ تو تم آؤ گے نا سلیم!" ناصرہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

"بھلا تم بلاؤ اور میں نہ آؤں۔" سلیم نے بڑی ادا سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کرا کر کہا اور ناصرہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور سلیم کو اچانک ایسا لگا جیسے سونے کی بہت سی گھنٹیاں ایک ساتھ بج اٹھی ہوں۔ ناصرہ کی یہ شوخ و شنگ ہنسی جو صرف اس کے لئے ں سونے کی گھنٹیوں کی آواز رکھتی تھی اور سلیم کو اسی سونے کی تو تلاش تھی۔

"تھینک یو سلیم!" ناصرہ نے کہا اور جلدی سے وہاں سے چل دی۔ سلیم اپنی شیوں کے ذخیرے کو سمیٹنے میں اس قدر مصروف تھا کہ وہ ناصرہ کا ساتھ نہ دے سکا اور ں کھڑا رہا۔ ناصرہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی وہاں سے چل دی۔

سلیم کے سارے وجود میں ایک نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک میٹھا میٹھا سا نشہ ۔ امید کا' خوش حالی کا' متوقع فارغ البالی کا اور ایک بہتر اور روشن مستقبل کا۔ نشہ جو ہرے دھیرے لیکن بڑے استحکام کے ساتھ اس کے رگ و پے میں اتر رہا تھا اور سلیم ، عجیب و غریب اور آسودگی سے بھرپور کیفیت کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔ اسے سمیٹ یٹ کر بچائے رکھنا چاہتا تھا۔

چند گنے چنے جوڑوں میں سے ایک معقول اور بہتر لباس کا انتخاب کوئی بڑا مسئلہ نہیں ۔ مسئلہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں ملبوسات سے الماریاں بھری ہوں اور یہ سمجھ میں نہ آ رہا کہ کون سا لباس پہنا جائے اور کس لباس کو کس پر ترجیح دی جائے۔ سلیم نے اپنے گنے

چنے جوڑوں میں سے ایک ایسے جوڑے کا انتخاب کیا جو کسی حد تک اس قابل تھا کہ اسے ایک بہت بڑی اونچی اور شاندار دعوت میں پہن کر جایا جا سکتا تھا۔ دراصل مردوں کے سلسلے میں لباس کے مسئلے کو شلوار قمیض کے رواج نے بڑی حد تک حل کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسا لباس تھا جس کو پاکستانی معاشرے میں ایک خاص حیثیت اور خاص وقار حاصل ہو گیا تھا اور اسے پہن کر بڑی سے بڑی جگہوں پر جایا جا سکتا تھا اور اس لباس کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ یہ مہنگے سے مہنگا بھی ہو سکتا تھا اور سستے سے سستا بھی۔ اس لئے یہ ہر جگہ چل جاتا تھا۔

سلیم اس سے پہلے کبھی ناصرہ کے گھر نہیں گیا تھا لیکن اسے یہ بات کافی پہلے سے معلوم تھی کہ ناصرہ ڈیفنس سوسائٹی میں کسی جگہ رہتی ہے۔ اس شام پہلی بار وہ ناصرہ کے گھر گیا اور اس نے اس شاندار محل کو دیکھا جس میں ناصرہ اور اس کے اہل خاندان رہتے تھے۔ یہ ایک بہت ہی وسیع و عریض اور پُرشکوہ دو منزلہ کوٹھی تھی اور فن تعمیر کا ایک خوبصورت اور منفرد نمونہ تھی۔ ڈیفنس سوسائٹی کی تمام کوٹھیوں کی طرح اس کا بھی ایک الگ اسٹائل تھا۔

سلیم اس سے پہلے ایک دوست کے ساتھ صرف دو یا تین بار ڈیفنس سوسائٹی آیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کا کبھی یہاں آنا نہیں ہوا تھا کیونکہ یہاں کوئی ایسا شخص نہیں رہتا تھا جس سے ملنے کے لئے وہ یہاں آتا۔ جن لوگوں سے اس کا ربط و ضبط رہتا تھا ان کی دنیا علیحدہ تھی۔ وہ ڈیفنس سوسائٹی اور کلفٹن میں رہنے والے لوگ نہیں تھے۔

سلیم جب اس دل ہلا دینے والی پُرشوکت کوٹھی کے کھلے ہوئے گیٹ سے پیدل اندر داخل ہوا جہاں دو باوردی دربان گیٹ کے دونوں طرف کھڑے ہوئے تھے اور گاڑیاں گیٹ سے گزر کر اندر جا رہی تھیں تو اس نے اپنے آپ کو جیسے رنگ و نور کے ایک طلسم کدے میں پایا۔ چاروں طرف سے خوشبوؤں کے طوفان اٹھ رہے تھے۔

گیٹ کے ساتھ ہی دائیں جانب ایک معمر آدمی اور عورت بہترین اور نہایت قیمتی لباسوں میں ملبوس کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ ہی ناصرہ بھی موجود تھی۔ اس نے آج جو لباس پہن رکھا تھا وہ اس قدر خوبصورت اور قیمتی تھا کہ اس میں سے جیسے روشنی کی شعاعیں نکلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں اور وہ اس قدر سجی ہوئی تھی کہ بالکل کسی رنگین تصویر کی طرح سحر انگیز اور دلکش نظر آ رہی تھی۔

"مسٹر سلیم!" اس نے سلیم کا اپنے باپ سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "میرے

ساتھ پڑھتے ہیں .... اور یہ میرے والد۔" اس نے سلیم سے کہا۔

ناصرہ کے باپ نے سلیم کو سرسری نظروں سے بھی نہیں دیکھا۔ معمولی سے شلوار سوٹ اور واسکٹ میں ملبوس اس نوجوان میں جو پیدل چلتا ہوا وہاں تک آیا تھا اور جس کی پشاوری چپلوں پر کافی دھول جم گئی تھی، سیٹھ باسط علی جیسے بڑے آدمی کے لئے بھلا کیا کشش ہو سکتی تھی۔

"ادھر چلے جاؤ سلیم!" ناصرہ نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "رفیق، سلمیٰ، شہزاد اور دوسرے لوگ اس طرف ہیں۔" اور اس کے ساتھ ہی وہ فوراً ایک مہمان جوڑے کی طرف متوجہ ہو گئی۔ مرد بہترین تراش کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کے سیاہ جوتے اس قدر چمکدار تھے کہ ان میں اپنی شکل دیکھ لی جائے اور عورت نفیس کام والی بہت بھاری بنارسی ساڑھی میں تھی اور دونوں کے بالوں اور جسموں سے خوشبو کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔

"ہیلو سعدیہ!" ناصرہ نے گرمجوشی کے ساتھ نوجوان عورت کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔

"ہیلو ذاکر بھائی .... ویلکم!" اور وہ سلیم سے بالکل غافل ہو کر ان دونوں سے باتیں کرنے لگی جو ابھی ابھی مرسیڈیز سے اترے تھے اور ان کا ڈرائیور گاڑی کو ریورس کر کے پیچھے کی طرف لے جا رہا تھا۔ کوٹھی کے اندر اب پارکنگ کی گنجائش ختم ہو چکی تھی۔

خیر مقدم کا یہ انداز سلیم کی توقع کے بالکل برخلاف تھا اور اس پر شدید مایوسی کا غلبہ ہوا۔ نہ تو ناصرہ نے اس کے بارے میں کوئی خاص بات اپنے باپ سے کہی اور نہ اس کے باپ سیٹھ باسط علی نے سلیم کو کسی توجہ کے قابل سمجھا اور ناصرہ کی ماں نے تو سلیم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں تھا، کیونکہ وہ اس وقت سعدیہ اور ذاکر کو ان کی مرسیڈیز سے اترتے ہوئے دیکھنے میں محو تھی۔

سلیم گیٹ کے پاس سے گزر کر اندر چلا گیا اور وسیع و عریض لان میں موجود مہمانوں کو دیکھنے لگا۔ زیادہ تر مرد بیش قیمت سوٹوں اور ٹائیوں میں ملبوس تھے۔ کچھ سفاری سوٹوں میں بھی تھے لیکن ان کی تعداد کم تھی۔ البتہ شلوار قمیض میں سلیم کو اپنے علاوہ بمشکل ہی دو ایک افراد نظر آئے اور اس روز سلیم پر یہ انکشاف ہوا کہ اس قسم کی بہت اونچی پارٹیوں میں اب بھی سوٹ کو ہی خاص حیثیت حاصل ہے، شلوار قمیض کو نہیں۔

وہ اس طرف چلا گیا جہاں اس کے یونیورسٹی کے کچھ اور ساتھی بھی موجود تھے۔ پانچ چھ لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ سلیم بھی ان ہی لوگوں میں شامل ہو گیا اور وہ آپس میں باتیں

کرنے لگے۔

کچھ دیر بعد جب غالباً سارے مہمان آ چکے تھے ناصرہ کے والد اور والدہ گیٹ کے پاس سے ہٹ گئے اور وہ مہمانوں میں گھل مل کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ ناصرہ خود بھی گیٹ سے ہٹ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک نوجوان کو اپنے ساتھ لئے ہوئے اس جگہ پہنچی جہاں اس کے یونیورسٹی کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔

"بھئی پہلے تو تم سب لوگ ان سے ملو۔" ناصرہ نے کھنکتی ہوئی خوشی سے سرشار اور نرم و شیریں آواز میں کہا۔ "یہ ہیں مسٹر ساجد علی' میرے کزن' ہوسٹن میں رہتے ہیں۔ وہیں ان کا ذاتی کاروبار ہے۔ امریکی شہری ہیں اور ڈیڈی کے جشن صحت میں شریک ہونے کے لئے خاص طور سے ہوسٹن سے کراچی آئے ہیں۔ صرف دو دن کے لئے۔" وہ بولتے بولتے رک گئی اور اس نے مسکرا کر اپنے کزن ساجد کی طرف دیکھا۔

سلیم بڑے غور سے ساجد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ساجد ایک معمولی شکل و صورت' درمیانہ قد کا اور بالکل معمولی نظر آنے والا نوجوان تھا مگر اس کے چہرے پر امارت کی چمک اور آنکھوں میں دولت کا نشہ تھا اور ان خصوصیات کے آگے دنیا کی ہر دوسری خصوصیت ہیچ تھی۔ سلیم کا دل جیسے بیٹھا جا رہا تھا۔

"اوہ۔" سلمٰی نے بڑے غور سے ساجد علی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔ صرف ایک تقریب میں شرکت کرنے کے لئے آپ خاص طور سے ہوسٹن سے کراچی آئے اور اتنا لمبا سفر آپ نے طے کیا۔"

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔" ساجد علی نے خوش دلی کے ساتھ مسکراتے ہوئے کہا۔ "اصل میں تقریب تقریب کی بات ہوتی ہے۔ یہ ایسی تقریب تھی جس میں شریک ہونا میرے لئے بہت ضروری تھا ورنہ ہماری ہونے والی بیگم صاحبہ ناراض ہو جاتیں کہ ہم اس یادگار موقع پر ان کی خوشیوں میں شریک نہیں ہوئے۔" اور اس نے مسکرا کر ترچھی نگاہوں سے ایک خاص انداز سے ناصرہ کی طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں ناصرہ کے لئے کھلی محبت اور پسندیدگی کا اظہار تھا۔ وہ کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

ناصرہ نے بھی جواباً ایک لمحے کے لئے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ زمین کو دیکھنے لگی۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔" سلمٰی نے جلدی سے ناصرہ کا بازو پکڑ لیا۔ "تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔ بہرحال مبارک ہو۔"

"شکریہ!" ناصرہ نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "اصل میں کوئی ایسا موقع ہی نہیں آیا۔ میرا مطلب ہے .... کبھی کوئی ایسی بات نہیں نکلی۔"

دوسرے ساتھیوں نے بھی جو وہاں موجود تھے' ناصرہ کو مبارکباد دی۔ جن میں سلیم بھی شامل تھا۔ وہ اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بڑا احمق سمجھ رہا تھا اور وہ خود اپنی نظروں میں حقیر ہوا جا رہا تھا۔

ناصرہ نے اپنے سارے دوستوں کا نام بنام ساجد علی سے تعارف کروایا۔ سلیم کا تعارف کرواتے ہوئے اس نے کہا۔ "ہمارے ڈیپارٹمنٹ کے لائق ترین طلبا میں سے ایک بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ لائق ترین طالب علم جو ہمیشہ بہت اچھے اکیڈیمک کیریئر کے حامل رہے ہیں۔"

"گلیڈ ٹو میٹ یو۔" ساجد علی نے خالص امریکی لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے اپنے ننھی اور سانولے ہاتھ میں سلیم کا چوڑا چکلا اور خوبصورت ہاتھ لے کر زور سے دبایا۔ سلیم نے اس کے ہاتھ کو نرمی سے دبایا اور چھوڑ دیا۔

ناصرہ چند منٹ تک وہاں رکی رہی اور ساتھیوں سے باتیں کرتی رہی۔ پھر وہ ساجد علی کو ساتھ لے کر اور ان لوگوں سے ایکسکیوز کر کے وہاں سے چلی گئی۔ کچھ اور مہمانوں سے بھی ساجد علی کو ملانا تھا۔

سلیم کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مسلسل چھوٹا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا قد بڑی تیزی سے گھٹ رہا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو نارمل رکھتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔

تھوڑی دیر بعد مہمانوں کو کھانے کی میز کی طرف آنے کی دعوت دی گئی۔ ساری فضا لذیذ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سے مہک رہی تھی۔ سلیم بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک میز کے گرد جا بیٹھا۔

کیا کیا نعمتیں نہیں تھیں جو میزوں پر موجود تھیں۔ یہاں سے وہاں تک لگی ہوئی ڈشیں طرح طرح کے نفیس کھانوں سے اوپر تک بھری ہوئی تھیں۔ بھنی ہوئی مرغی' مرغی کا قورمہ' بریانی' تلی ہوئی مچھلی' کباب' مرغی کے تکے' بھنی ہوئی بوٹیاں' بھنے ہوئے گردے۔ آدمی کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا کھائے اور کیا چھوڑے۔ اتنی ساری چیزوں میں سے تو اگر ایک ایک دو دو نوالے بھی لئے جاتے تو پیٹ بھر جاتا۔ ہر ہر میز پر بے تحاشہ کھانا موجود تھا۔ سیروں گوشت سے بھری ہوئی ڈشیں کھانے والوں کے

انتظار میں تھیں۔

مرغی اور بکری کے سیروں گوشت سے بھری ہوئی ایک ایک ڈش' ہر ہر میز پر کئی کئی ڈشیں' گوشت ہی گوشت' سیروں کے حساب سے گوشت۔

"پاؤ بھر بکری کا گوشت .... پاؤ بھر بکری کا گوشت .... اسٹو ...." سلیم کے دماغ میں جیسے بم کے دھماکے ہو رہے تھے۔

وہ رہ رہ کر دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت بھیج رہا تھا۔ آخر اسے کیا ہو گیا تھا' کیا وہ بالکل پاگل ہو گیا تھا' کیا اس کے دماغ نے سوچنا اور سمجھنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا' آخر اسے ہوا کیا تھا؟ اس قدر واہیات' اس قدر بے بنیاد اور احمقانہ خیال اس کے دل میں آیا ہی کیونکر کہ ناصرہ اسے پسند کرتی ہے؟ اسے .... ایک پھٹیچر سے ہیڈ کلرک کے بیٹے کو .... جس کے گھر میں مہینوں میں کبھی ایک بار پاؤ بھر بکری کا گوشت پکتا ہے۔

اپنا وہ معمولی درجہ کا شلوار سوٹ اور اس کے ساتھ کی ایک معمولی درجے کی واسکٹ جس میں اس نے آج دوپہر کو خوب گھس گھس کر اور رگڑ رگڑ کر استری کی تھی اپنی وہ پشاوری چپل جس پر اس نے بڑی محنت کے ساتھ پالش کر کے اسے چمکایا تھا اور جس پر اب پیدل چلنے کے باعث گرد کی تہیں جم گئی تھیں۔ اسے یہ ساری چیزیں کس قدر حقیر' مضحکہ خیز اور مہمل معلوم ہو رہی تھیں۔ آخر اسے یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی۔ ناصرہ کا باپ سالا جئے یا مرے اسے کیا مطلب؟ مگر وہ تو اس گھر کا داماد بننے کے شوق میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اپنے ہونے والے "سسر" کو صحت یابی کی مبارکباد دینے آیا تھا۔ لعنت ہے' ہزار بار لعنت ہے مجھ پر۔

سیروں گوشت سے بھری ہوئی ڈشیں میزوں پر موجود تھیں اور ان میں سے جو بھی ڈش خالی ہو جاتی تھی' ویٹر اس میں مزید گوشت لا کر بھر دیتے تھے۔ کوئی ایک ڈش بھی خالی نہیں تھی۔

یہ کوئی شادی کی تقریب نہیں تھی۔ صرف ایک بوڑھے اور عمر رسیدہ آدمی کے صحت یاب ہو جانے کی خوشی میں دی جانے والی دعوت تھی اور سلم کے لئے یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ اس تقریب پر کتنا روپیہ خرچ ہوا ہو گا۔ صرف کھانے ہی کھانے پر پچاس ساٹھ ہزار روپے سے کم خرچ نہیں ہوئے ہوں گے۔ پچاس ساٹھ ہزار روپے' سیروں گوشت سے بھری ہوئی ڈشیں اور ایک پاؤ بکری کا گوشت۔ ایک پاؤ بکری کے گوشت کا سٹو۔ اور عشق .... اور دامادی .... اور ہندوستانی اور پاکستانی فلموں کے درجنوں

جیسے سین۔ "اف کس قدر ذلت آمیز ہے یہ سب کچھ۔ کس قدر ناقابل برداشت جلد .... جلد یہاں سے' چپکے سے کھسک لو۔"

سلیم نے اپنی پلیٹ ایک میز پر رکھ دی اور مہمانوں کے ہجوم سے راستہ بناتا ہوا وشی سے عظیم الشان کوٹھی کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ جب وہ اس دروازے میں ل ہوا تھا تو ایک سالم وجود تھا اور اب جبکہ وہ یہاں سے واپس جا رہا تھا تو ایک شکست ردہ افتادہ اور ریزہ ریزہ وجود تھا اور ان ریزوں سے اسے اپنی دوبارہ تشکیل کرنی تھی۔ ے اعتماد تھا کہ وہ دوبارہ اپنی تشکیل کر لے گا۔ وہ محبت میں ناکامی کے کسی جان لیوا ے سے دوچار نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اس نے کسی سے محبت کی ہی نہیں تھی۔ یہ تو ن ایک کاروباری کوشش تھی جو نہایت بھونڈے طریقے سے' بہت بری طرح ناکام ہو ر رہ گئی تھی اور حماقت آمیز پچھتاووں کے علاوہ اور کچھ نہیں بچا تھا۔

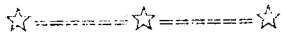
اس نے دل ہی دل میں مرحوم محمود کو برا بھلا کہا۔ یہ محمود ہی تو تھا جس نے اس کے دماغ میں یہ احمقانہ خیال بٹھا دیا تھا اور وہ خود بھی اس خوش گمانی اور خوش فہمی کا شکار گیا تھا۔

اس روز وہ بہت رات گئے تک سڑکوں پر آوارہ گردی کرتا رہا۔ گھر جانے کو اس کا بالکل نہیں چاہ رہا تھا۔ کیا رکھا تھا اس گھر میں سوائے غربت اور تنگ دستی کے مہیب یوں کے۔

لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ قسمت نے اسے وہی گھر دیا تھا اور اسے بالآخر لوٹ کر ا جانا تھا۔ چنانچہ آدھی رات کے کچھ بعد وہ گھر پہنچا۔ اس کی ماں نے دروازہ کھولا جو کے انتظار میں اب تک جاگ رہی تھی اور اس سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔

"آپ کو تو معلوم ہے امی!" اس نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "میں تو دعوت میں گیا ہوا تھا .... ڈیفنس سوسائٹی۔"

"ہاں یاد آ گیا۔" صفیہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تب تو تم خوب تر مال اڑا کر آئے ہو ے۔"



اگلے روز وہ یونیورسٹی گیا تو ناصرہ سے بالکل اسی طرح اسی جوش و خروش اور جذبے ساتھ ملا جس طرح کل تک ملا کرتا تھا۔ وہ اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ ی محبت وغیرہ کے چکر میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے آپ کو مزید ذلیل کرنے کی کوئی خواہش

نہیں تھی۔

"تمہارا منگیتر بہت اچھا لگا مجھے۔" اس نے ناصرہ سے کہا۔ "شادی کب ہو رہی ہے تمہاری؟"

"میرے ایم اے کرنے کے بعد۔" اس نے فوراً جواب دیا۔ "دراصل ساجد کے خاندان کا ہوسٹن میں اور امریکہ کے کئی دوسرے شہروں میں کافی بڑا بزنس ہے۔ وہ سب کے سب امریکی شہری ہیں اور شادی کے بعد مجھے بھی امریکہ ہی میں جا کر رہنا ہو گا۔ میں تو چاہتی تھی کہ پاکستان میں ہی رہوں مگر سب کچھ آدمی کے چاہنے سے تو نہیں ہوتا۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتی ہو۔" سلیم نے کہا۔ "سب کچھ انسان کے چاہنے سے تو نہیں ہوتا۔ بلکہ زیادہ تر باتیں تو ایسی ہوتی ہیں جنہیں آدمی کو اپنی مرضی کے بغیر یا خلاف قبول کرنا پڑتا ہے۔"

اس روز کے بعد سے سلیم کے لئے ناصرہ میں کوئی کشش نہیں رہی اور ناصرہ بھی اس کے لئے ڈیپارٹمنٹ کی دوسری لڑکیوں کی طرح تھی جن میں سے کسی سے بھی سلیم کو کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ زندگی ابھی بہت نامہربان تھی اور سکون کا سانس لینے کے لئے جدوجہد کا ایک طویل راستہ ابھی طے کرنا تھا۔

وقت جیسے پَر لگا کر اڑتا گیا۔ سلیم نے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا اس کے بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ ناصرہ بھی پاس ہو گئی تھی لیکن سلیم نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس کی کون سی ڈویژن آئی تھی۔ ناصرہ کا وجود اب اس کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔

اسی سال شاہدہ نے بھی بی ایس سی کا امتحان پاس کر لیا تھا اور یونیورسٹی میں ایم ایس سی میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ وہ ایم ایس سی کرنا چاہتی تھی لیکن اس کے والدین اس فکر میں تھے کہ جیسے ہی کوئی اچھا سا رشتہ ملے، اس کی شادی کر دیں۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق تھا تو اگر اس کے ہونے والے شوہر کی مرضی ہوئی تو وہ شادی کے بعد بھی تعلیم جاری رکھ سکتی تھی۔ جہاں تک خود شاہدہ کا تعلق تھا تو اس نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ وہ ایم ایس سی کر لینا چاہتی تھی کیوں کہ اس کے بعد کم از کم یہ امر تو یقینی تھا کہ وہ بھوکی نہیں مرے گی اور کسی کی دست نگر نہیں رہے گی۔ ایم ایس سی کے بعد کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی نوکری تو کہیں نہ کہیں مل ہی سکتی تھی۔ گزارہ کرنے کا سہارا تو ہو ہی سکتا تھا۔ آگے کا حال خدا جانے۔

سلیم نے فرسٹ کلاس ایم اے کیا تھا اکنامکس میں اور ابھی اس کا رزلٹ آیا بھی نہیں تھا۔ تب سے اس نے اخبارات میں اشتہارات دیکھ دیکھ کر نوکری کے لئے درخواستیں بھیجنی شروع کر دی تھیں اور یہ سلسلہ آج تک جاری تھا۔ اس نے بلا مبالغہ سینکڑوں درخواستیں بھیجی ہوں گی، پچاسیوں انٹرویوز دیئے ہوں گے لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی وہیں کھڑا ہوا تھا جہاں وہ آج سے ایک سال پہلے کھڑا تھا۔ اخبارات ملازمتوں کے اشتہارات سے بھرے پڑے تھے اور سلیم عرضیاں بھیجتے بھیجتے تھک گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی نوکری اس کے لئے نہیں تھی۔ کوئی بھی اچھی نوکری تو اس کے لئے نہیں تھی۔ البتہ بعض معمولی اور بہت کم تنخواہ کی نوکریاں اسے آفر ہوئیں لیکن اس نے انہیں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس قسم کی نوکریاں کر کے تو صرف اپنے آپ کو ذلیل و خوار ہی کیا جا سکتا تھا اور سلیم اس کے لئے تیار نہیں تھا۔

اس ایک سال کے دوران سلیم کے والدین اس بات کی سر توڑ کوشش کرتے رہے کہ ان کی بڑی بیٹی شاہدہ کے لئے کوئی ڈھنگ کا رشتہ مل جائے تو وہ اس کی شادی کر دیں لیکن ان کے سارے جتن کے باوجود کوئی معقول رشتہ نہ مل سکا۔ لڑکی کو دیکھنے کے لئے بہت سے لوگ آئے لیکن بعد میں پلٹ کر کوئی بھی نہ آیا۔

کوئی آ کر کرتا بھی کیا؟ لڑکے والوں کے نقطۂ نظر سے یہاں کیا رکھا تھا؟ ایک معمولی شکل و صورت کی لڑکی، سارے خاندان کی واحد اور مشترکہ ملکیت ایک سو بیس گز کا ایک پرانے سے سٹائل کا مکان جسے ایک طویل عرصے سے رنگ و روغن اور مرمت کی ضرورت تھی، گھر کا واحد کمانے والا ایک ہیڈ کلرک باپ جس کی کمر کلرکی کرتے کرتے جھک رہی تھی اور جس کی ساری زندگی کی محرومیاں اس کے چہرے کی شکستہ لکیروں میں تحریر تھیں، ایک ایم اے پاس بے روزگار بھائی جو سال بھر سے کراچی کی سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا اور جسے کہیں نوکری نہیں ملتی تھی۔ ایک سیدھی سادی گھریلو ماں جس کے پاس بیٹی کو دینے کے لئے جھولی بھر بھر کر دعاؤں کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور بیاہنے کے لئے ایک اور نوجوان بیٹی جس کی شادی کے لئے بھی کچھ نہ کچھ بچا کر رکھنے کی ضرورت تھی اور یہاں پہلے ہی کیا رکھا تھا جس میں سے کچھ بچایا جا سکتا۔

سلیم اور شاہدہ گھر کے اخراجات میں تھوڑا بہت حصہ لینے کی غرض سے ٹیوشنوں کے سلسلے کو جاری رکھے ہوئے تھے لیکن وہ بار بار ٹوٹ جاتا تھا اور اس پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آئے دن ہنگامے ہوتے رہتے تھے امتحانات ملتوی ہوتے رہتے تھے اس کے

نتیجے میں ٹیوشنیں چھوٹ جاتی تھیں۔

فرسٹ کلاس ایم اے کی ڈگری بغل میں دبائے ایک سال تک زندگی کی شاہراہ پر دھکے کھاتے ہوئے سلیم اپنے وجود کو منتشر اور ریزہ ریزہ ہونے سے بچانے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔

اب وہ محمود کے بارے میں قدرے مختلف انداز میں سوچتا تھا۔ محمود بھی اسی کی طرح ڈیپریشن اور فرسٹریشن کا شکار ہوا تھا اور اس نے ہر طرف سے مکمل طور پر مایوس اور ناامید ہو جانے کے بعد منشیات کے دامن میں سکون کی تلاش کی کوشش کی تھی اور بالآخر یہاں اس نے ابدی سکون حاصل کر لیا تھا۔

سلیم، اب محمود کے روحانی کرب کو اور واضح طور پر سمجھ سکتا تھا کہ اس سے پہلے اس نے اس طرح سے اسے کبھی نہیں سمجھا تھا۔

لیکن وہ زندگی اور اس کے چیلنج کی جانب وہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا تھا جو محمود نے اختیار کیا تھا۔ محمود نے اپنے آپ کو مٹا دیا تھا۔ خود کو تباہ کر دیا تھا لیکن سلیم خود کو تباہ کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔

اس روز سلیم اور اس کا دوست مظفر جس نے اس کے ساتھ ہی ایم اے کیا تھا اور دونوں اب تک روزگار کی تلاش میں کراچی کی سڑکیں ناپتے پھرتے تھے، یونیورسٹی کی کینٹین میں بیٹھے ہوئے تھے اور اپنی بدنصیبیوں کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

"کیا راستہ اختیار کیا جائے یار!" مظفر نے بڑی اداسی کے ساتھ سلیم سے کہا۔ "اب تو پورا ایک سال گزر گیا۔ زندگی کا ایک سال کتنا قیمتی ہوتا ہے اور وہ بھی نوجوانی کی عمر کا ایک سال۔ یہی تو وہ عمر ہوتی ہے جب انسان کچھ سیکھتا ہے، کچھ کرتا ہے بلکہ کر گزرتا ہے اور اس عمر کے ماہ و سال بھی اگر یوں آوارہ گردی میں ضائع ہوتے رہے تو پھر باقی کیا بچے گا۔"

"یہ سب سوچتے سوچتے میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے مظفر!" سلیم نے کہا۔ "جانتے ہو کیا ہوتا ہے؟ بعض اوقات میرا پورا وجود نفرت کی آگ میں جلنے لگتا ہے اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ اگر میں نے اس کو نہ بجھایا تو یہ آگ مجھے جلا کر خاک کر دے گی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں سب کچھ پھونک کر رکھ دوں۔ سب کچھ جلا کر راکھ کر دوں، انسانوں کو بھی زندہ جلا دوں۔ آخر ہم نے کیا قصور کیا ہے جو ہم سسک سسک کر، بھٹک بھٹک کر حشرات الارض کی طرح زندگی گزاریں .... اور دوسروں میں کون سے سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں

کون سی خصوصیات ہیں ان کے اندر جو وہ شہنشاہوں کی سی زندگی بسر کریں؟"

"کمال ہے یار!" قریب سے محسن کی آواز سنائی دی۔ وہ ان دونوں کا مشترکہ دوست تھا اور ان کی گفتگو سن کر ایک قریبی میز سے اٹھ کر ان کی طرف آ رہا تھا۔ "اکنامکس میں فرسٹ کلاس ایم اے کئے بیٹھے ہو اور اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ ہر قسم کی معاشی ناانصافی کا علاج کیا ہے اور اسے کس طرح بروئے کار لایا جا سکتا ہے؟"

"بس تم رہنے دو اپنا انقلابی فلسفہ۔" سلیم نے چڑ کر جواب دیا۔ "میں نے وہ سب کچھ بہت اچھی طرح پڑھا ہے۔ تھیوری آف سرپلس ویلیول بھی پڑھی ہے اور انقلابی جدوجہد کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتا ہوں۔ مگر میں تمہارے انقلاب کی آمد کا انتظار نہیں کر سکتا، میرے دوست! تب تک میرے بوڑھے ماں باپ کب کے قبروں میں اتر چکے ہوں گے اور شاید میں خود بھی .... اس خود فریبی کے سہارے میں کب تک اپنے آپ کو زندہ رکھ سکتا ہوں؟ مجھے تو اپنے مسائل کا حل آج چاہئے، میری جان! آج اور اسی وقت۔ میرے پاس انتظار کا وقت کہاں ہے؟ مظفر کا کہنا بالکل ٹھیک ہے۔ نوجوانی کی عمر کا تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ ہم اسے گنوانے کے متحمل کس طرح ہو سکتے ہیں؟"

"فوری حل........." محسن نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔ "نہیں میرے دوست تاریخ میں کوئی شارٹ کٹ نہیں ہوا کرتا۔ اگر بھرپور اور مکمل سماجی حل کی آرزو ہے تو پھر اس کے لئے انتظار کرنا ہو گا۔"

"یہ باتیں بہت ہو چکیں محسن!" سلیم نے سخت بیزاری اور برہمی کے ساتھ کہا۔ "خالی خولی انقلابی فلسفے سے بھوکے پیٹ کو روٹی نہیں ملتی۔ بھوکا آدمی تمہاری صبح نو کے انتظار میں نہیں بیٹھا رہے گا جبکہ اس کی نظروں کے سامنے موٹی موٹی توندوں والے انسان رات دن ہر طرح کی نعمتیں اپنے پیٹ میں اتار رہے ہوں۔ وہ جھپٹا مارے گا محسن! وہ ضرور جھپٹا مارے گا۔ تم اسے کہاں تک روکو گے؟ تم اسے کب تک انقلابی اخلاقیات کا درس دو گے؟ نہیں میرے بھائی! نہیں چلے گا، تمہارا یہ فلسفہ اور کہاں چل رہا ہے؟ مجھے بتاؤ کہاں چل رہا ہے؟"

"بس تو پھر تم بھی کلاشنکوف اٹھا لو اور ڈاکو بن جاؤ۔" محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "مسائل کا ایک انفرادی حل یہ بھی ہے۔"

"ہاں ہے۔" سلیم نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "ایک حل وہ بھی تھا جو محمود نے اپنایا۔ اس نے اپنے آپ کو فنا کر دیا لیکن وہ سراسر احمقانہ سوچ تھی، احمقانہ رویہ تھا۔

اپنے آپ کو برباد کرنے سے کیا فائدہ؟ کیا حاصل؟ برباد کرنا ہی ہے تو ان کو برباد کرو جو سب کو برباد کر رہے ہیں۔ ٹھیک ہے معاشرہ تمہیں تمہارا حق نہیں دے رہا ہے تو پھر یہ تمہارا حق ہے کہ تم اپنا حق چھین لو۔ جس طرح بھی بنے چھین لو۔ اگر معاشرہ تمہیں کچھ دے نہیں سکتا تو پھر تم کو کسی بات سے روکنے کا اختیار بھی نہیں رکھتا۔"

"مطلب یہ ہے کہ کلاشنکوف زندہ باد۔" محسن نے کہا اور ہنستا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

انہی دنوں ایک دن سلیم کو صدر میں ناصرہ نظر آ گئی۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ساجد علی بھی تھا۔ ناصرہ خوب بنی ٹھنی تھی اور اس نے زبردست میک اپ کر رکھا تھا۔ اس کا لباس بھی بہت اعلیٰ درجے کا اور بھاری قسم کا تھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا ہے۔ سلیم نے ان دونوں کو گاڑی سے اترتے دیکھ لیا تھا اور وہ ان سے نظریں بچا کر وہاں سے گزر جانا چاہتا تھا لیکن ناصرہ نے اسے دیکھ لیا اور جلدی سے آگے بڑھ کر اسے روک لیا۔ ناصرہ کے ہونٹوں پر بڑی اپنائیت سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔

"ہیلو سلیم! یوں اس طرح کہاں بھاگے جا رہے ہو؟" ناصرہ نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

"اوہ .... تم ناصرہ!" سلیم نے جلدی سے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ "معاف کرنا' میں نے تو تمہیں دیکھا ہی نہیں تھا۔ کیسی ہو' ٹھیک ٹھاک تو ہو؟"

"کیسی ہوں' وہ تو شاید نظر ہی آ رہی ہوں۔" ناصرہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور ساجد علی کی طرف دیکھا جو سلیم کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا۔ "میری شادی ہو گئی ہے سلیم!"

"ہاں .... وہ تو میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا۔" سلیم نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مبارک ہو' آپ دونوں کو مبارک ہو۔" اس نے ساجد علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا اور ساجد علی نے جلدی سے بڑی گرمجوشی کے ساتھ اس سے مصافحہ کیا۔

"مگر شکایت ہے ناصرہ تم نے شادی کے موقع پر پرانے دوستوں کو بھلا دیا۔"

"اوہ نو سلیم!" ناصرہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔ "ایسی کوئی بات نہیں ہے' میں تو بہت سے لوگوں کو بلانا چاہتی تھی اور خاص طور سے تم کو لیکن میں نے تمہارا گھر نہیں دیکھا تھا۔ تم نے کبھی اپنے گھر بلایا ہی نہیں۔ پھر بھی میں نے تمہارا ایڈریس حاصل کر لیا تھا اور تمہارا کارڈ اپنے ڈرائیور کو دیا تھا کہ پہنچائے آئے لیکن وہ کئی گھنٹے نہ جانے کون کون

علاقوں میں بھٹکنے کے بعد واپس آ گیا .... آئی ایم سوری سلیم!"

"نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔" سلیم نے جلدی سے کہا۔ "بہرحال میری طرف سے دوبارہ دلی مبارکباد .... تمہارے ڈیڈی کیسے ہیں؟ پھر تو انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوئی؟"

"نہیں' خدا کا شکر ہے کہ انہیں پھر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" ناصرہ نے کہا۔ "ویسے وہ کل ہی امریکہ کے لئے روانہ ہوئے ہیں اور اگلے ہفتے میں اور ساجد بھی جا رہے ہیں۔ تم کیا کر رہے ہو آج کل' کہیں سروس کر رہے ہو؟"

"میں .... وہ .... ہاں .... دراصل' سروس تو نہیں کر رہا ہوں۔" سلیم نے اپنے آپ کو سنبھال کر بات بنائی۔ "کافی غور کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نوکری میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ اب میں ایک دوست کے ساتھ مل کر کچھ اپنا ہی کاروبار شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کچھ ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس کرنے کا ارادہ ہے۔" سلیم نے ایک ہی ہلے میں سارے متوقع سوالات کے جوابات دے دیئے تھے۔

"یہ بہت اچھا ہے۔" ناصرہ نے فوراً اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "اصل آمدنی تو اپنے ہی کاروبار میں ہوتی ہے۔ نوکری میں بھلا کیا رکھا ہے۔ اچھا' کسی دن آؤ نا ہمارے گھر۔ ابھی ایک ہفتے تک ہم لوگ یہاں ہیں۔ اس کے بعد شاید لمبے عرصے کے لئے چلے جائیں گے۔"

"اچھا .... دیکھو' کوشش کروں گا۔" سلیم نے کہا۔ "موقع ملا تو آؤں گا۔"

"ہمارا گھر تو تمہیں یاد ہی ہو گا۔" ناصرہ نے پوچھا۔ "اس روز تم پارٹی میں آئے تھے۔"

"ہاں یاد ہے۔" سلیم نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "اچھی طرح یاد ہے۔" بھلا وہ اس گھر کو اور اس رات کو کس طرح بھول سکتا تھا۔ اس گھر میں اس رات کو جس حماقت آمیز تذلیل کا نشانہ بنا تھا اس کے دکھ سے تو آج بھی اس کی روح بوجھل تھی۔

"تو پھر آنا اگر موقع ملے۔" ناصرہ نے اس سے کہا اور پھر وہ لوگ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔ سلیم نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا۔ جتنی دیر تک وہ ناصرہ اور ساجد سے باتیں کرتا رہا تھا اتنی دیر تک وہ اپنی روح کو بوجھل محسوس کرتا رہا تھا۔ اس رات کی وہ ذلت ناک دعوت وہ کبھی بھی نہیں بھول سکتا تھا۔ جب اچانک اس پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ دنیا کا سب سے بڑا احمق ہے۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ بڑی تیزی کے ساتھ اور کچھ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ شاہدہ نے ایم ایس سی کے سال اوّل کا امتحان بہت اچھے نمبروں سے پاس کر لیا تھا اور اب تو فائنل کا بھی تقریباً آدھا سال گزر گیا تھا۔ اس کے بعد اسے مائیکرو بایولوجی میں ایم ایس سی کی ڈگری مل جاتی۔ اسے توقع تھی کہ اس مضمون میں اسے لیکچرار شپ جلد ہی مل جائے گی اور ایک بار گریڈ سترہ کی نوکری مل جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ ابو کتنے پریشان رہتے تھے۔ بھیا کتنے پریشان رہتے تھے۔ ڈیڑھ سال گزر گیا تھا بھیا کو اِدھر سے اُدھر دھکے کھاتے ہوئے۔ کیا ملا' اب تک تو کچھ بھی نہیں.......... کچھ بھی نہیں۔

اور اس شام کو پھر گھر میں ایک تماشے کا اہتمام تھا۔ شاہدہ ان تماشوں سے اس قدر تنگ آ گئی تھی کہ اسے اب ان سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اس قسم کے ہر تماشے سے پہلے اور اس کے بعد اسے شدید ذلت و توہین کا احساس ہوتا۔ اسے یوں لگتا جیسے وہ کوئی انسان ہی نہیں ہے' نہ اس کی کوئی شخصیت ہے' نہ اس کی کوئی عزت ہے' نہ اس کی کوئی پسند و ناپسند ہے۔ پسند و ناپسند کا حق صرف دوسروں کو ہے۔ اسے تو صرف دوسروں کے سامنے اپنے آپ کو "ملاحظے" کے لئے پیش کر دینا ہے اور پھر دوسروں کی مرضی ہے کہ اس کے مقدر کے بارے میں فیصلہ کریں۔

شاہدہ کے ڈیپارٹمنٹ میں بھی بہت سے لڑکے تھے۔ کئی لڑکوں سے اس کی بہت اچھی دوستی بھی تھی لیکن کوئی ایسی صورت بنی ہی نہیں کہ کسی لڑکے کے ساتھ شادی کی کوئی بات چلتی۔ شاید اس نقطۂ نظر سے کسی بھی لڑکے نے اس کو نہیں دیکھا۔ یہاں بھی ایک سماجی رکاوٹ آڑے آئی تھی۔ ایک کلاس میں پڑھنے والے لڑکے لڑکیاں عام طور سے تقریباً ہم عمر ہوتے تھے۔ یا ان کی عمروں میں کوئی معمولی سا فرق ہوتا تھا۔ جبکہ لڑکوں کو کم عمر دلہنوں کی خواہش ہوتی تھی۔

شاہدہ بے چاری کے تو کوئی زیادہ مطالبات بھی نہیں تھے۔ وہ تو کسی بھی غریب اور معمولی لیکن تعلیم یافتہ گھرانے کی بہو بننے کے لئے تیار تھی لیکن تعلیم یافتہ غریب اور متوسط لڑکوں کی ایک بڑی تعداد اپنا کیریئر بنانے کے چکر میں مالدار اور با وسائل خاندانوں کی تلاش میں رہتی تھی اور شاہدہ کے خاندان میں بھلا کیا رکھا تھا۔

اس روز جب اس کی ماں نے اس کو بتایا کہ کچھ لوگ آنے والے ہیں تو شاہدہ کو اس سارے تماشے سے گھن آنے لگی۔

"خدا کے لئے امی! اب یہ سلسلہ بند کر دیجئے۔" اس نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

میں بیزار ہو گئی ہوں اس سے۔ آخر کب تک آپ سب کے سامنے اس طرح مجھے ناچ نچواتی رہیں گی؟ مجھے ذلیل و خوار کرواتی رہیں گی۔ بس بہت ہو گیا۔"

"یہ ہماری مجبوری ہے بیٹی!" صفیہ نے تقریباً گلوگیر آواز میں کہا۔ "یہ ہم سب کی مجبوری ہے بیٹی! تم چاہے کچھ کہہ لو مگر ہم ایسا کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ تمہارے والد اس وقت تک سکھ کا سانس نہیں لے سکتے اور میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتی جب تک تمہاری اور ماجدہ کی شادیاں نہیں ہو جاتیں۔ یہ ماں باپ کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے جس کو پورا کئے بغیر وہ مطمئن نہیں ہو سکتے۔"

"اور بڑے بھائی کی بھی تو۔" پیچھے سے سلیم کی آواز سنائی دی۔ "یہ بڑے بھائی آخر کس مرض کی دوا ہوتے ہیں؟ یہ بھی تو اس وقت تک خود کو مطمئن محسوس نہیں کر سکتے جب تک کہ بہنوں کی شادیاں نہ کر دیں۔"

"کم از کم تم تو ایسی باتیں مت کرو بھیا!" شاہدہ نے برہمی سے کہا۔ "تم نے تو معلوم ہوتا ہے کہ پڑھ لکھ کر ڈبو یا ہے۔"

"نہیں' میں نے ڈبویا کچھ نہیں۔" سلیم نے اچانک گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بالکل صحیح ہے۔ ایک ایک لفظ صحیح ہے۔ دیکھو شاہدہ' ہمارے معاشرے میں اور خاص طور سے مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس میں اور دیگر محنت کش طبقات میں عورت کی ذات اور اس کی شخصیت کو اس وقت تک نامکمل سمجھا جاتا ہے جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے۔ یہ ایک عجب بدنصیبی ہے' مگر ہے۔ اس کو کیا کیا جائے۔ ہزاروں مرد ہوتے ہیں جو ساری زندگی شادی نہیں کرتے اور کوئی بھی نہ تو ان کی شخصیت کو نامکمل سمجھتا ہے اور نہ ان پر اعتراض کرتا ہے لیکن عورت کے بارے میں تو یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ مرد کے نام اور مرد کے سہارے کے بغیر اس کی کوئی زندگی ہی نہیں ہے۔ اس کی زندگی کو تو مکمل طور پر مرد کا تابع سمجھا جاتا ہے۔ ایک غیر شادی شدہ عورت کا اس معاشرے میں زندہ رہنا آسان نہیں جبکہ ایک غیر شادی شدہ مرد کے لئے اس میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اسی لئے .... اسی لئے شاہدہ! ہر ماں' ہر باپ اور ہر بھائی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی اور بہن کی شادی ضرور ہو جائے تاکہ اس کی زندگی بن جائے اور اس کا گھر بس جائے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ والدین اور بھائی تعلیم یافتہ ہوں یا ان پڑھ' یہ ضرورت تو ہر جگہ یکساں ہے۔"

"اچھا بھئی' تم لوگوں کی یہ بڑی بڑی اور لمبی چوڑی باتیں تو میری سمجھ میں نہیں

آتیں۔" صفیہ نے کہا۔ "اب اس قصے کو ختم کرو اور شاہدہ تم جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ۔ ان لوگوں کے آنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے۔"

"کاش کبھی ایسا بھی ہو کہ جس طرح لڑکیوں کو بازار کی جنس بنا کر خریداروں کے سامنے پسند کے لئے پیش کیا جاتا ہے' اسی طرح لڑکوں کو بھی مالِ تجارت کے طور پر گاہکوں کے سامنے سجایا جائے اور گاہک اپنی مرضی کے مطابق ان کے سلسلے میں کوئی فیصلہ کریں۔"

سلیم کو بے ساختہ ہنسی آ گئی اور غصے اور افسردگی کے غلبے کے باوجود شاہدہ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئی۔

"اور اب .... ذرا مہربانی کر کے آپ بھی وہ راسلک والا شلوار سوٹ پہن لیجئے۔" شاہدہ کے جانے کے بعد صفیہ نے اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا۔ "میں نے اس پر استری کر دی ہے۔"

راسلک کا یہ سوٹ وسیم احمد نے دو سال پہلے عید کے موقع پر بنوایا تھا۔ وہ خود تو کیا بنواتا' سلیم نے اپنی ٹیوشن کے پیسوں میں سے کچھ پیسے بچا کر رکھے تھے۔ وہ کئی ماہ سے تھوڑے تھوڑے پیسے اسی غرض سے بچا رہا تھا اور پھر اس نے بازار سے اپنے باپ کے لئے شلوار قمیض کے لئے راسلک کا کپڑا خریدا تھا جو بہت مہنگا تھا اور جب سلیم یہ کپڑا لے کر گھر آیا تھا تو وسیم احمد اس پر بہت ناراض ہوا تھا اور کسی طرح بھی اس بات کے لئے راضی نہیں ہو رہا تھا کہ اس کپڑے کا سوٹ بنوائے لیکن گھر کے تمام لوگوں نے سلیم کی حمایت کی۔ آخر وسیم احمد کے پاس کوئی تو ڈھنگ کا شلوار سوٹ ہوتا۔ جو بھی دو چار سوٹ تھے وہ پرانے ہو گئے تھے اور ان کے کالر اور کف گھس گئے تھے۔ کپڑے پر بھی جا بجا روئیں نکل آئے تھے۔ دیکھنے سے ہی معلوم ہوتا تھا کہ یہ کافی پرانے کپڑے ہیں۔ چنانچہ سلیم کے لائے ہوئے اس کپڑے کو بہت پسند کیا گیا۔ شلوار تو فوراً ہی صفیہ نے گھر میں سی دی اور قمیض درزی سے سلوائی گئی اور پھر جب اس نے اس بہت نفیس اور عمدہ کپڑے کے شلوار سوٹ کو پہنا تو اسے خود بھی بہت اچھا لگا اور اس نے اپنے آپ کو بچوں کی طرح خوش محسوس کیا۔

اور اس دن کے بعد سے وہ راسلک کے اس سوٹ کو صرف خاص خاص موقعوں پر ہی پہنا کرتا۔ وہ خود سے تو کچھ نہیں کہتا تھا' یہ فیصلہ کرنا صفیہ کا کام تھا کہ وہ کب اور کس وقت اس سوٹ کو پہنے اور یہ بات گویا ایک طرح سے طے ہو کر رہ گئی تھی کہ جب کوئی لڑکے والے شاہدہ کو دیکھنے کی غرض سے آئیں گے تو اس موقع پر وسیم احمد یہ راسلک والا

شلوار سوٹ پہنے گا۔

چنانچہ آج بھی صفیہ نے پہلے ہی اس سوٹ پر استری کر کے اسے تیار کر دیا تھا اور اب وسیم احمد کو اسے ایک بار پھر پہننا تھا۔

"ایک بار شاہدہ کا رشتہ کہیں طے ہو جائے تو پھر اس سوٹ کو اٹھا کر رکھ دوں گا۔" وہ دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہتا۔ "پھر اس کو اس وقت پہنوں گا جب ماجدہ کی شادی کا وقت آئے گا اور اس کو دیکھنے کے لئے کوئی آئے گا۔"

آج جو پارٹی آنے والی تھی اس کا لڑکا کے ای ایس سی میں انجینئر تھا اور ان لوگوں کی رہائش نارتھ کراچی میں بفر زون میں تھی۔ لڑکے کے والد ریلوے میں کام کرتے تھے مگر اب ریٹائر ہو چکے تھے۔

سارے گھر میں خصوصی مہمانوں کے خیرمقدم کی تیاریاں جاری تھیں اور ماجدہ باورچی خانے میں بڑی سرگرمی کے ساتھ کام میں مصروف تھی۔ اس نے چائے کے ساتھ کھانے کے لئے کئی قسم کی چیزیں تیار کر لی تھیں اور وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی کہ کاش اس بار آپا کی بات پکی ہو جائے۔ گھر کے سب لوگ آپا کی وجہ سے کتنے پریشان رہتے تھے سب کے ذہنوں میں بس ایک ہی خیال مسلط تھا۔ آپا کی شادی۔ اب تو کوئی چھ ماہ کے بعد وہ ایم ایس سی بھی ہو جائیں گی۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا جائے گا شادی کے امکانات محدود ہوتے جائیں گے۔ کوئی بھی تعلیم یافتہ' ڈگری یافتہ لڑکی اپنی عمر کو چھپا نہیں سکتی۔ اگر وہ ماسٹرز ڈگری کی حامل ہے تو فوراً ہی یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اس نے یہ ڈگری کس سن میں حاصل کی تھی اور پھر اس سے بآسانی اس کی عمر کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ ماسٹرز ڈگری کے حصول کے بعد زیادہ عرصہ گزر جانے کا مطلب تھا شادی کے امکانات کا تقریباً ہمیشہ کے لئے ختم ہو جانا۔

تھوڑی دیر کے بعد صفیہ نے باورچی خانے کا چکر لگایا اور سارے انتظامات کا جائزہ لے کر اطمینان کا اظہار کیا۔

"بازار سے چیزیں منگواؤ تو کس قدر مہنگی پڑ جاتی ہیں۔" صفیہ نے ماجدہ سے کہا۔ "پیسے تو چلے جاتے ہیں بھر مٹھی اور سامان آتا ہے بالکل ذرا سا جیسے بلبل کا چوگا۔ بھلا کس کس کی ناک میں دھونی دیتے پھریں' اسی لئے تو گھر میں چیزیں تیار کر لینا زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ کم خرچ میں زیادہ چیزیں تیار ہو جاتی ہیں۔"

"اور پھر اس وقت کس قدر غصہ آتا ہے' کیسی جان جلتی ہے جب مسٹنڈے' مفت

خورے آکر سب کھا جاتے ہیں۔ خوب اپنے پیٹوں میں ٹھونس لیتے ہیں سب کچھ اور اس کے بعد پلٹ کر خبر بھی نہیں لیتے کمبخت۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صرف کھانے کے لئے ہی یہاں آتے ہوں۔ میں تو مفت خوروں کو کھلاتے کھلاتے تھک گئی ہوں امی! خدا کرے یہ سلسلہ جلدی ختم ہو اور آپا کی بات کہیں پکی ہو جائے۔" ماجدہ نے کہا۔

"بس دعا کرو بیٹی!" صفیہ نے آہستہ سے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "خدا ہماری دعا سن لے۔"

ماجدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنی ماں کو یہ نہیں بتایا کہ اس نے تو اتنی دعائیں مانگی تھیں' اتنی دعائیں مانگی تھیں کہ اس کی زبان گھس گئی تھی لیکن اب تک کوئی بھی دعا قبول نہیں ہوئی تھی۔ معلوم نہیں وہ دعائیں کون سی ہوتی ہیں جو قبول ہو جاتی ہیں۔ شاید ان دعاؤں کا معیار کچھ مختلف ہوتا ہو گا۔

شاہدہ نے آئینے میں اپنے آپ کو آخری بار دیکھا اور پھر خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر ایک کتاب پڑھنے لگی لیکن وہ کچھ نہیں پڑھ رہی تھی۔ کتاب اس کے سامنے کھلی ہوئی تھی۔ سطریں اور الفاظ اس کی نگاہوں کے سامنے موجود تھے لیکن وہ کچھ نہیں پڑھ رہی تھی۔ اس کا دماغ تو نہ جانے کہاں کہاں بھٹک رہا تھا۔ کتنے لوگ تھے جو اسے دیکھ کر جا چکے تھے وہ کتنے لوگوں کے سامنے اپنے آپ کو بکاؤ مال کی طرح پیش کر چکی تھی اور اب تو توہین کا یہ احساس واقعی ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن کیا بھی کیا جا سکتا تھا۔ سلیم نے اس وقت جو کچھ بھی کہا تھا وہ بالکل صحیح تھا۔ جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی اس کے والدین اور بھائی کے دماغ کو سکون نہیں مل سکے گا۔ وہ لوگ اسی طرح پریشان رہیں گے۔

شاہدہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد وہ کچھ نہ کچھ تو کر ہی سکتی تھی۔ اس کی نوبت نہیں آ سکتی تھی کہ اسے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش آئے۔ وہ معاشی طور پر ایک آزاد زندگی گزار سکتی تھی لیکن سماجی طور پر ایک آزاد زندگی گزارنا اس کے لئے بہت مشکل تھا۔ جس طبقے سے اس کا تعلق تھا' وہاں کی روایات نے اس چلن کو ابھی تک قبول نہیں کیا تھا۔

چند منٹ کے بعد ماجدہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے باورچی خانے کا کام ختم کر لیا تھا اور اب ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لئے تھے اور وہ تیار ہو گئی تھی۔
اس نے بڑی کڑی تنقیدی نظروں سے شاہدہ کا جائزہ لیا اور پھر مسکرا کر بولی۔ "بہت

اچھی لگ رہی ہو آپا! بہت ہی اچھی۔ بہت ہی پیاری' خدا کرے وہ لوگ تمہیں پسند کر لیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تمہیں ضرور پسند کریں گے۔"

"جہنم میں جائیں۔" شاہدہ نے بیزاری کے ساتھ کہا۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ بس جلدی سے آئیں اور جلدی سے جائیں۔ میں زیادہ دیر تک ان کی منحوس نظروں کی تاب نہیں لا سکتی۔"

کچھ دیر کے بعد مہمان آ گئے۔ وسیم احمد نے را سلک کے نفیس شلوار سوٹ میں ملبوس' مہمانوں کا خیرمقدم کیا۔ اس کے ساتھ صفیہ اور سلیم بھی تھے۔ ماجدہ دوبارہ باورچی خانے میں چلی گئی تھی اور شاہدہ دوسرے کمرے میں تھی۔

لڑکے کا نام دلدار حسین اور اس کے والد کا نام سردار حسین تھا۔ سردار حسین کی بیوی بھی ساتھ آئی تھی اور اس کے علاوہ ایک بیٹی بھی جو شادی شدہ تھی اور جس کا شوہر کہیں مڈل ایسٹ میں کام کرتا تھا' وہ اس چھوٹے سے گھر کی ہر چیز کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھ رہی تھی اور اس کے چہرے سے ناگواری کا تاثر صاف عیاں تھا۔

میزبانوں نے مہمانوں کو بڑے عزت و احترام کے ساتھ لا کر اس چھوٹے سے کمرے میں بٹھایا جسے ڈرائنگ روم کہا جا سکتا تھا۔ اس کمرے کی تزئین و آرائش جس انداز سے کی گئی تھی اس سے اس کے مکینوں کی مالی اور معاشی حالت کا کافی حد تک اندازہ ہو سکتا تھا۔

سردار حسین کی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور وہ بار بار فرش' دیواروں اور چھت کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہاں کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ اس کا بیٹا دلدار حسین بھی یہاں آ کر کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آ رہا تھا اور اس کے چہرے پر قدرے بیزاری کے آثار تھے۔ اسے شاید ایک سو بیس گز کے اس پرانی طرز کے بدحال مکان کے بدحال مکین کچھ زیادہ پسند نہیں آئے تھے۔

"آپ کی بیٹی شاہدہ کو میں پہلے بھی دیکھ چکی ہوں۔" سردار حسین کی بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ لڑکی بہت پسند ہے۔ ماشاء اللہ بہت اچھی' بہت پیاری بچی ہے اور پھر جیسا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے لکھنے پڑھنے میں بھی بہت تیز' تو پھر اس کے علاوہ اور کیا چاہئے۔"

وسیم احمد اور صفیہ کو جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے ایک طویل عرصے کے بعد بالآخر خدا نے ان کی سن لی ہو اور ان کی دلی مراد بر آئی ہو۔

آنے والے مہمانوں نے تو فوراً شاہدہ کے لئے اپنی پسندیدگی کا اعلان کر دیا تھا۔

"ہم تو صاحب ذاتی خوبیوں کے قائل ہیں۔" سردار حسین نے بڑے مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کی صاحبزادی کا تعلیمی کیریئر ماشاء اللہ بہت اچھا رہا ہے، وہ کبھی فیل نہیں ہوئیں اور اب خدا کے فضل سے وہ ایم ایس سی کے آخری سال میں ہیں۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد انہیں کوئی اچھی سروس بھی ضرور مل جائے گی۔ ان کا مضمون تو ایسا ہے جس میں کافی گنجائش ہے۔ مائیکرو بیالوجی میں کر رہی ہیں نا؟"

"جی ہاں۔" سلیم نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "مائیکرو بیالوجی میں ایم ایس سی کر رہی ہیں۔"

شاہدہ کو دیکھنے کی غرض سے آنے والوں میں یہ پہلے لوگ تھے جو واقعی اس کی ذاتی خوبیوں اور اس کے تعلیمی کیریئر کی بات کر رہے تھے اور انہوں نے پہلی ہی ملاقات میں بالکل کھل کر اس کے لئے اپنی پسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا۔ سلیم کا دل خوشی سے لبریز ہوا جا رہا تھا اور ساتھ ہی وسیم احمد اور صفیہ بھی دل ہی دل میں بہت خوش ہو رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ دولہا والوں نے رشتہ پسند کر لیا ہے اور اب واقعی شاہدہ کی شادی ہو جائے گی۔

"اور اب امتحان میں بھی زیادہ دن باقی نہیں ہیں۔" صفیہ نے کہا۔ "چند ماہ کی بات اور ہے۔ پھر سالانہ امتحان ہو جائے گا اور شاہدہ انشاء اللہ ضرور اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گی۔"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔" سردار حسن نے جلدی سے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ "ماشاء اللہ ذہین اور ہوشیار بھی ہیں۔ کبھی ایک بار بھی فیل نہیں ہوئیں۔ ضرور کامیاب ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ۔"

اسی وقت شاہدہ چائے کے سامان کی ٹرالی کو دھکیلتی ہوئی کمرے کے اندر داخل ہوئی اور اس نے بیزار اور لاتعلق سے انداز میں سب لوگوں کو سلام کیا۔ اس کی نگاہیں اگرچہ جھکی ہوئی تھیں تاہم اس نے دزدیدہ نظروں سے اس لڑکے کی طرف ضرور دیکھ لیا جس کا نام دلدار حسین تھا اور جو اس کو دیکھنے کی غرض سے اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں شاہدہ کو اس میں درجنوں عیب نظر آ گئے۔

"موصوف سے کوئی کہے کہ ذرا آئینے میں اپنی شکل بھی دیکھ لیا کرو۔" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "اس قدر چھوٹا سا تو چہرہ ہے جیسے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گیا ہو اور پھر

ہزار کوشش کے باوجود آگے نہ بڑھا ہو اور ناک .... اس چھوٹے سے چہرے پر اتنی بڑی ناک .... کیسی بھدی لگ رہی ہے۔"

لیکن پسند اور انتخاب کا حق شاہدہ کو نہیں تھا۔ یہ حق تو اسے دیا ہی نہیں گیا تھا۔ اس حق کے علمبردار تو وہ تھے جو اس وقت اس کے سامنے اس کے گھر کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔

شاہدہ نے اپنے ہاتھ سے چائے بنائی اور بڑے ادب اور تمیز کے ساتھ ایک ایک پیالی سب کے سامنے رکھ دی۔ ایک ایک خالی پلیٹ اور چمچہ بھی اس نے مہمانوں کے سامنے بڑھایا تاکہ وہ کچھ کھانے کا سلسلہ بھی شروع کر سکیں اور پھر وہ وہاں چند منٹ تک رکنے کے بعد واپس چلی آئی۔ اسے اس سارے مصنوعی ماحول سے سخت گھبراہٹ اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔

سلیم نے دلدار حسین کو خوب غور سے دیکھا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اسے دلدار حسین ذرا بھی پسند نہیں تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور جسم بالکل منحنی تھا۔ خد و خال بھی بہت معمولی اور بس واجبی واجبی سے تھے جبکہ اس کے مقابلے میں شاہدہ دراز قد، صحت مند اور بھرے بھرے بدن کی لڑکی تھی۔ نقوش میں ایک خاص قسم کا تیکھا پن تھا۔ بس ذرا رنگت سانولی تھی لیکن اس سانولی رنگت کا بھی اپنا ایک نکھار تھا۔ وہ نکھار جو جوانی کی دین تھا اور ہر نوجوان چہرے میں خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔

شاہدہ کے کمرے سے نکل جانے کے بعد سردار حسین نے اپنی بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لو بھئی اب بات چیت کو لو جو کرنی ہے۔ لڑکی کو تو تم پہلے ہی پسند کر چکی ہو۔"

"ہاں، تو اب ہم باقاعدہ پیغام دے رہے ہیں۔" اس کی بیوی نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جو قاعدہ ہے اس کے مطابق کام ہو گا۔" اور پھر وہ صفیہ اور وسیم احمد کی طرف باری باری دیکھ کر مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ "ہمارے لڑکے دلدار حسین کو آپ نے دیکھ لیا۔ آپ کے سامنے بیٹھا ہے۔ اس کے بارے مین باقی باتیں آپ کو معلوم ہی ہیں اور جو کچھ معلوم کرنا چاہیں اپنے طور پر معلوم کر لیں یا ہم سے پوچھ لیں اور ہمارے بیٹے کو اپنی فرزندی میں قبول فرمائیں۔"

سردار حسین کی بیوی بڑے لچھے دار انداز میں بول رہی تھی اور وسیم احمد کا دل خوشی سے اچھل رہا تھا۔ صفیہ کی آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے بھیگ رہی تھیں لیکن وہ

ان آنسوؤں کو پی جانے کی پوری کوشش کر رہی تھی اور سلیم کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے سر سے کوئی بہت بڑا بوجھ اتر رہا ہو۔ وہ خود کو ایک دم ہلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ وقتی طور پر اپنی بے روزگاری کا غم بھی بھول گیا تھا جو رات دن اسے گھن کی طرح چاٹے جا رہا تھا۔ دن پر دن گزرتے جا رہے تھے اور وہ وہیں کھڑا تھا۔ جہاں سے اس نے زندگی کے سفر کا آغاز کیا تھا۔ ابھی تک تو چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں ہوا تھا۔

"اس عزت افزائی شکریہ بہن صاحبہ!" وسیم احمد نے تقریباً مرتعش آواز میں کہا۔ "ہماری بیٹی بھی آپ ہی کی بیٹی ہے ...." اور اس کے آگے وہ کچھ کہہ نہ سکا کیونکہ آواز اس کے حلق میں پھنسنے لگی تھی اس کا گلا رندھ رہا تھا۔

"مبارک ہو بھائی صاحب!" دلدار حسین کی ماں نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ "اور اب جلدی سے منہ میٹھا کروائیے۔"

"آپ کو بھی مبارک ہو بہن صاحبہ!" وسیم احمد نے کہا اور پھر وہاں موجود سب لوگ جلدی جلدی ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے۔ دلدار حسین اور اس کی بہن نے بھی مبارکباد کے ان تبادلوں میں حصہ لیا اور اس کے بعد مٹھائی بھی کھائی۔

"اچھا تو بہن اب ہم منگنی کی تاریخ طے کرنے کے لئے کوئی ہفتے بھر بعد آپ کی خدمت میں آئیں گے۔" سردار حسین نے کہا۔ "ایک دو ماہ میں منگنی ہو جائے گی اور پھر شادی کی تاریخ طے کر لیں گے۔"

"جیسی آپ لوگوں کی مرضی۔" وسیم احمد نے جواب دیا۔ "ویسے شادی شاہدہ کے امتحانات کے بعد ہی ہو سکے گی۔"

"اس سے بھلا کیسے انکار ہو سکتا ہے بھائی صاحب!" سردار حسین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں ایک اہم بات اور واضح کرتا چلوں ہم لوگوں کو جہیز وغیرہ کے معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ آپ کا اور آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے۔ آپ جو کچھ دیں گے وہ اپنی بیٹی کو دیں گے۔ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ ہماری طرف سے اس سلسلے میں کوئی مطالبہ نہیں ہے۔"

سلیم کا جی چاہا کہ آگے بڑھ کر سردار حسین کا منہ چوم لے۔ واقعی کتنا اچھا آدمی تھا وہ۔ اس نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دی تھی اور اس کا مطلب تھا کہ واقعی ان لوگوں کو شاہدہ اپنی ذاتی خوبیوں کی بنا پر پسند تھی۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور پھر اچانک سردار حسین کہنے لگا۔

"یہ مکان تو آپ نے کافی عرصے پہلے بنوایا ہو گا بھائی صاحب!"

"جی ہاں۔" وسیم احمد نے فخر و مسرت کے ساتھ جواب دیا۔ اب تک آنے والوں میں سردار حسین پہلا آدمی تھا جس نے اس کے بنوائے ہوئے اس مکان میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ "بہت زمانہ ہو گیا بنوائے ہوئے صاحب۔ یوں سمجھ لیجئے کہ جس وقت میں نے یہ مکان بنوایا تھا اس وقت سیمنٹ کی ایک بوری سات روپے کی آتی تھی۔ ریتی بجری کا بڑے سے بڑا ٹرک پینتیس چالیس روپے کا مل جاتا تھا اور ٹیک کی لکڑی ستر سے لے کر اسی روپے تک کیوبک فٹ اور دیار کی لکڑی بیس بائیس روپے کیوبک فٹ ہوتی تھی۔"

"جی ہاں' اور ذرا آج کے دور سے مقابلہ کیجئے۔" سردار حسین نے جلدی سے کہا۔ "اسی روپے کی بوری ہے سیمنٹ کی اور سریا ساڑھے بارہ ہزار روپے ٹن' ریتی بجری کا ٹرک ساڑھے چار سو روپے سے لے کر چھ سو روپے تک کا۔ بھلا کوئی انتہا ہے مہنگائی کی۔"

"آج کل کے دور میں تو صاحب مڈل کلاس لوگوں کے لئے مکان بنوانا تقریباً ناممکن ہے۔" وسیم احمد نے جلدی سے کہا۔

"جی ہاں۔" سردار حسین نے کہا۔ "اور آج کل نوجوانوں کے لئے اچھی تنخواہ پانے اور اچھے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود مکان کا مسئلہ بڑا سنگین ہوتا جا رہا ہے۔ اب دلدار ہی کو لے لیجئے۔ بہت اچھی تنخواہ ہے اس کی پکی نوکری ہے بہت ساری دیگر سہولتیں ہیں لیکن اس کے باوجود یہ مکان کے مسئلے کو حل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آج کل تو ایک سو بیس گز کا ایسا مکان بنوانے کے لئے بھی بہت بڑی رقم کی ضرورت ہوتی ہے اور ایک ایسے نوجوان انجینئر کے پاس جس نے اپنے کیریئر کا ابھی ابھی آغاز کیا ہو بھلا اتنی بھاری رقم کس طرح آ سکتی ہے؟"

"آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا بھائی صاحب!" وسیم احمد نے اس خوفناک تمہید کے اصل مقصد کو سمجھے بغیر اس کے خیال سے فوری طور پر اتفاق کیا۔ "واقعی آج کل کے شدید مہنگائی کے دور میں مکان بنوانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔"

"تو بس بھائی صاحب اتنی مہربانی کیجئے گا کہ یہ مکان آپ شاہدہ بیٹی کے نام لکھ دیجئے گا۔" سردار حسن نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا۔ "مکان شاہدہ بیٹی کے نام ہو گا تو اس سے بڑی سہولت ہو جائے گی۔ دلدار میاں کچھ پیسے لگا کر اوپر کی منزل بنوا لیں گے اور پھر سال رہ سکیں گے' آپ لوگوں کو بھی کوئی پریشانی نہیں ہو گی اور........"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بھائی صاحب!" صفیہ ایک دم چونک کر بولی۔ "ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔ ہمارے پاس یہی تو ایک مکان ہے۔ کون سے دو چار مکانات موجود ہیں؟ اگر ہم ایک بیٹی کو جہیز میں مکان دیں گے تو دوسری کو کیا دیں گے؟"

"چھوٹی کا وقت آنے پر بھی اللہ تعالیٰ مہربان ہو گا بہن! اور کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔" سردار حسین نے بڑے دعائیہ انداز میں کہا۔ "انسان کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔"

"تو پھر آپ بھی اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ رکھئے انکل!" سلیم نے فوراً جواب دیا۔ "آپ کے صاحبزادے کے لئے بھی مکان کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔ اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

بڑے میاں کی پیشانی پر ایک دم بل پڑ گئے۔ سلیم کا یہ ٹکا سا جواب انہیں بالکل پسند نہیں آیا تھا۔

"کمال ہے صاحب!" سردار حسین نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "اتنی معمولی سی بات آپ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ ارے صاحب مکان رہے گا تو آپ کی بیٹی کے نام، ہم یہ کب کہہ رہے ہیں کہ آپ یہ مکان دلدار حسین کے نام کر دیں۔ ہم تو آپ سے یہی کہہ رہے ہیں کہ اسے اپنی بیٹی کے نام کر دیجئے۔"

"شادی کے بعد جو کچھ میاں کا ہوتا ہے بیوی کا بھی تو ہوتا ہے اور جو کچھ بیوی کا ہوتا ہے وہ میاں کا بھی ہوتا ہے۔" وسیم احمد نے بڑے تحمل کے ساتھ جواب دیا۔ "آپ اس بات پر اصرار نہ کریں بھائی صاحب! ہمارے پاس اس مکان کے علاوہ اور کوئی دوسرا مکان نہیں ہے۔ ہمیں ابھی ایک اور بیٹی کی بھی شادی کرنی ہے۔ خدا کے واسطے ہمیں اس کڑی آزمائش میں مت ڈالئے۔"

"آزمائش .... کیسی آزمائش؟" سردار حسین نے ایک زہر خند کے ساتھ کہا۔ "اس چھوٹے سے مسئلے کو آزمائش تو آپ لوگ خود بنا رہے ہیں۔ بہرحال سوچ لیجئے۔ اچھی طرح غور کر لیجئے۔ ہمیں جو کچھ کہنا تھا وہ ہم کہہ چکے ہیں۔ ہماری طرف سے اس رشتے کے لئے یہی ایک واحد شرط ہے اور یہ کوئی ایسی بڑی شرط نہیں ہے جس کا پورا کرنا آپ لوگوں کے بس میں نہ ہو۔ آپ چاہیں تو بڑی آسانی سے اور خوش اسلوبی سے اس معاملے کو طے کر سکتے ہیں۔"

"بھائی صاحب!" صفیہ کی آواز بھرانے لگی۔ "خدا کے واسطے، ہماری پوزیشن

سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ جو مطالبہ آپ کر رہے ہیں اس کو پورا کرنا ہمارے بس میں نہیں ہے۔"

"پھر آپ کی مرضی ہے بہن صاحبہ!" سردار حسین نے اٹھتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی اپنے گھر والوں کو بھی اٹھنے کا اشارہ کر دیا۔ وہ سب لوگ جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں کے اعصاب تن گئے تھے اور ان پر جھلاہٹ کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

سلیم کے جسم میں، اس کے دل و دماغ میں، خون کی جگہ جیسے لاوا کھول رہا تھا۔ جو پھٹ پڑنے کو بیتاب تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اس خبیث شکل والے لالچی بوڑھے کی گردن مروڑ دے اور اس منحنی پستہ قد حریص انجینئر کو اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دے جو اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرنے کے بجائے دوسروں سے بھیک مانگتا پھر رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن شدید غیظ و غضب کے عالم میں اس سے ضبط نہ ہو سکا اور اس کی زبان سے زہر میں بجھے ہوئے تیروں جیسے الفاظ کی بارش ہونے لگی۔ "یہ بھیک مانگنا ہے بڑے صاحب بھیک مانگنا۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ "آپ اپنے لڑکے کو ساتھ لے کر بھیک مانگنے نکلے ہیں تو کوئی اور دروازہ کھٹکھٹائیے۔ ہمارے پاس آپ لوگوں کے کشکول میں ڈالنے کے لئے کچھ نہیں ہے۔"

"تم حد سے بڑھ رہے ہو صاحبزادے!" سردار حسین نے غصے میں کہا۔ "میں ایسی توہین برداشت نہیں کر سکتا۔ ہم لوگ جا رہے ہیں۔"

"بھکاری کی کوئی عزت نہیں ہوتی بڑے صاحب!" سلیم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "اور جس کی کوئی عزت ہی نہ ہو اس کی توہین کا بھلا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ آپ مکان کی بھیک کہیں اور جا کر مانگئے۔ شاید کوئی سخی داتا آپ کے بیٹے کی حالتِ زار پر ترس کھا کر آپ کا سوال پورا کر دے۔"

اس سے زیادہ توہین آمیز اور ذلت سے لبریز باتیں سردار حسین اور اس کے گھر والوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی ہوں گی۔ وہ سب کے سب لوگ فوراً اٹھ کر باہر نکل گئے اور سب سے زیادہ بری حالت اس نوجوان انجینئر کی نظر آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے چہرے پر کسی نے پچاس جوتے لگا دیئے ہوں۔

شاہدہ دوسرے کمرے میں موجود تھی اور وہاں سے اس ساری گفتگو کو سن رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔ اس "پارٹی" کے جاتے ہی وہ کمرے میں آ گئی اور سلیم کے کندھے

پر ہاتھ رکھ کر بڑے جوشیلے انداز میں بولی۔ "بہت اچھا کیا بھیا! بہت ہی اچھا کیا۔ میری طرف سے ان لوگوں کو دو دو جوتے بھی مار دیتے تو اور زیادہ اچھا تھا۔ چلے آئے ہیں دکانداری کرنے۔"

صفیہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میز پر کھانے پینے کی بچی کھچی اشیاء رکھی ہوئی تھیں اور دو پیالیوں میں چائے ابھی تک بھری ہوئی تھی جسے ختم کئے بغیر ہی وہ لوگ اٹھ گئے تھے۔

وسیم احمد اپنی کرسی پر بت بنا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ جیسے پتھر کا ہو رہا تھا اور اس کی ویران آنکھیں خلا میں گھور رہی تھیں۔ اس نے اپنی راسلک کی قمیص کے دامن کو اپنے ایک ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا اور آہستہ آہستہ کھینچ رہا تھا۔ اسی وقت ماجدہ بھی کمرے کے اندر آ چکی تھی۔

"دے دیا ہوتا ابو!" ماجدہ نے تقریباً بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "دے دیا ہوتا مکان انہیں آخر ملکیت تو آپا ہی کی رہتا۔ کیا فرق پڑتا تھا؟"

"تم چپ رہو۔" شاہدہ نے اسے بری طرح ڈانٹا۔ "خبردار جو بے ہودہ باتیں کیں کوئی اس مکان کی طرف آنکھ اٹھا کر تو دیکھے میں تو اس کی آنکھیں نکال لوں گی۔ یہ سب کی ملکیت ہے۔ ہم سب کے سر چھپانے کی جگہ ہے۔ کس کی مجال ہے جو اسے ہم سے چھیننے کے بارے میں سوچ بھی سکے۔"

"بات یہ ہے کہ ہمارے پاس اس مکان کے علاوہ اور رکھا بھی کیا ہے؟" بڑی دیر کے بعد وسیم احمد نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "ہم اس کے علاوہ اور دے بھی کیا سکتے ہیں؟ سب لوگ اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور اسی لئے سردار جی نے فوراً مکان کا مطالبہ کر دیا۔"

اسی رات کو وسیم احمد کی طبیعت خراب ہو گئی۔ اس کے سینے میں شدید درد اٹھا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ سب لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور سلیم نے محلے میں اپنے ایک دوست کو جگایا جس کے پاس کار تھی اور اس سے مدد طلب کی اس نے فوراً آمادگی ظاہر کی اور پھر وہ لوگ وسیم احمد کو لے کر امراضِ قلب کے ہسپتال میں پہنچے۔ سلیم کا دوست گاڑی چلا رہا تھا اور سلیم اور شاہدہ اپنے بے ہوش باپ کے ساتھ موجود تھے۔ ماجدہ اور امی گھر پر تھیں۔ راستہ خراب تھا بار بار جھٹکے اور دھچکے لگ رہے تھے۔ جن سے مریض کا بے ہوش جسم بری طرح ہل رہا تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح یہ لمبا راستہ ختم ہوا اور وہ لوگ

انسٹیٹیوٹ آف کارڈیو ویسکولر ڈیزیز' یعنی امراضِ قلب کے ادارے کی شاندار اور وسیع و عریض عمارت میں داخل ہوئے۔ گاڑی سیدھی عمارت کے عقب میں ایمرجنسی میں لے جائی گئی اور وسیم احمد کو فوری طور پر اندر پہنچا دیا گیا۔ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹروں نے اس کا علاج شروع کر دیا اور اسے انتہائی نگہداشت کے یونٹ میں پہنچا دیا گیا کیونکہ اس کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔

وسیم احمد تین دن تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہا اور پھر اس کی جان بچ گئی لیکن اس کے ساتھ ہی مسائل کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ڈاکٹروں نے سلیم اور شاہدہ کو یہ بتایا کہ وسیم احمد کو ابھی کچھ دن ہسپتال میں رہنا ہو گا جس کے دوران اس کا علاج ہوتا رہے گا اور پھر بعد میں تفصیلی معائنہ ہو گا۔

"لیکن میں ایک بات آپ لوگوں کو ابھی سے بتا سکتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "ہم ان کا علاج کرنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں اور کریں گے لیکن ان کی بیماری کی جو نوعیت ہے اس کے پیشِ نظر ہم زیادہ پُرامید نہیں ہیں۔ ہاں اگر آپ لوگوں کے لئے ان کو باہر لے جانا ممکن ہو تو ضرور لے جائیں اور بائی پاس کروا لیں اس صورت میں جان بچ سکتی ہے مگر اس کے لئے کئی لاکھ روپے کے خرچ کی ضرورت ہے۔"

اس رات سلیم جب بستر پر لیٹا تو اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان برپا تھا۔ برسہا برس سے پکنے والا زہر اس کے وجود کے رگ و ریشے میں اترتا جا رہا تھا۔

اس رات وہ نفرت اور غم و غصہ کی شدید کیفیت میں پھوٹ پھوٹ کر سسکیوں سے رویا۔ وہ اوپر والے چھوٹے سے کمرے میں اکیلا تھا اور اس کی سسکیوں کو سننے والا کوئی نہ تھا۔

"کہاں سے آئے گا لاکھوں روپیہ بائی پاس کے لئے؟" اس کا روتا ہوا دل اس سے سوال کر رہا تھا۔ "ابو نے ساری زندگی دیانتداری کے ساتھ محنت کی' انہوں نے کبھی کسی ایک لمحے کے لئے بھی دھوکہ نہیں دیا اور آج .... آج وہ مر رہے ہیں اور ان کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ میرے پاس بھی پیسہ نہیں ہے' ہم میں سے کسی کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ ہم ابو کو علاج کے لئے باہر نہیں لے جا سکتے۔ ناصرہ کا باپ باہر جا سکتا ہے۔ سیٹھ فضلی باہر جا کر بائی پاس بھی کروا سکتا ہے اور ہر سال چیک اپ کے لئے بھی باہر جا سکتا ہے' کیوں؟ کون سی خاص بات ہے اس منحوس چیچک رو سیٹھ میں؟ یہی نا کہ وہ پیسے والا ہے۔ وہ دنیا کے اس بازار میں صحت اور تندرستی خرید سکتا ہے۔ میرے باپ کے پاس یہ

استطاعت نہیں ہے کیونکہ وہ محض ایک ایماندار محنت کش ہے۔ اس نے صرف محنت کی ہے اس نے سیاست اور تجارت نہیں کی۔" سلیم کے دل میں طرح طرح کے طوفان گرجتے رہے۔ "روز اخبار اٹھا کر دیکھو۔ آج فلاں سیاسی پارٹی کا فلاں لیڈر بائی پاس کے لئے لندن جا رہا ہے۔ آج فلاں لیڈر بائی پاس کے لئے امریکہ جا رہا ہے۔ کون ہیں یہ لوگ؟ کس کے لیڈر ہیں؟ کس کی نمائندگی کرتے ہیں یہ؟ ان کے پاس پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ پیسہ میرے پاس کیوں نہیں ہے؟ پیسہ ابو کے پاس کیوں نہیں ہے؟ کیوں نہیں ہے؟ شاید اس لئے کہ ہم ایمانداری اور دیانتداری کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ لوگ کروڑوں اربوں میں کھیل رہے ہیں۔ منشیات فروشی سے سونے کے محل تعمیر ہو رہے ہیں۔ رشوت سے ساری دنیا کی عیاشیاں اور بدمعاشیاں کی جا رہی ہیں۔ رزق حلال کی تلقین کرنے والے بدمعاش و بدکار خود گلے گلے تک حرام کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں۔ تو پھر ہم کہاں جائیں؟ کہاں جائیں ہم؟ کون سی دیوار سے سر پھوڑیں؟ راستہ .... راستہ کون سا راستہ؟ محمود کا راستہ؟ لعنت ہو۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یوں کیڑے مکوڑوں کی طرح مر جانا بھی کوئی بات ہوئی! تو پھر محسن کا راستہ .... نہیں .... بے کار ہے۔ بہت لمبا ہے۔ تب تک کون انتظار کرے گا؟ نہیں یہاں تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے .... بس تو پھر آخری راستہ .... آخری راستہ .... کلاشنکوف کا راستہ ہے .... فوری حل۔"

اگلے روز وہ اور مظفر سلیم کے گھر میں اوپر والے کمرے میں بیٹھے ہوئے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ انہیں باتیں کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی تھی۔ مظفر بھی ابھی تک سلیم کی طرح بے روزگار تھا۔

"میرا باپ زمین میں کئی فٹ نیچے اتر جائے گا۔" سلیم سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ "میری بہنیں شادی کے انتظار میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائیں گی۔ ان کے سروں کے بال سفید ہو جائیں گے۔ میں خود بے روزگاری اور ناقدری کا عذاب سہتے سہتے محرومیوں اور ناکامیوں سے پیہم لڑتے لڑتے شاید ایک دن بڑی خاموشی سے اللہ کو پیارا ہو جاؤں گا۔ میری بوڑھی ماں بھی مر جائے گی۔ یہ سب کچھ ہو جائے گا مظفر! مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگے گی' نہ عرش تھرائے گا' نہ زمین کانپے گی' نہ آسمان خون کے آنسو روئے گا۔ کچھ بھی نہیں ہو گا۔ کوئی طوفان نہیں آئے گا۔ کوئی عذاب نازل نہیں ہو گا۔ بے ایمانی اور بدمعاشی کرنے والے اسی طرح پھلتے پھولتے رہیں گے۔ انسانوں کے خون سے

اپنے سونے کے محلوں کی دیواریں اسی طرح اونچی کرتے رہیں گے اور ان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ برسوں جئیں گے۔ خوب جئیں گے کیونکہ ان کو علاج معالجے کی ہر سہولت حاصل ہے' کیونکہ وہ طب جدید کی ہر ایجاد اور دریافت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جئیں گے' ٹھاٹھ سے اور مریں گے بھی ٹھاٹھ سے اور ہم لوگوں کو یہی کہہ کر تسلی دی جاتی رہے گی کہ انصاف حشر کے دن ہو گا۔ نہیں دوست حشر کے دن تک کون انتظار کرتا ہے؟ ان لوگوں کو دیکھو' دونوں ہاتھوں سے دولت بٹورنے والوں کو' طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے انسانوں کا خون چوسنے والے وحشیوں کو دیکھو۔ انہیں کیا تکلیف ہے؟ کون سا آزار ہے؟ کون سا عذاب ان کے لئے ہے؟ کچھ نہیں۔ میرے یار کچھ نہیں انہیں کچھ نہیں ہوتا۔ ان میں سے کسی کے جسم سے کوڑھ نہیں ٹپکتا' کسی پر بجلی نہیں گری' کسی کو سانپ اور بچھو نہیں ڈستے' سب عیش کرتے ہیں' عیش کرتے کرتے مر جاتے ہیں۔ اسمگلر' منشیات فروش' موت کے سوداگر' اسلحہ فروش' رات دن رشوت کھانے والے سرکاری افسر' یہ چور' اچکے' ڈاکو' قاتل' لٹیرے' منافع خور' جاگیردار' ذخیرہ اندوز' بے ایمان' کالے دھندے کرنے والے۔ ہر قسم کے خونخوار وحشی۔ کیا ہوتا ہے ان کے ساتھ؟ کھلے بندوں آزادی کے ساتھ گھومتے ہیں۔ دنیا کی ہر راحت' ہر نعمت' ہر عیش و آرام ان کے نصیب میں ہے۔ مرتے ہیں تو ان کے مزار بنتے ہیں۔ ان پر فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ اخباروں میں تدفین کی خبریں اور تصویریں چھپتی ہیں۔ جلسے ہوتے ہیں' تعزیتی قراردادیں منظور کی جاتی ہیں۔ مرحوم کی خدمات کو سراہا جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ .... نہیں دوست! اب میں مزید صبر نہیں کر سکتا۔ سب راستے آزما کر دیکھ لئے۔ محمود کا حشر سامنے ہے۔ ایماندار جدوجہد سے کچھ حاصل نہ ہوا .... اب تو بس یہی راستہ ہے۔"

"بس یہی راستہ ہے۔" مظفر نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور سلیم کے ہاتھ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

☆======☆======☆

ان دونوں نے جب پہلی واردات کی تو انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ کام اس قدر آسان' اس قدر سہل اور بالکل معمولی ثابت ہو گا۔ شروع شروع میں تو دونوں اس قدر خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے تھے کہ ان کے دل بے تحاشہ دھڑک رہے تھے لیکن ان کی ابتدائی ہمت اس وقت پیدا ہوئی جب وہ گاڑی چرانے میں بلکہ چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔

سلیم کو تو ڈرائیونگ بالکل نہیں آتی تھی لیکن مظفر بہت اچھی طرح گاڑی چلا لیتا تھا اور اپنے بڑے بھائی کی گاڑی خوب چلایا کرتا تھا جو کسی بینک میں سیکنڈ افسر تھا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ بمشکل بیس اکیس سال کا جس سے ان دونوں نے امیر خسرو روڈ کے ایک سنسان اور خاموش رہائشی علاقے میں نئے ماڈل کی ٹویوٹا گاڑی چھینی۔ لڑکا گاڑی لئے جا رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ دکھا کر گاڑی روکی۔ لڑکے سے غلطی یہی ہوئی کہ اس نے گاڑی روک لی۔ ان دونوں نے جھپٹا مار کر چابی پر قبضہ کیا اور لڑکے کو اتار کر باہر نکال دیا۔ پھر وہ گاڑی لے کر ہوا ہو گئے۔

باقی پروگرام کے بارے میں وہ اچھی طرح سوچ چکے تھے اور پروگرام بنا چکے تھے۔ چند روز قبل ہی انہوں نے ضروری اسلحہ حاصل کر لیا تھا۔ اس کے لئے انہیں کچھ رقم خرچ کرنی پڑی تھی لیکن انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا بندوبست کر لیا تھا کیونکہ یہ تو ان کا انویسٹ منٹ تھا۔ وہ منافع کا کاروبار کرنے جا رہے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ اس کاروبار میں جان تک کا خطرہ موجود تھا۔

لیکن اس کے بعد کا مرحلہ ان کے لئے اور بھی زیادہ آسان ثابت ہوا۔ اس قدر آسان کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ دونوں نقلی داڑھی مونچھیں لگا کر اور اپنے حلیوں میں معمولی سی تبدیلی کر کے پہلے سے منتخب کردہ بینک کے اندر اطمینان سے داخل ہوئے۔ سلیم بینک کے مسلح چوکیدار کے پاس کھڑا ہو گیا جس کے کندھے پر رائفل لٹک رہی تھی۔ اچانک سلیم نے ریوالور نکالا اور بڑی خاموشی سے چوکیدار کی پسلیوں میں اس کی نال چبھو دی۔ "اس کھلونے کو اتار کر ایک طرف ڈال دو اور سامنے دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔" اس نے بڑی آہستگی سے گن مین کو حکم دیا۔

ادھر مظفر بھی اپنا کام کر رہا تھا۔ اس نے ریوالور نکال کر بینک کے عملے کو اور اندر موجود اکا دکا گاہکوں کو بے بس کر دیا۔ سلیم نے دروازہ روک رکھا تھا۔ مظفر نے کاؤنٹر پر موجود سارا کیش سمیٹ کر پلاسٹک کے ایک بڑے سے تھیلے میں بھرا اور دونوں خاموشی سے بینک کی عمارت سے باہر نکل آئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے اور انہوں نے دھمکی دے دی تھی کہ اگر کسی نے بھی ان کا پیچھا کرنے کی کوشش کی تو وہ بے دریغ گولی مار دیں گے اور ان کا قطعی طور پر یہی ارادہ بھی تھا۔ وہ مرنے مارنے پر تلے ہوئے تھے۔ انہوں نے آپس میں پہلے ہی طے کر رکھا تھا کہ اگر کسی نے بھی مزاحمت کرنے کی کوشش کی تو وہ بے دریغ گولی مار دیں گے۔ بخشیں گے نہیں۔

"ایک آدھ آدمی کے مر جانے سے دنیا ویران نہیں ہو جائے گی۔" سلیم نے کہا تھا۔ "اصل بات یہ ہے کہ ہمیں اپنا کام ختم کر کے سلامتی کے ساتھ واپس آنا ہے۔ یہ کام ہم شوق میں نہیں کر رہے ہیں۔ یہ ہماری ضرورت ہے۔ ہم پکڑے جانے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ہر حال میں بھاگ نکلنا ہے۔"

لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کسی نے ان کی راہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ سارے لوگ اس درجے سہمے ہوئے اور خوفزدہ تھے کہ وہ اپنی اپنی جگہ پر پتھر کے بتوں کی طرح خاموش کھڑے رہے اور جب دونوں "ڈاکو" نوٹوں سے بھرا ہوا تھیلا لے کر بینک سے نکل گئے۔ تب ان کو ہوش آیا لیکن سلیم اور مظفر کے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ تو اس وقت تک اس چوری کی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہو چکے تھے۔ آناً فاناً وہ اس علاقے سے باہر نکل گئے اور پھر انہوں نے چھینی ہوئی گاڑی کو بھی نارتھ ناظم آباد کے علاقے میں ایک سڑک کے کنارے چھوڑ دیا۔ انہوں نے اس امر کو بہت اچھی طرح یقینی بنا لیا تھا کہ گاڑی میں کوئی ایسی چیز موجود نہ ہو جس سے ان لوگوں کا سراغ لگانے میں مدد مل سکے۔

اس واردات میں اگرچہ بہت زیادہ رقم تو ان کے ہاتھ نہیں لگی تھی لیکن وہ بے حد مطمئن اور خوش تھے۔ یہ کامیابی ان کی توقع سے کہیں زیادہ آسان اور سہل ثابت ہوئی تھی۔ واقعی جیسے بچوں کا کھیل اور اگر انہیں رقم کم ملی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے خود ہی اس کم رقم پر اکتفا کیا تھا، بینک میں اور بھی کیش موجود تھا لیکن مظفر نے سارا کیش نہیں سمیٹا جلدی جلدی جو کچھ اس کے ہاتھ لگا، اس نے سمیٹ لیا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ زندگی میں اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ تھا اور خوف و دہشت کا غلبہ اپنے عروج پر تھا۔

جو کیش وہ لے کر بھاگے تھے وہ دو لاکھ تیس ہزار روپے کے قریب تھا اس طرح ان دونوں میں سے ہر ایک کے حصے میں ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کی رقم آئی تھی۔ پھر اس میں سے اخراجات وغیرہ بھی نکالنے تھے اور اگلے انویسٹ منٹ کے لئے بھی کچھ رقم رکھنی تھی۔

اس رات، زندگی میں پہلی بار سلیم نے شراب پی۔ اس کی جیبیں نوٹوں سے بھری ہوئی تھیں اور یہ وہ نوٹ تھے جو اس نے محنت کر کے نہیں کمائے تھے۔ انہیں وہ پوری بے دردی کے ساتھ استعمال کر سکتا تھا۔ یہ حرام کی کمائی تھی اور اس کو لٹاتے ہوئے دل بالکل نہیں دکھتا تھا۔ سلیم اور مظفر نے اپنی کامیابی کا جشن خوب دل کھول کر منایا اور

صرف شراب پینے پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ مظفر کو کئی خفیہ ٹھکانوں کا پتہ معلوم تھا جہاں جا کر وہ خوب داد عیش بھی دے سکتے تھے۔ جیب میں پیسہ ہونا چاہئے تھا۔ عیاشی کے ٹھکانوں کی کمی تھوڑی تھی۔

پہلے ہی ڈاکے کی کامیابی کے بعد سلیم میں اس قدر حیرت انگیز تبدیلی رونما ہو گئی کہ اسے خود اپنے آپ پر تعجب ہو رہا تھا۔ زندگی کے ایسے ایسے روپ بھی ہو سکتے تھے اور اس کا تو اسے کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ اس نے اور مظفر نے ایک ہفتے تک خوب جی بھر کر زندگی کے نت نئے تجربات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنا وقت گزارا۔ پیسہ بہت تھا اور ابھی تو محض ابتدا تھی۔ ابھی تو سلسلہ شروع ہوا تھا۔

ایک لاکھ پندرہ ہزار روپے کی رقم میں سے سلیم کے پاس ایک ہفتے کے بعد ایک لاکھ روپے کی رقم موجود تھی اور باقی رقم وہ سب کھا اڑا کر ختم کر چکا تھا۔ وہ اب شاہزادوں کی طرح خرچ کرتا تھا۔ ٹیکسی میں گھومتا تھا۔ بہترین ہوٹلوں میں کھانا کھاتا تھا۔ زندگی تیزی سے بدل رہی تھی۔

"اب حالات کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔" مظفر نے اسے مشورہ دیا۔ "تم اپنے باپ کو جلد از جلد بائی پاس کے لئے لے جانے کا بندوبست کرو۔ بہنوں کی شادی کی فکر کرو جیب میں پیسہ ہو تو سارے کام فٹافٹ ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن میری جان صرف ایک لاکھ روپے سے کیا بنے گا۔" سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "میرے پاس میرے حصے کے صرف ایک لاکھ ہیں اور صرف ابو کے بائی پاس کے لئے ہی کم از کم پانچ لاکھ روپے مزید چاہئیں۔ بہنوں کی شادی کا مرحلہ تو اس کے بعد آئے گا۔"

"دیکھو ڈیئر جو کچھ کرنا ہے جلدی جلدی کر ڈالو۔" مظفر نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہم ساری عمر یہ دھندہ نہیں کریں گے۔ کیونکہ اس صورت میں مجھے پورا یقین ہے کہ کسی دن کسی پولیس والے کی گولی ہمارے سینے کے پار ہو گی اور ہماری لاش کسی بینک کے دروازے پر پڑی ہو گی۔ بس دو چار ہاتھ مار لو جلدی جلدی اور پھر یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو مظفر!" سلیم نے گہری سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "واقعی ہم اس دھندے کو ہمیشہ کے لئے تو نہیں اپنا سکتے۔ ورنہ کسی دن کتے کی موت مارے جائیں گے اور ہمارے گھر والے۔ وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ تو پھر اب بتاؤ کیا کرنا ہے؟"

"بات یہ ہے یار کہ پہلی بار ہم دونوں کافی ڈرے ہوئے تھے۔" مظفر نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل کر سکتے تھے لیکن ہم ذرا سنبھلے ہوئے محتاط اور خوفزدہ رہے اسی لئے ہم کم رقم حاصل کر سکے۔ خیر' وہ تو پہلا پہلا تجربہ تھا اور اب تو ہم اچھی طرح جان چکے ہیں کہ اس میں کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ دل میں مضبوطی اور ہمت ہو عزم ہو اور حوصلہ ہو تو پھر کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ اس بار ذرا لمبا ہاتھ مارنا ہے۔ کم از کم آٹھ دس لاکھ روپے کی رقم ہاتھ آنی چاہئے۔ تاکہ تمہارے حصے میں چار پانچ لاکھ روپے تو آ ہی جائیں اور اس کے بعد ایسے ہی دو تین ہاتھ مار کر اس سلسلے کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا ہے۔ حاصل شدہ رقم کو کس طرح استعمال کرنا ہے اس کے بارے میں بعد میں سوچ لیں گے۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں ابو کو اور گھر کے دوسرے لوگوں کو کیا بتاؤں گا؟" سلیم نے پُرخیال انداز میں کہا۔ "ان کو بائی پاس کے لئے بھیجنے کی غرض سے میں رقم کا بندوبست کہاں سے کر رہا ہوں۔ یہ بڑا اہم سوال ہے۔ مجھے کیا کہنا چاہئے؟"

"ظاہر ہے کہ یہ کہنا تو سراسر حماقت ہے کہ تمہارے کسی دوست نے رقم قرض دے دی ہے۔" مظفر نے کہا۔ "سب جانتے ہیں کہ تمہارے دوستوں میں ایسا کوئی نہیں ہے جو تمہیں کئی لاکھ روپے قرض دے دے۔ بہرحال ہم اس بارے میں بعد میں سوچ لیں گے۔ اس وقت سوچ لیں گے جب تمہارے پاس اتنی رقم جمع ہو جائے گی کہ تم انکل کو باہر بھیجنے کا بندوبست کر سکو۔ اس وقت کوئی بہت معقول اور سمجھ میں آنے والا بہانہ سوچ لیں گے۔ ابھی اس معاملے میں سر کھپانا قبل از وقت ہے اور پھر تم اپنے گھر والوں سے یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دیا ہے۔ آخر تم اکنامکس میں ایم اے ہو۔ اس کام کو بہت اچھی طرح کر سکتے ہو۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے ایک دوست کے ساتھ مل کر یہ کاروبار شروع کیا اور تمہیں اس میں اچانک بہت زیادہ منافع ہو گیا کیونکہ تمہارے خریدے ہوئے شیئرز کی قیمت بازار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے اچانک بہت زیادہ ہو گئی۔"

"ہاں یار یہ ٹھیک ہے۔" سلیم نے مطمئن انداز میں جواب دیا۔ "میں ان لوگوں سے یہی کہوں گا۔ اس طرح انہیں مطمئن بھی کیا جا سکے گا اور اپنا کام بھی چل جائے گا۔"

"بلکہ یوں کرو تم ابھی سے گھر میں یہ کہنا شروع کر دو کہ تم نے ایک دوست کے ساتھ مل کر اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ اس طرح وہ لوگ ذہنی

طور پر تمہاری اہم کامیابیوں کے لئے تیار رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" سلیم نے مسکرا کر کہا۔ "اس طرح اس ایک لاکھ روپے کو بھی میں ان لوگوں کے سامنے لا سکوں گا جسے اس وقت چھپانے میں مجھے سخت مشکل درپیش آ رہی ہے۔"

چنانچہ اس رات سلیم نے اپنے گھر میں اس بات کا ذکر کر دیا کہ اس نے ملازمت کے حصول کی جدوجہد ترک کر کے اب اپنے طور پر کچھ دھندہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دیا ہے۔

"کیا اس کام میں کچھ منافع اور کامیابی کی امید ہے بیٹا!" صفیہ نے آزردگی کے ساتھ پوچھا جو اس کام کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

"بہت امید ہے امی!" سلیم نے اسے سمجھایا۔ "یہ ایسا کاروبار ہے جس میں اگر منافع ہو تو بہت زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"میں تو بس یہ چاہتی ہوں بیٹا کہ تمہارا کچھ نہ کچھ کام بن جائے۔" صفیہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے باپ نے تو اپنی ساری زندگی ہیڈ کلرکی کرتے ہوئے گزار دی۔ ان بے چارے کی تعلیم بھی معمولی تھی لیکن تمہاری تعلیم تو بہت اونچی ہے۔ تم نے تو ایم اے پاس کیا ہے بیٹا! اور کس قدر دکھ ہوتا ہے یہ دیکھ کر کہ اتنا پڑھنے کے باوجود تم اتنا بھی نہیں کما پا رہے ہو جتنا تمہارے باپ کما لیتے تھے جو تم سے بہت کم پڑھے ہوئے تھے۔"

"وقت وقت کی بات ہوتی ہے امی!" سلیم نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "مگر اب آپ پریشان ہونا چھوڑ دیں۔ اب ہمارے برے دن ختم ہو رہے ہیں۔ اچھے دن آنے والے ہیں۔"

"دو ایک روز میں تمہارے ابو بھی گھر آ جائیں گے۔" صفیہ نے کہا۔ "ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ اب چند روز میں ان کی چھٹی کر دیں گے اور گھر بھیج دیں گے اور وہی بائی پاس والی بات کہہ رہے تھے۔ کیسی پاگلوں جیسی باتیں کرتے ہیں یہ لوگ۔ انہیں کیا معلوم کہ کسی کے گھر کے کیا حالات ہیں۔ ہم بھلا کہاں سے دس لاکھ روپے لائیں؟ یہاں تو روٹیوں کے لالے پڑے رہتے ہیں باہر جا کر علاج کروانے کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا؟" اور وہ اپنے میلے سے دوپٹے سے اپنی آنکھوں کے گوشوں سے بہنے والے آنسوؤں کو

پونچھنے لگی۔

"کیا خبر امی آ ہی جائے۔" سلیم نے جان بوجھ کر جیسے رواداری میں یہ بات کہی۔ "کسی کے حالات بدلتے ہوئے دیر تھوڑی لگتی ہے؟ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔"

"ہو جاتا ہو گا بیٹا!" اس نے گہری سانس لے کر افسردگی کے ساتھ کہا۔ "مگر ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہو سکتا۔ بھلا ہمارے پاس اتنا پیسہ کہاں سے آ جائے گا؟ کوئی چھپر پھاڑ کر تو نہیں مل جائے گا۔"

سلیم نے صرف اشارہ کر دینا ضروری سمجھا تھا۔ اب اس معاملے میں زیادہ بحث مباحثے کی ضرورت نہیں تھی۔ وقت آنے پر باقی باتیں بھی ہو سکتی تھیں اور ساری ضروری وضاحتیں پیش کی جا سکتی تھیں۔ اس لئے خاموشی اختیار کی۔

شاہدہ اور ماجدہ اس دن سے بہت سہمی سہمی رہنے لگی تھیں جس دن سے ان کے باپ پر دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور ڈاکٹر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ان کو اگر بائی پاس کے لئے باہر لے جایا جائے تو وہ ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ دونوں لڑکیاں اس بات سے واقف تھیں کہ وہ تو زندگی بھر اتنی بڑی رقم کا خواب نہیں دیکھ سکتی تھیں۔ بھائی ڈیڑھ برس سے کراچی کی سڑکیں ناپتا پھر رہا تھا اور اکنامکس میں فرسٹ کلاس ایم اے ہونے کے باوجود اسے کوئی نوکری نہیں مل پائی تھی۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ کچھ اور وقت گزرا تو پھر نوکری ملنے کی عمر بھی نکل جائے گی۔ پھر......... پھر خدا جانے کیا ہو گا۔ اب تک تو گھر کے سب سے اہم کمانے والے ابو ہی تھے۔ مگر اب تو شاید وہ ایک طویل عرصے تک کام نہ کر سکیں۔ یہ بھی دیکھنا تھا کہ دفتر والوں کا اب ان کی جانب کیا رویہ ہوتا ہے۔ قواعد کے مطابق اب تک کے علاج معالجے کے تمام اخراجات تو دفتر نے برداشت کئے تھے لیکن آگے کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

"بھیا ذرا ہمیں بھی سمجھاؤ یہ اسٹاک مارکیٹ میں شیئرز کا لین دین کس طرح ہوتا ہے؟" شاہدہ نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔ "کیا یہ واقعی کوئی بہت منافع بخش کاروبار ہے؟"

سلیم کو اس بات سے خوشی ہوئی اور اطمینان بھی کہ گھر والوں نے اس کی کہانی پر نہ صرف یہ کہ یقین کیا بلکہ اس میں گہری دلچسپی بھی لی اور اس کے بارے میں جاننا بھی چاہا۔

وہ بڑی متانت، سنجیدگی اور توجہ کے ساتھ ان لوگوں کو اسٹاک ایکسچینج کے کاروبار کے بارے میں بتانے لگا اور کافی دیر تک بتاتا رہا۔ اس نے انہیں اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ اگر قسمت اس پر مہربان ہو جائے تو کسی ایک ہی سودے سے وارے نیارے بھی ہو سکتے ہیں۔

"اور اس شریفانہ کاروبار کے ساتھ ہی کچھ غیر شریفانہ کاروبار بھی ہے۔" سلیم نے مسکرا کر کہا۔ گھر والوں کے رویے سے اس کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی اور اب وہ بات کو مزید آگے بڑھانا چاہتا تھا۔

"غیر شریفانہ کاروبار؟" ماجدہ نے حیرانی سے کہا اور وہ تینوں ماں بیٹیاں اس کی طرف دیکھنے لگیں۔

"ہاں، مگر اس میں اس قدر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" سلیم نے ہنس کر کہا۔ "میں کوئی چرس یا ہیروئن کی اسمگلنگ کا دھندہ کرنے نہیں جا رہا ہوں۔ یہ دراصل کچھ چھوٹے پیمانے پر سٹے کا کاروبار ہے اور اس میں قسمت پر اور صحیح اندازوں پر کامیابی کا انحصار ہوتا ہے لیکن اگر ایک بار قسمت ساتھ دے جائے تو بس چاندی ہی چاندی ہے۔"

"یہ سٹہ وٹہ تو سب فضول اور بے کار چیزیں ہیں۔" شاہدہ نے سنجیدگی سے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ اسٹاک مارکیٹ والی بات مجھے پسند آئی۔ یہ واقعی ایک ایسا کام ہے جس میں کاروباری سوجھ بوجھ، تجربے اور مارکیٹ کے حالات پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر تم اور تمہارا دوست مل کر یہ کام عمدگی سے کر لیں تو اچھی آمدنی ہو سکتی ہے۔"

مسئلہ خود بخود حل ہو گیا تھا۔ سلیم کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ اب زمین تو ہموار ہو ہی چکی تھی۔ صرف وقتاً فوقتاً چھوٹی بڑی منافع کی رقموں کا اعلان کرنا رہ گیا تھا۔

تین دن کے بعد وسیم احمد کو ہسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور وہ گھر آ گیا۔ ڈاکٹر نے سلیم سے آخری گفتگو کے دوران پھر وہی بات دہرائی کہ اگر مریض کو بائی پاس کے لئے باہر لے جایا جائے تو مریض کو شرطیہ طور پر اس بیماری سے نجات مل سکتی ہے۔ سلیم نے ڈاکٹر سے کہا کہ وہ لوگ اس بارے میں غور کر رہے ہیں اور شاید جلد ہی کوئی فیصلہ کر سکیں۔

وسیم احمد گھر آ گیا اور سلیم نے اپنے باپ کے مرجھائے ہوئے چہرے کو بغور دیکھا۔ یہ ایک ایسے محنت کرنے والے انسان کا چہرہ تھا جس نے اپنی ساری زندگی محنت اور صرف محنت کی تھی اور ایک ایک پیسہ صرف رزقِ حلال کا کمایا تھا۔

"کیوں؟ کیوں زندہ ہے ناصرہ کا باپ اور کیوں مر جائے میرا باپ؟" اس نے دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے سوچا۔ "کون سی خصوصیت ہے اس لعنت کے مارے بوڑھے سیٹھ میں؟ کل کا مرتا آج مر جائے ہماری بلا سے۔ جہنم میں جائے لیکن اگر اس کو زندہ رہنے کا حق ہے تو میرے باپ کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے۔ اگر وہ منحوس بوڑھا بائی پاس کے لئے باہر جا سکتا ہے تو میرا باپ بھی جا سکتا ہے۔"

کوئی ہفتہ بھر کے بعد وسیم احمد کو اپنے دفتر سے ایک رجسٹری موصول ہوئی جس میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ اسے طبی بنیادوں پر وقت سے پہلے ہی ریٹائرڈ کیا جا رہا ہے اور اب وہ اپنے آپ کو ریٹائرمنٹ سے پہلے کی چھٹی پر سمجھے اور یہ کہ عنقریب اس کے واجبات کا حساب کتاب بھی بنا لیا جائے گا اور اسے اس کی اطلاع دے دی جائے گی۔

اتفاق سے ڈاکیہ اس وقت رجسٹری لے کر آیا جب گھر میں وسیم احمد کے علاوہ صرف صفیہ تھی۔ اس نے جا کر دستخط کئے اور رجسٹری وصول کر کے سیدھی اپنے شوہر کو لا کر دے دی۔ نام پتہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا اور صفیہ اسے پڑھ نہیں سکتی تھی۔ وسیم احمد نے وہ رجسٹری کھولی اور خط پڑھ لیا۔ اس کے بعد سے اس پر اور بھی گہری مایوسی چھا گئی۔ باقی لوگوں کو جب اس خط کا پتہ چلا تو انہوں نے اپنے اپنے انداز میں وسیم احمد کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"آپ یہ بھول جائیں کہ اب آپ کو نوکری کرنی ہے ابو!" سلیم نے اس سے کہا۔ "میں نے اب کاروبار شروع کر دیا ہے۔ انشاء اللہ اس میں ضرور کامیابی ہو گی۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہوا کہ ان لوگوں نے آپ کو خود ہی ریٹائر کر دیا۔"

کام کو اب تیز کرنے کی ضرورت تھی۔ وسیم احمد کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اسے جلد از جلد باہر لے جانا چاہئے تھا۔

دوسری واردات بھی انہوں نے بہت آسانی کے ساتھ کر لی اور صاف بچ کر نکل آئے۔ یہ پہلی واردات سے صرف اس حد تک مختلف تھی کہ اس میں گن مین کے علاوہ پولیس والوں کو بھی قابو میں کرنے کی ضرورت تھی جو بینک کے دروازے پر اپنی زنگ خوردہ رائفلیں لئے ہوئے بیٹھے تھے۔ سلیم اور مظفر اپنے پچھلے تجربات سے بہت کچھ سیکھ چکے تھے۔ اس بار بھی انہوں نے مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ کام کیا تھا اور ایک ایک قدم کی جزئیات پہلے سے طے کر لی تھیں اور سب کچھ ویسا ہی ہوا جیسا کہ انہوں نے چاہا تھا۔ مگر صرف ایک گڑبڑ ہو گئی اور وہ یہ کہ انہیں یہاں سے رقم بہت کم ملی۔

کہیں نہ کہیں، معلومات حاصل کرنے میں یا حساب کتاب کرنے میں کچھ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ مظفر کی معلومات اور اندازوں کے مطابق اس بینک میں اس وقت کم از کم پندرہ لاکھ روپے کا کیش ہونا چاہئے تھا۔ مگر ان لوگوں کو جو کیش وہاں سے ملا وہ دو لاکھ روپے سے بھی کم تھا۔ انہوں نے سارا کیش سمیٹنے کے بعد ایک بینک آفیسر کو زد و کوب بھی کیا اور اس سے مزید کیش کے بارے میں پوچھا لیکن اس نے کہا کہ بینک میں کُل کیش یہی تھا اور اب مزید کوئی کیش وہاں موجود نہیں تھا۔ اس نے ان لوگوں سے کہا کہ وہ اگر چاہیں تو اپنی تسلی کے لئے بینک کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا وقت نہیں تھا جو کچھ کیش وہاں تھا وہ انہوں نے سمیٹا اور بھاگ نکلے۔

یہ تو انہیں بعد میں معلوم ہوا کہ واردات سے کچھ ہی دیر پہلے بینک میں واقعی تقریباً پندرہ لاکھ روپے کا کیش موجود تھا لیکن کچھ دیر پہلے ایک پارٹی کا کوئی تیرہ لاکھ روپے کا چیک کیش ہونے کے لئے آ گیا تھا اور اس طرح زیادہ تر کیش بینک سے نکل گیا تھا۔ ”ڈاکوؤں“ کے ہاتھوں میں بہت کم رقم جا سکی تھی۔

سلیم اور مظفر کو یہ ساری تفصیلات اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے ذریعے معلوم ہوئیں۔ وہ دونوں بہت بیزار اور بور تھے۔ مظفر کو تو پورا یقین تھا کہ اس کے بعد اس جیسا صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو ہاتھ مارنے کی ضرورت تھی اور بس پھر کسی بینک کو لوٹنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کے پاس اتنا پیسہ ہو جاتا کہ وہ اپنی ضروریات بآسانی پوری کر سکتے تھے۔

تیسری واردات انہیں عین وقت پر ملتوی کر دینا پڑی کیونکہ جب وہ بینک کے اندر داخل ہوئے تو انہوں نے مینجر کے کمرے میں ایک اعلیٰ پولیس افسر کو بیٹھے دیکھا اور وہ اتنی دیر تک وہاں بیٹھا رہا کہ ان لوگوں کو اپنا کام کرنے کا موقع نہیں مل سکا اور یہ وہاں سے چلے آئے۔ کچھ عرصہ تک وہ قفل شکنی کا کام سیکھنے میں لگے رہے۔

”میں نے ایک نئی اور اہم بات کا پتہ لگایا ہے۔“ چند روز کے بعد مظفر نے سلیم کو بتایا۔ ”میں نے ایک ایسے فلیٹ کا پتہ چلا لیا ہے جہاں اگلے منگل کی رات کو تیس لاکھ روپے کی رقم موجود ہو گی اور یہ فلیٹ بہار کالونی میں واقع ایک عمارت فاطمہ منزل میں ہے۔ اتفاق سے مجھے وہاں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے۔“ مظفر نے اب صرف بینک پر تکیہ کرنے کے بجائے متبادل محفوظ راستے بھی تلاش کرنے شروع کر دیئے تھے اور بہار کالونی کی فاطمہ منزل کا یہ فلیٹ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔

مظفر کو معتبر ذرائع سے یہ معلوم ہوا تھا کہ مذکورہ فلیٹ میں رہنے والے ایک شخص نے اپنا ایک مکان فروخت کیا ہے جو کہ جمشید روڈ پر واقع ہے۔ یہ مکان بہت مہنگے داموں ایک ایسی پارٹی کو فروخت کیا گیا تھا جو اسے توڑ کر وہاں پلازہ بنائے گی۔ مکان ستر لاکھ روپے میں فروخت ہوا تھا اور اگلے منگل کی رات کو تیس لاکھ روپے کی رقم ادا کی جانے والی تھی اور رات کو یہ رقم اسی فلیٹ میں موجود ہونی تھی۔ اس سارے معاملے کو بے حد خفیہ رکھا جا رہا تھا لیکن اتفاق سے مظفر کو اس کا علم اس اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے ہو گیا جس کی معرفت یہ سودا ہو رہا تھا۔ مظفر کی اس اسٹیٹ ایجنٹ سے دعا سلام تھی۔

”رقم فلیٹ کے اندر ہو گی لیکن لوگوں کو دھوکہ دینے کی غرض سے فلیٹ میں باہر سے تالا ڈال دیا جائے گا تاکہ کوئی یہ گمان بھی نہ کرے کہ مکینوں سے خالی فلیٹ میں کوئی قیمتی چیز بھی ہو سکتی ہے۔“ مظفر نے اسے بتایا۔ ”رقم بیڈ روم کی الماری میں ہو گی۔ کاغذ کے تھیلے میں، تالے کو تم آسانی سے کھول یا توڑ لو گے؟“ ان دونوں نے گزشتہ دنوں اس کام کی بھی خوب مشق کر ڈالی تھی۔

”یہ کون سا مشکل کام ہے؟“ سلیم نے کہا۔ ”لیکن فلیٹ کے اندر داخل ہونے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرنا ہو گا؟“

”اس کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔“ مظفر نے تفصیلات بتائیں کہ کس طرح اس نے اس تالے کی ایک چابی حاصل کر لی ہے جو دوسری منزل پر واقع اس فلیٹ کے دروازے میں لگایا جائے گا۔

”تم تالہ کھول کر خاموشی سے اندر چلے جاؤ گے۔“ مظفر نے کہا۔ ”میں نیچے بلڈنگ کے دروازے کے باہر کار لے کر کھڑا رہوں گا۔ ٹارچ تمہارے پاس موجود ہو گی۔ بہت کم استعمال کرنا اس کا اور فلیٹ کی کوئی لائٹ بھی مت جلانا۔ بس ٹارچ کی ہلکی روشنی میں الماری کا تالا کھول لینا۔ ظاہر ہے کہ اندر تمہارے علاوہ اور کوئی نہیں ہو گا۔ تمہیں دیکھے جانے کا خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔ اس لئے تم اطمینان اور سکون سے کام کر سکو گے۔ بس اس کا خیال رہے کہ آوازیں پیدا نہ ہوں۔ رقم نکال کر اپنے تھیلے میں بھر لینا اور پھر خاموشی سے باہر آ جانا۔ فلیٹ کے دروازے کو باہر سے بند کر دینا اور نیچے آ جانا۔“

”میرے خیال میں تو یہ کام بینک لوٹنے کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔“ سلیم نے خوشی سے سرشار لہجے میں کہا۔ ”یہاں اتنی زیادہ مشکلات نہیں ہیں اور نہ اتنے زیادہ خطرات۔ بس اندر پہنچ جانے کی دیر ہے۔ پھر تو میں سب کچھ کر لوں گا۔“

"اگر یہ کام ہم نے کر لیا تو پندرہ پندرہ لاکھ روپے دونوں کے حصے میں آ جائیں گے۔" مظفر نے سرگوشی میں کہا۔ "میرے خیال میں پھر کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہت ہے۔"

"ہاں۔" سلیم نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "فی الحال تو کوئی ضرورت نہیں ہو گی۔"

اگلے چند روز ضروری تیاریوں میں گزرے اور اس مرحلے میں زیادہ تر کام مظفر نے انجام دیا کیونکہ بنیادی طور پر یہ "پروجیکٹ" اسی کا تھا اور اصل منصوبہ بندی بھی اسی کی تھی۔

منگل کی شام کو مظفر نے سلیم کو اس فلیٹ کی چابی دے دی۔ یہ معلوم کیا جا چکا تھا کہ رقم آ گئی ہے۔ فلیٹ اس نے سلیم کو ایک دن پہلے ہی دکھا دیا تھا۔ یہ دوسری منزل پر واقع ایک فلیٹ تھا اور سلیم نے اس کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ اس وقت اس کے دروازے میں تالہ نہیں پڑا ہوا تھا۔

رات کے بارہ بجے تھے جب مظفر نے سلیم کو گاڑی سے فاطمہ منزل کے قریب اتارا اور خود گاڑی لے کر آگے چلا گیا اسے تھوڑی دیر کے بعد یہاں واپس آ جانا تھا۔

ہمیشہ کی طرح تمام انتظامات مکمل تھے اور ہر بات کی ضروری احتیاط کر لی گئی تھی۔ سلیم کے پاس ایک عدد بھرا ہوا ریوالور موجود تھا۔ جسے وہ بوقت ضرورت اپنی حفاظت کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ اس کے قبضے میں کوئی ایک بھی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں کوئی مدد مل سکے۔ حتیٰ کہ وہ جو کپڑے پہنے ہوئے تھا وہ بھی ریڈی میڈ تھے اور ایک روز پہلے ہی طارق روڈ کی ایک دکان سے خریدے گئے تھے۔ ان کپڑوں پر کسی لانڈری کا یا کسی دھوبی کا مارکہ موجود نہیں تھا کیونکہ یہ ایک بار بھی نہیں دھلے تھے۔

اور ان دونوں کے درمیان یہ بھی طے تھا اور پہلے دن سے یہ طے تھا کہ اگر واردات کے دوران دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ بھی اونچ نیچ ہو جائے تو دوسرا اس کے گھر والوں کو ہرگز اس کی اطلاع نہیں دے گا۔ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرے گا اور بعد میں دور اور الگ رہ کر ممکنہ حد تک پہلے کی مدد کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر اس طرح کہ یہ بات کسی طرح بھی ظاہر نہ ہو کہ اس کا دوسرے شخص سے کوئی تعلق ہے۔

سلیم کے پاس ایک چھوٹا سا تھیلا تھا جس میں اس کے ضروری آلات و اوزار تھے اور اس کی جیب میں اس فلیٹ کی چابی تھی جو اسے مظفر نے فراہم کی تھی۔ وہ جب فلیٹ

کے دروازے کے سامنے پہنچا تو اس وقت سارا فلور خاموشی اور نیم تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ سلیم نے اپنے چہرے کے گرد کپڑا اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اس کی شکل چھپ گئی تھی۔

اس نے تالے میں چابی لگائی اور تالہ فوراً ہی کھل گیا۔ اس نے بڑی احتیاط اور آہستگی کے ساتھ کنڈا کھولا اور فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا لیکن چند قدم آگے جا کر ہی اسے رک جانا پڑا کیونکہ اندر بالکل گھپ اندھیرا تھا اور وہ کسی بھی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر سکتا تھا جس سے کافی شور پیدا ہوتا۔

وہ تقریباً پانچ چھ منٹ تک اسی طرح گھپ اندھیرے میں کھڑا رہا اور جب اس کی آنکھیں یہاں موجود اشیاء کے دھندلے دھندلے خاکوں کو کسی حد تک دیکھنے میں کامیاب ہوئیں تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کو اندر سے بند کر لیا اور اپنی جیب میں سے ٹارچ نکال کر اسے صرف چند منٹ کے لئے روشن کیا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے روشن حصے کو اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا اس بہت ہلکی روشنی میں اس نے فلیٹ کا اندر سے جائزہ لیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس میں سے ایک بیڈ روم تھا۔ وہ تیزی سے بیڈ روم کی طرف چل پڑا اور وہاں پہنچ کر اسے وہ الماری بھی نظر آ گئی جس کے بارے میں مظفر نے اسے بتایا تھا۔

اس نے ٹارچ کی روشنی میں الماری کے تالے کا جائزہ لیا۔ اس نے اور مظفر نے پچھلے دنوں تالوں کی ساخت اور ان کی تیکنیک وغیرہ سے اچھی طرح واقفیت حاصل کی تھی اور تالوں کو توڑنے اور کھولنے کے مختلف طریقے بھی سیکھے تھے۔ ان کا کوئی استاد نہیں تھا یہ سب کچھ انہوں نے خود سے ہی سیکھا تھا۔ الماری کا یہ تالہ ایک معمولی درجے کا تالہ تھا اور سلیم اسے ان اوزاروں کی مدد سے بآسانی توڑ سکتا تھا جو اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے چند منٹ کے اندر اندر تالہ توڑ دیا اور الماری کھولتے ہی اسے ایک کاغذ کا بھاری سا پیکٹ نظر آیا جو سامنے رکھا تھا۔

سلیم نے اسے اٹھا کر اس کا منہ ذرا سا کھولا اور اسے اس کے اندر نوٹ ہی نوٹ بھرے ہوئے نظر آئے۔ گننے اور جائزہ لینے کا وقت نہیں تھا۔ اس نے کاغذ کے اس تھیلے کو اپنے پلاسٹک کے تھیلے میں منتقل کیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔

عین اسی وقت کسی نے باہر سے دروازے کا کنڈا بند کر دیا اور ساتھ ہی چیخنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ "چور .... چور .... اندر چور گھسا ہے .... دوڑو .... پکڑو .... اندر چور ہے .... چور ہے .... چور ہے.........."

فلیٹ میں رہنے والے محمود الحسن کے بیوی بچے تو گزشتہ ہفتے سے بہاولپور گئے ہوئے تھے۔ وہ فلیٹ میں اکیلا تھا اور آج جمشید روڈ پر واقع اپنے اس پلاٹ کے سودے کی کچھ رقم ایڈوانس لینے کے بعد اس نے وہ رقم یہیں رکھ دی تھی اور فلیٹ میں تالہ لگا کر ایک دوسری جگہ چلا گیا تھا۔ تاہم اس کا ارادہ تھا کہ وہ رات کو ایک بجے کے قریب چکر لگائے گا اور فلیٹ کا جائزہ لے کر واپس چلا جائے گا۔ تیس لاکھ روپے کی رقم کی طرف سے یوں غافل تو نہیں رہا جا سکتا تھا اور جب وہ رات کو ایک بجے کے قریب فلیٹ کے سامنے پہنچا تو اس نے دروازے کے تالے کو کھلا ہوا اور کنڈے کو بھی کھلا ہوا پایا۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ کوئی شخص فلیٹ کے دروازے کا تالہ کھول کر اندر گھسا ہوا تھا اور اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی کو پہلے سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ فلیٹ کے اندر اس وقت بھاری رقم موجود ہے اور اب وہ اسے اڑا لے جانے کے لئے یہاں آیا تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اندر ایک سے زائد افراد بھی ہو سکتے تھے اور وہ مسلح تو یقیناً ہوں گے۔ آج کل تو معمولی درجے کے اچکے بھی ریوالور اور پستول سے کم بات نہیں کرتے۔

محمود الحسن نے فوراً باہر سے دروازے کا کنڈا بند کر دیا۔ چور اب اندر مقید ہو چکا تھا اور وہ بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ دوسری منزل پر واقع اس فلیٹ سے باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ کھڑکیوں میں لوہے کی بھاری اور پرانی وضع کی مضبوط گرل لگی ہوئی تھی۔

سلیم حواس باختہ ہو گیا اور اس نے فوراً اپنی جیب میں سے ریوالور نکال لیا اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اس کو پسینے آنے لگے۔ وہ دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنے لگا باہر نکلنے کے کسی راستے کی تلاش میں اس نے بوکھلاہٹ میں لائٹ بھی جلا دی تھی تاکہ ٹھیک طرح سے دیکھ سکے لیکن کہیں کوئی راستہ موجود نہیں تھا۔ کھڑکیوں میں گرل تھی اور بالکونی کے نیچے خلا تھا۔ بالکونی کے آس پاس کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ اتر سکے۔ وہ واقعی قید ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی باہر ایک غدر برپا تھا لوگ جمع ہو رہے تھے، چیخ چلا رہے تھے۔

"اندر ہے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔" کسی نے چلا کر کہا۔ "پولیس کے آنے تک دروازے کو ہاتھ مت لگانا۔"

"بلڈنگ کا دروازہ بھی بند کر دیا گیا ہے۔" ایک اور آواز سنائی دی۔ "اگر یہ نکل بھی آیا تو باہر نہیں جا سکے گا۔ بلڈنگ کا دروازہ اندر سے بند ہے۔ وہاں لوگ جمع ہو گئے ہیں

ر نہیں جا سکتا سالا۔"

"پکڑ لیا سور کے بچے کو۔" کوئی اور جوش اور جنون کے عالم میں چلایا۔ "اب کیسے بچ سکتا ہے۔ پھنس گیا سالا چوہے دان میں۔"

سلیم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ اس نے فلیٹ میں روشنی جلا دی تھی تاکہ بھاگنے کا راستہ تلاش کر سکے لیکن اس کے باوجود جیسے اندھا ہوا جا رہا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرار کے تمام راستے مسدود تھے وہ واقعی ایک چوہے کی طرح چوہے دان میں بند ہو گیا تھا۔

باہر موجود لوگوں کی گفتگو سے اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ پولیس کو طلب کر لیا گیا ہے اور کوئی دم میں پولیس پہنچنے والی ہے۔ پھر اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

اس کا دماغ بڑی تیزی سے سنسنانے لگا۔ گرفتاری، اخباروں میں خبریں، اپنے ساتھ سارے گھر والوں کی ذلت و رسوائی۔ "ابو کا تو فوراً ہی ہارٹ فیل ہو جائے گا اور شاہدہ اور ماجدہ ساری عمر کنواری بیٹھی رہیں گی۔ ایک چور اور ڈاکو کی بہنوں سے بھلا کون شادی کرے گا اور امی تو جیتے جی درگور ہو جائیں گی۔ ابو کی موت تو کسی حد تک ایک فطری بات ہے لیکن مجھے شاہدہ اور ماجدہ کی زندگیوں کو برباد کرنے کا کیا حق حاصل ہے۔ ان کے چہروں پر تو ہمیشہ کے لئے کالک لگ جائے گی۔ وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گی۔ وہ تو پھر شاید کالج اور یونیورسٹی بھی نہ جا سکیں۔ نہیں .... میں انہیں یہ سزا نہیں دے سکتا۔"

تباہی و بربادی اس کے چاروں طرف رقص کر رہی تھی۔ فرار کی کوئی راہ نہیں تھی اور گرفتاری کی صورت میں اس کے لئے اپنی شخصیت کو مخفی رکھنا ناممکن تھا۔ پکڑے جانے پر تو سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ پولیس کو اپنے کوائف کے بارے میں کچھ نہ بتائے یا غلط بیانی سے کام لے۔ وہ لوگ تو مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیتے۔

اور اسی لمحے اس نے اپنی زندگی کا آخری سب سے زیادہ دردناک فیصلہ کیا۔ شدید رنج و غم، انتہائے یاس اور مکمل ناامیدی کے عالم میں اس نے اپنے ریوالور کی نال کو اپنی کنپٹی سے لگایا اور خود کو گولی مار لی۔ خالی فلیٹ میں ایک زوردار دھماکہ گونجا اور سلیم کا خون آلود جسم فرش پر لڑھک گیا۔

مرنے سے پہلے اسے یہ بات معلوم تھی کہ پولیس کبھی بھی اس کو نہیں پہچان سکے گی اور وہ آخر وقت تک ایک نامعلوم چور رہے گا۔ اس کے اور مظفر کے درمیان اس

بارے میں ایک مکمل اور تفصیلی سمجھوتہ ہو چکا تھا اور اس کے گھر والے اس کی تلاش میں اس نامعلوم چور کی لاش کو کبھی نہیں دیکھیں گے جو چند روز کے لئے مردہ خانے میں رکھی رہے گی۔

اس کا خیال بالکل ٹھیک ثابت ہوا۔ اس کی لاش کی شناخت نہیں ہو سکی۔ کوئی بھی ایسی علامت موجود نہیں تھی جس سے اس نامعلوم چور کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکتا جس نے فرار کا راستہ نہ پا کر خودکشی کر لی تھی۔

مظفر خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ سلیم پھنس چکا ہے اور اب اسے اپنی جان بچا کر وہاں سے چلا جانا تھا اور اپنی زبان کو ہمیشہ کے لئے بند رکھنا تھا اور مظفر نے اپنی زبان ہمیشہ بند رکھی۔ دو دن بعد اخبار میں نامعلوم چور کے بارے میں مختصر سی خبر شائع ہوئی جس نے فرار کا راستہ نہ پا کر اپنے ریوالور سے خودکشی کر لی تھی۔

"سلیم کی پُراسرار گمشدگی" کے ایک ہفتے کے بعد وسیم احمد پر دل کا دورہ پڑا اور وہ جان بحق ہو گیا۔ جوان بیٹے کے اچانک غائب ہو جانے کا صدمہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔

شاہدہ اور ماجدہ اور ان کی ماں کو آج بھی یہ موہوم سی امید ہے کہ شاید گمشدہ سلیم کبھی گھر واپس آ جائے۔ وہ اس لاوارث چور کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں جس کی لاش کو کئی ماہ پہلے ایدھی سینٹر والوں نے دفن کر دیا تھا۔

☆====== ختم شد ======☆